مسلمانانِ ہند

آزادی کے بعد

مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

تقسیم ہند کے بعد ہندستانی مسلمان بڑے اضطراب اور کش مکش کے عالم میں زندگی گزار رہے تھے۔ بڑے پیمانے پر ہندستان سے پاکستان نقل مکانی کا سلسلہ جاری تھا۔ جو مسلمان ہندستان میں رہ گئے تھے وہ خوف و دہشت کی کیفیات کا شکار تھے۔ ان کشیدہ حالات میں جماعت اسلامی ہند کے پہلے امیر مولانا ابواللیث ندوی اصلاحیؒ (۱۹۱۳-۱۹۹۰) نے ہندستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی دینی رہ نمائی کے لیے ماہ نامہ زندگی رام پور میں مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں یہ مقالات کتابی صورت میں 'مسئلہ انتخابات اور مسلمانانِ ہند' اور 'مسلمانانِ ہند کا لائحۂ عمل' (مسئلہ انتخابات اور مسلمانانِ ہند کا حصہ دوم) کے نام سے شائع ہوئے۔

ان مقالات کی اشاعت پر چھ دہائیاں گزر چکی ہیں۔ اس عرصے میں حالات میں بڑی تبدیلیاں آ گئی ہیں، لیکن ان مقالات کی تاریخی اور دستاویزی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان سب سے من وعن اتفاق ضروری نہیں ہے۔ یہ کتابیں عرصہ سے نایاب تھیں۔ ان کی اہمیت کے پیش نظر انھیں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی مولانا کا ایک کتابچہ 'بھارت کی نئی تعمیر اور ہم' اس کے ساتھ شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔

ناشر

بھارت کی نئی تعمیر اور ہم

بھارت کی نئی تعمیر اور ہم

جماعت اسلامی ہند کے سالانہ اجتماع حیدرآباد منعقدہ ۲۷ رنومبر ۱۹۵۲ء میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ایک بڑے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند نے فرمایا:

بعد حمد وثناء

بزرگو اور دوستو! یہ ایک معقول بات ہے کہ کسی انسان پر دوسرے انسان کی یا کسی قوم و ملک پر کسی دوسری قوم و ملک کی حکومت نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے یقیناً ہمیں اس بات پر خوشی ہونی چاہیے اور ہے کہ ہندستان کو آج سے پانچ چھ سال پہلے ایک طویل جدوجہد کے بعد بالآخر انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی اور اب وہ خود اپنے سیاہ وسفید کا مالک ہے۔

لیکن آزادی کے بعد یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ کیا آزادی بہ جائے خود وہ منزل ہے جس پر پہنچنے کے لیے ہندستان جدوجہد کر رہا تھا، یا منزل کی طرف ایک قدم ہے؟ اور آزادی خود کوئی بڑی نعمت ہے، یا اس کا نعمت ہونا، کچھ اور باتوں پر موقوف ہے؟

بہت سے لوگ شاید یہی خیال کر رہے ہیں کہ یہ بہ جائے خود منزل یا نعمت ہے، چناں چہ دیکھا بھی جا رہا ہے کہ ملک میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جو آزادی کے بعد اس پر خوش ہونے کے سوا اور کسی چیز سے غرض و مطلب نہیں رکھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ آخری چیز ہمیں حاصل ہوگئی جس کے لیے ہم برسوں سے جدوجہد میں لگے ہوئے تھے، اس لیے اب یا تو کچھ کرنا نہیں ہے، یا کچھ کرنا ہے تو صرف یہ کہ اس نعمت سے ہم اپنے لیے زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل کریں اور آزادی

کے حصول کے لیے جو مالی و جسمانی قربانیاں کی ہیں، ان کی اب بھرپور قیمت وصول کرلیں۔
لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ایسا وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی عقل و فکر بہت کوتاہ ہو اور ملک میں اگرچہ کثرت ایسے ہی لوگوں کی پائی جاتی ہے، لیکن خوشی ہے کہ ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی پائی جاتی ہے جو آزادی کی قدر و قیمت اور اس کی غرض و غایت کا بہ خوبی احساس رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ آزادی بہ جائے خود کوئی بڑی نعمت نہیں، بلکہ یہ زحمت و مصیبت بھی بن سکتی ہے، اگر ہم میں اس کو برقرار رکھنے کی صلاحیت و استعداد نہ ہو اور یہ بہ جائے خود منزل نہیں ہے، بلکہ یہ حقیقی منزل تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔ اس آزادی کا حقیقی فائدہ یہ ہے کہ ہم اپنے اختیارات کے مالک ہوکر اپنے مستقبل کو اپنی مرضی کے مطابق بنا سنوار سکیں اور اپنی جدوجہد سے نہ صرف ان خرابیوں کا ازالہ کرسکیں جو دورِ غلامی میں پیدا ہوگئی تھیں، بلکہ ملک کو ہر پہلو سے ترقی دے کر اس قابل بنادیں کہ یہاں کے لوگ بھی خوش و مطمئن رہیں اور دوسرے لوگ بھی اس حالت کو دیکھ دیکھ کر اس پر رشک کریں۔ یہی مدعا تھا جس کا تحریکِ آزادی کے زمانے میں بار بار نام بھی لیا جاتا تھا اور درحقیقت اس تحریک میں جو جان پیدا ہوئی تھی وہ تمام تر اسی خوش آئند تصور کا صدقہ تھی۔

آزادی کے بعد

اب جب کہ آزادی کو حاصل ہوئے پانچ سال کی مدت گزر چکی ہے ہمیں تھوڑی دیر رک کر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نے اس مدت میں آزادی کو کس طرح استعمال کیا ہے اور وہ کہاں تک ہمارے اس مقصد کے مطابق ہے جس کے لیے اہل ملک کو یہ مطلوب تھی؟ اگر یہ مقصد کسی نہ کسی درجے میں حاصل ہورہا ہے یا حاصل ہونے کی توقع ہے تب تو سمجھنا چاہیے کہ ہماری ساری محنت ٹھکانے لگ رہی ہے اور اس پر ہمیں خوش و مطمئن ہونا چاہیے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ تشویش ناک بات ہوگی، کیوں کہ اگر آزاد ہونے کے بعد بھی ہماری حالت وہی رہی جو غلامی کے زمانے میں تھی تو ان جانی و مالی قربانیوں کا آخر کیا فائدہ ہوا جو آزادی کے لیے ملک نے خوشی خوشی برداشت کی تھیں۔ آیئے ہم غور کریں کہ آزادی کے بعد ہم نے کن

پہلوؤں سے کیا کیا ترقیاں کی ہیں۔
اس وقت موقع نہیں ہے کہ میں تفصیل سے آپ کے سامنے ان ترقیوں کا نقشہ کھینچوں اس لیے میں محض ان کی طرف سرسری اشارہ کروں گا۔

خرابیوں کا جائزہ

ہندستان ایک زرعی ملک ہے اور انسان کی سب سے پہلی اور اہم ضرورت خوراک کی ہے۔ لیکن ہندستان میں کتنے علاقے ہیں جہاں کے باشندے تقریباً نیم فاقہ کشی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں، بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے کتنی موتیں واقع ہو چکی ہیں اور غذائی قلت تو پورے ملک میں محسوس کی جارہی ہے اور جہاں یہ سوال نہیں ہے، وہاں بھی تقریباً حالت ایسی ہی ہے۔ کیوں کہ غلہ موجود ہے لیکن لوگوں کو وہ چیز میسر نہیں جس کے ذریعے وہ مل سکتا ہے۔
خوراک کے بعد دوسری اہم ضرورت امن و اماں اور جان و مال کے تحفظ کی ہے لیکن انگریزوں کے بنے سجے نظام پر قابض ہوتے ہوئے بھی ملک نے اس پہلو سے اتنی ترقی کی ہے کہ اخبارات کے بیان کے مطابق کتنے ہی علاقوں میں آزادی سے آنا جانا بھی تقریباً محال ہو رہا ہے اور بقیہ علاقوں میں بھی اکثر حالت میں، بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو مال دار یا مال دار صورت ہوں، خطرہ ہی خطرہ ہے، الّا یہ کہ وہ اپنے ساتھ کچھ مخصوص حفاظتی انتظام رکھتے ہوں۔ گاڑیوں تک میں دن دہاڑے قتل کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔
ان دو ناگزیر مادّی ضرورتوں کے علاوہ جو چیز، انسان ہونے کی حیثیت سے انسان کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہے، وہ یہ ہے کہ ملک اخلاقی حیثیت سے ترقی کرے اور اسے بااخلاق فضا میں رہنے کے مواقع حاصل ہوں۔ لیکن جس طرف نظر اٹھا کر دیکھیے، طرح طرح کی بداخلاقیاں پھیلی اور ابھرتی ہوئی دکھائی پڑیں گی، گویا خوراک اور امن و امان کی کمی کی تلافی بداخلاقیوں کی کثرت نے کردی ہے۔ ابھی حال میں ہندستان کے دارالسلطنت دہلی کی عدالت میں پیش ہونے والے مقدماتِ جرائم کی ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان عدالتوں میں ۱۹۵۱ء میں ۹۰۹۴۸ مقدمات زیرِ سماعت آئے جو گزشتہ سال کے مقابلے

میں ۱۹۹۳ء کی تعداد میں زیادہ ہیں۔ع

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

اتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ کے بارے میں پچھلے دنوں خبر شائع ہوئی تھی کہ ۲۰ دن کے اندر تقریباً ۶۰ لڑکیوں نے عدالت میں درخواستیں دی تھیں کہ ان کے سرپرستوں نے انھیں حصولِ زر کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور دو نے تو خود اپنے باپوں کے بارے میں شکایت کی تھی کہ وہ ان کے حسن و جوانی کی تجارت کرتے ہیں۔

ایک سرسری اندازے کے مطابق ملک میں ۲۹ لاکھ سے زیادہ مرد اور عورتیں بردہ فروشی اور عصمت فروشی کو ایک کاروبار کی شکل میں چلا رہے ہیں۔

یہ وہ اعداد وشمار ہیں جو کسی نہ کسی طرح ہمارے علم کی دست رس میں آسکے ہیں، ورنہ کون نہیں جانتا کہ کتنے جرائم ہیں جن کی کسی کو خبر ہی نہیں ہونے پاتی اور کتنے جرائم ہیں جن کو دوسرے قسم کے جرائم کے پردوں سے ڈھک لیا جاتا ہے اور بے شمار بداخلاقیاں تو ایسی ہیں کہ وہ ہیں تو بداخلاقیاں ہی۔ لیکن عام طور سے ان کو اتنا حسن قبول حاصل ہو گیا ہے کہ ان کا بداخلاقیوں میں شمار نہیں ہوتا۔

یہ ہے ہماری ترقیوں کی ایک جھلک جو گزشتہ چند سالوں میں ہم نے کی ہے۔ لیکن ہماری یہ ترقیاں صرف ان ہی بداخلاقیوں تک محدود نہیں ہیں جن کا تعلق افراد کی زندگیوں سے ہے۔ بلکہ ان کے ساتھ ہی ملک نے اجتماعی خرابیوں میں بھی خاصی ترقی کی ہے، جو براہِ راست ملک کے لیے شدید خطرہ ہیں۔ مثال کے طور پر ملک میں فرقہ واریت زور پکڑ رہی ہے، نسل ونسب کے امتیازات سر اٹھا رہے ہیں، صوبائی عصبیتیں ابھرا بھر کر سامنے آرہی ہیں، زبان وتہذیب کے نام پر علیٰحدگی کے رجحانات پرورش پا رہے ہیں۔ غرض ایسی اجتماعی خرابیاں رونما ہو رہی ہیں، جو اگر یوں ہی بڑھتی رہیں، تو نہیں کہا جا سکتا کہ ملک کا آخری انجام کیا ہوگا؟

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہی وہ ترقیات ہیں جن کے لیے اہل ملک نے جان و مال کی قربانیاں کی تھیں؟ اور کیا یہ حالات اس قابل ہیں کہ ان پر اطمینان کر لیا جائے؟ غلامی کی حالت میں تو ہم اپنے کو مجبور سمجھا کرتے تھے۔ اور اپنی ہر خرابی اور برائی کی ذمے داری آسانی کے ساتھ

انگریزوں کے سر ڈال دیا کرتے تھے۔ لیکن اب تو انگریز جا چکا اور ہم خود ہی اپنے سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ پھر ان خرابیوں کی ذمے داری کس کے سر ڈالیں؟

اصلاحی تدبیریں

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ملک کی یہ خرابیاں ملکی رہنماؤں کے سامنے ہیں اور وہ ان کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش بھی کر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن کیا فی الواقع، یہ کوششیں اطمینان بخش ہیں؟ یہ بات یقیناً وزن رکھتی ہے کہ قوموں کی زندگی میں پانچ چھ سال کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہے جس میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا جاسکے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ ملک مدتوں ایک اجنبی حکومت کا غلام رہا ہو۔ ایسی حالت میں تو اس کو اپنی پچھلی کمزوریوں پر قابو پانے ہی کے لیے بہت کافی وقت درکار ہے، چہ جائے کہ وہ کچھ آگے ترقی کی طرف قدم بڑھائے اور بالخصوص جب کہ آزادی کے ساتھ ہی ملک کو ایسے مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے جو اب بھی بہت حد تک اس کی توجہات کو اپنی طرف مائل کیے ہوئے ہیں۔ یعنی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل، جن میں کشمیر اور پناہ گزینوں کی بحالی کے مسئلے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ اس قلیل مدت میں موانع و مشکلات کے باوجود جتنا کچھ کیا جاسکتا تھا کیا وہ کرلیا گیا ہے اور وہ ہمارے اطمینان کے لیے کافی ہے؟ آیئے ہم اس پہلو سے ملکی رہنماؤں کی کوششوں کا مختصر جائزہ لیں۔

وعظ و پند اور قانون

میں نہیں سمجھ سکتا کہ پڑھے لکھوں اور سمجھ داروں کے اس مجمع میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو مذکورہ خرابیوں کی اصلاح کے لیے اس وعظ و پند کو کافی سمجھتے ہوں جو وقتاً فوقتاً ملک کے رہنما اپنے پبلک بیانات اور تقریروں کے ذریعے کرتے رہتے ہیں، اگر جدوجہد کے بغیر محض وعظ و پند کوئی کارنامہ انجام دینے کے لیے کافی ہوتے تو ملک اب تک نہ معلوم ترقی کی کتنی منزلیں طے کر چکا ہوتا۔ میں یہ بھی گمان نہیں کرسکتا، کہ اصلاحِ حال کے لیے آپ لوگوں کی نگاہ میں قانون و

احتساب کی قوت کافی سمجھی جائے گی، جس کو ہر روز سخت سے سخت بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اچھے سے اچھے قانونوں اور اونچی سے اونچی عدالتوں کی موجودگی میں ہو رہا ہے۔ قانون اور عدالت کی بے بسی اور بے چارگی کا حال آپ یو پی کے وزیر داخلہ شری سمپورنانند کی زبانی سنیے، انھوں نے ۱۵/اکتوبر کو یو پی اسمبلی میں بیان دیتے ہوئے فرمایا:

> ''بیسوائی کی لعنت کو دور کرنے کی اب تک جس قدر کوششیں کی گئیں ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس وقت صوبے میں تین قانون ایسے نافذ ہیں جن کا مقصد بیسوائی کو محدود کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کسی وقت بھی اس لعنت کو دور کرنے یا اسے محدود کرنے کی کوشش سے غافل نہیں رہی۔''

اور یاد رکھیے یہ قانون کی بے بسی کی کوئی پہلی مثال نہیں ہے۔ اخلاق و معاشرت کی اصلاح کے لیے معلوم نہیں کتنے قانون بنا ڈالے گئے ہیں۔ لیکن ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' کی مثال ان پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

تعمیری منصوبے

بہ ہر حال وعظ و پند اور قانون و احتساب سے شاید ہی آپ میں سے کوئی شخص یہ توقع رکھتا ہو کہ ان کے ذریعے وہ خرابیاں دور ہو سکتی ہیں جن کا تذکرہ پہلے کیا گیا ہے۔ ہاں اگر آپ یہ کہیں، تو ایک حد تک معقول بات ہوگی، کہ ہماری حکومتیں صرف انھیں چیزوں پر تکیہ نہیں کیے ہوئے ہیں، بلکہ وہ اصلاح و تعمیر کے بڑے بڑے منصوبے بھی بنا رہی ہیں، جن کے بہ روئے کار آنے پر یہ خرابیاں دور ہو جائیں گی اور یہی ان کی اصلی غرض ہے۔

یقیناً اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر ملک میں سڑکوں اور ریلوں کا جال بچھا دیا جائے، بجلی کے قمقمے گھر گھر لگ جائیں، اسکول، کالج اور یونی ورسٹیاں قدم قدم پر کھل جائیں، زراعت و کاشت کے نئے نئے آلات اور مشینیں استعمال ہونے لگیں، جا بجا بڑے بڑے کارخانے قائم ہو جائیں تو ان چیزوں سے صرف لوگوں کی راحت و آسائش ہی میں اضافہ نہیں ہوگا بلکہ ان سے ملک کو بہ حیثیت مجموعی اور بھی طرح طرح کے فائدے پہنچیں گے۔ لیکن اصل

سوال یہ ہے کہ کیا فی الحقیقت ان چیزوں سے ملک کی موجودہ خرابیاں دور ہوسکیں گی؟ نئے آلات اور مشینوں کے ذریعے اگر زمینیں غلے اُگلنے لگیں، لیکن کاشت کار اور بنیے مل کر غلے کو بازاروں میں آنے ہی نہ دیں، بالا ہی بالا فروخت کرڈالیں تو آپ ہی بتایئے پیداوار کی زیادتی وافراط کے باوجود لوگ بھوکوں نہیں مریں گے؟ اس وقت بھی ملک میں غلّہ کتنا ہی کم کیوں نہ پیدا ہوتا ہو، پھر بھی ملکی ضرورت کے لیے وہ اتنا ناکافی نہیں ہے جتنا کہ اس وقت نظر آرہا ہے۔ لیکن ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کرنے والوں نے ملک میں وہ کیفیت پیدا کردی ہے کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہندستان کے کھیت غلّے کی بہ جائے بھوک اور فاقے کی فصل اگاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ان کے رعب داب کا حال یہ ہے کہ ہر چند وزیرخوراک چاہتے ہیں کہ ملک میں غلّے پر سے کنٹرول ختم کردیا جائے، لیکن وزارت اپنی فوج، پولیس اور اپنے قوانین اور عدالتوں کے باوجود تھرارہی ہے کہ کہیں یہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا کر وہی قیامت پھر نہ برپا کردیں جو اس سے پہلے ایک مرتبہ کنٹرول ختم کرنے کے موقع پر ہوچکی ہے۔ اسی طرح اگر یہاں بڑی بڑی فیکٹریاں اور ملیں قائم ہوجائیں، لیکن نہ ان کے مالکوں میں، جو خواہ حکومت خود ہو، یا عام افراد، انصاف و ہم دردی ہو اور نہ مزدوروں میں دیانت وخلوص تو اکثر ایسا ہی ہوگا کہ احتجاج و ہڑتال اور جوابی کارروائیوں سے یہ کارخانے بند رہیں گے اور جو پیداوار ان سے برآمد بھی ہوگی غلّے ہی کی طرح ملک کی دوسری ضرورتیں بھی اس سے پوری نہیں ہوسکیں گی اور ان کا فائدہ بس تھوڑے سے افراد تک محدود رہے گا۔

ملک میں ہر جگہ تعلیمی ادارے قائم ہوجائیں لیکن ان میں وہی تعلیم وتربیت رائج ہو جو اس وقت رائج ہے اور جس کے بارے میں ابھی حال میں خود حکومت کے ایک ذمے دار فرد، جو بہت بڑے ماہر تعلیم بھی ہیں، فرما چکے ہیں کہ ''ہندستان کی اکثر بیماریاں ناقص نظام تعلیم کا نتیجہ ہیں۔'' تو درس گاہوں کی اس کثرت کا اس کے سوا اور کیا نتیجہ برآمد ہوگا کہ بڑے بڑے جرائم اس خوب صورتی کے ساتھ کیے جائیں گے کہ ان کے تدارک کے لیے قانون اور زیادہ بے کار ثابت ہوگا۔ غرض اگر اخلاق وسیرت اور لوگوں کی موجودہ ذہنیتوں میں کوئی فرق واقع نہ ہو تو یہ ترقیاں جو پیشِ نظر ہیں ان سے موجودہ خرابیوں میں اضافے کے سوا اور کیا نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے۔ اس وقت

توسڑکوں اور ریلوں، بجلی گھروں اور درس گاہوں کی قلت ہے۔ لیکن پھر بھی یہ خرابیاں اس درجے عام ہیں جب یہ سب سہولتیں حاصل ہو جائیں گی تو کیا انھیں کی نسبت سے خرابیاں اور زیادہ بڑھ نہیں جائیں گی؟ اور یہ سہولتیں ان خرابیوں ہی کے لیے استعمال نہیں ہونے لگیں گی؟ ایک اخبار نے کتنی اچھی بات لکھی ہے۔

''پانچ سالہ اسکیم ایک بہت بڑی اسکیم ہے۔ مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ جو لوگ اس پر عمل کریں گے وہ اور ان کا ماتحت عملہ صدق دلی سے اپنے فرائض سرانجام دے گا؟ کہیں خویش پروری نہیں ہوگی؟ کہیں عوام کا روپیہ ضائع نہیں ہوگا؟ اور کہیں بے ضابطگی نہیں ہوگی؟ سوال اسکیموں کا نہیں، سوال ایمان داری اور اخلاق کا ہے، اگر ہم اپنے عوام کا کیریکٹر اونچا نہیں کر سکتے تو بڑی سے بڑی اسکیم بھی بے کار ثابت ہوگی۔ آج کے ماحول میں جب ہر شخص پر روپیہ کمانے کی دھن سوار ہے اور چاندی کے سکے اور کاغذ کے نوٹ ہی ہماری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں تو یہ قدرتی امر ہے کہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ روپے کمانے کی کوشش کرے اور اس کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے اختیار کرے۔ یہ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ ہر شخص خود غرض اور سنگ دل بنتا جارہا ہے اور جو لوگ انصاف، سچائی اور اخلاق کی آواز بلند کرتے ہیں۔ دردر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔'' (تیج ۲۴رجون ۱۹۵۲ء)

یہی اخبار اپنے اسی مضمون میں ۴۷ء کی تعمیری اسکیم کا حوالہ دیتے ہوئے، جو پناہ گزینوں کو بسانے کے لیے تیار کی گئی تھی اور جس پر حکومت کا کروڑوں روپے صرف ہوا سوال کرتا ہے۔

''کیا کوئی شخص سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ ان کروڑوں روپیوں کا جائز استعمال ہوا اور اس رقم کا ایک بڑا حصہ ضائع نہیں ہوا ہے؟''

آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ جو کچھ عرض کیا جارہا ہے یہ نری بدگمانیاں ہیں۔ آپ خود دیکھ لیں کہ ان ترقیوں کے ساتھ یہاں کیا کیا خرابیاں کس کس شکل میں نمودار ہو رہی ہیں۔ باقاعدہ اسکیمیں اور منصوبے تو اب تیار ہو رہے ہیں لیکن ہندستان آزادی کے بعد اولین لمحے سے انھیں ترقیوں کی راہ پر چل رہا ہے۔ لیکن جو نتیجہ برآمد ہو رہا ہے اس کی جھلک آپ اعداد و شمار کے آئینے

میں پہلے دیکھ چکے ہیں! فرض کر لیجیے کہ یہ سب اسکیمیں بہ روئے کار آ گئیں اور ان کی بدولت ملک سے افلاس و ناخواندگی کا خاتمہ ہو گیا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہی ملک کی ساری خرابیاں دور ہو جائیں گی؟ کیا ان خرابیوں کا رشتہ صرف افلاس و ناخواندگی ہی سے بندھا ہوا ہے، درآں حالیکہ مشاہدہ یہ ہے کہ آج افراد و اقوام دونوں میں جو بھی دولت و تعلیم میں جتنا بڑھا ہوا ہے اتنا ہی وہ اخلاقی حیثیت سے گرا ہوا بھی ہے۔ پھر تعلیم و دولت کی ترقی سے اجتماعی زندگی کی وہ خرابیاں کیسے دور ہو سکتی ہیں جو ملک کے لیے براہ راست خطرہ ہیں؟ یعنی اونچ نیچ، نسل ونسب کا امتیاز، بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی، صوبائی عصبیت وغیرہ۔ کیا یہ چیزیں افلاس و ناخواندگی کا نتیجہ ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ بیماریاں زیادہ تر انھیں لوگوں میں پائی جاتی ہیں جو زیادہ پڑھے لکھے اور دولت مند ہیں؟ ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی نظر آ رہا ہے اور دوسرے ملکوں کا بھی یہی حال ہے۔ یورپ و امریکہ تعلیم و دولت میں کتنے بڑھے ہوئے ہیں؟ پھر بھی وہاں قوموں، قوموں میں جنگ و جدال برپا ہے۔ نسل ونسب اور رنگ کی تفریقات قائم ہیں۔ اور جنوبی افریقہ میں انھیں علم بردارانِ علم وتہذیب کے ہاتھوں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے تو اس وقت اہل ہند کا براہ راست واسطہ ہے۔ اس کی توجیہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

غرض یہ کہ یہ تعمیری اصلاحی منصوبے اپنی جگہ پر کتنے ہی مفید کیوں نہ ہوں، ہمارے نزدیک مُلک کی حقیقی مصیبتوں اور خرابیوں کا علاج نہیں ہیں۔ اگر یہ سب منصوبے زیرِ عمل آ بھی سکے تو ان کی افادیت زیادہ سے زیادہ اتنی ہے کہ آپ کسی کہنہ و بوسیدہ عمارت کی مرمت کرنا چاہتے ہوں، لیکن بنیادوں، دیواروں اور چھتوں کو مضبوط بنانے سے زیادہ اس کوشش میں لگے ہوئے ہوں کہ دیواروں کو زیادہ سے زیادہ نقش و نگار سے آراستہ کریں، کمروں کو عمدہ سے عمدہ سامان اور فرنیچر سے بھر دیں، اردگرد صحن و چمن آراستہ کریں، اگر یہ سب کچھ کسی نمائش یا تفریح کے لیے ہو تب تو خیر کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر مقصود مکان میں رہنا بھی ہو تو آپ کی ان کوششوں کی تعریف کوئی ہوش مند نہیں کر سکتا۔

فکری اصلاحات

اس موقعے پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ ملکی رہنماؤں کے سامنے صرف ان ظاہری تبدیلیوں ہی کا پروگرام نہیں ہے بلکہ وہ ملک میں فکری انقلاب کے لیے بھی کوشاں ہیں اور ایسی اسکیمیں بھی بہ روئے کار لائی جا رہی ہیں جو بہ راہِ راست مجلسی اور معاشرتی خرابیوں کو دور کر سکتی ہیں۔

جہاں تک فکری انقلاب بر پا کرنے کا تعلق ہے، ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ اس کے لیے یہاں بہت کچھ کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہم اس پر آگے بحث کریں گے کہ یہ فکری انقلاب ملک کو کہاں لیے جا رہا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ رہیں مجلسی و معاشرتی اصلاح کی کوششیں، تو جہاں تک قانون کے ذریعے ان کی روک تھام کا تعلق ہے، اس پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے کہ یہ طریقہ کہاں تک پیش نظر مقصد کے لیے کام یاب طریقہ کہا جا سکتا ہے اور اگر ان کوششوں سے مراد اس والنٹیر فوج کا قیام ہے جو پلاننگ کمیشن کے فیصلے کے مطابق ''بھارت سیوک سماج'' کے نام سے قائم کی جا رہی ہے تو ہر چند ہمارا احساس یہ ہے کہ پلاننگ کمیشن کے سارے منصوبوں میں اس کا یہ منصوبہ اپنے اغراض و مقاصد کے لحاظ سے شاید سب سے بہتر منصوبہ ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم بہ حالات ظاہر اس کے ساتھ بھی کوئی غیر معمولی توقع وابستہ نہیں کر سکتے۔ اس ادارے کے جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہیں وہ بلاشبہ اچھے ہیں۔ کیوں کہ وہ ملک کی بہت سی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تیار کیے گئے ہیں لیکن اصل سوال اس منصوبے کی اچھائی یا برائی کا نہیں ہے، بلکہ اس بات کا ہے کہ اس منصوبے کو زیرِ عمل لانے والے وہ اشخاص کہاں سے آئیں گے جن کے سینوں میں پنڈت نہرو کی خواہش کے مطابق اور ان کے ہی لفظوں میں:

> ''اعلیٰ جذبات موج زن ہوں، جن کے ولولے زندگی کی حقیر چیزوں اور ذاتی مفاد سے نہ ٹکراتے ہوں، بلکہ وہ اپنے آپ کو بھول کر اعلیٰ ترین مقاصد کو حاصل کرنے کے شوق میں سرشار ہوں۔''

ملک یقیناً اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوا ہے۔ لیکن خود غرضی، طمع و حرص اور دیگر اخلاقی خرابیاں لوگوں میں جس درجہ عام ہو چکی ہیں اس کی موجودگی میں یہ توقع کس درجہ کی جا سکتی ہے

کہ ضرورت کے مطابق ایسے بلند خیال اور بلند کردار اشخاص میسر آسکیں گے اور بالفرض اگر ایسا ہو بھی جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہوسکتی ہے کہ یہ ادارہ، جو شاید وعظ و نصیحت کے سوا اور کسی حربے کا مالک نہیں ہوگا، اپنے پیش نظر مقصد کے لیے کچھ کام بھی کر سکے گا۔ کیا اس سے پہلے اس سے چھوٹے پیمانے پر ایسے ہی اغراض کے لیے دوسرے ادارے وجود میں نہیں آچکے ہیں؟ ان کا حشر و انجام جو کچھ ہوا ہے، اس ادارے کا انجام کیوں ان سے مختلف ہوگا؟ ملک میں کسی تبدیلی و اصلاح کے لیے صرف اتنی بات تو کافی نہیں ہوسکتی کہ اس کی خواہش رکھنے والے کچھ مخلصین پیدا ہوگئے ہیں۔ جب تک خود لوگوں کی ذہنیتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوگی، مخلصین کا خلوص اور ان کی مخلصانہ جدوجہد کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا اور ذہنیتوں کی تبدیلی نہ قانون کے ذریعے ہوسکتی ہے اور نہ نری وعظ و پند سے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ ایک طرف چاہا تو یہ جارہا ہے کہ لوگوں میں اعلیٰ جذبات وصفات پیدا ہوں اور دوسری طرف جیسا کہ آگے تشریح کی جائے گی، خود اپنے ہی اہتمام میں ایسے افکار و نظریات کی ترویج و اشاعت کی جارہی ہے جو ہر قسم کے اعلیٰ جذبات وصفات کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے۔

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

اگر فی الواقع یہ سمجھا جارہا ہے کہ ملک کی اصلاح و ترقی کے لیے ایسے اشخاص درکار ہیں جو نہایت اعلیٰ جذبات وصفات سے متصف ہوں اور اس کے لیے کسی درجے میں اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ملک میں اس غرض کے لیے کوئی سازگار ماحول پیدا کیا جائے تو رہنماؤں کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ آخر انھوں نے ایسے لوگ اور ایسا ماحول پیدا کرنے کا کیا انتظام کیا ہے؟ کیا اس کے جواب میں وہ سیکولرزم کا نام لیں گے جس کو سب ہی رہنما بڑے شوق اور پیار سے پروان چڑھانے میں مشغول ہیں؟ حالاں کہ جیسا کہ آپ سنیں گے سیکولرزم ہی درحقیقت جملہ خرابیوں کی جڑ ہے۔ کیا اس کے جواب میں ان کوششوں کو سامنے لایا جائے گا، جو قوم میں قوم پرستی کی روح پھونکنے کے لیے کی جارہی ہیں؟ لیکن قوم پرستی تو خود ایک طرح کی خودغرضی ہی کا

نام ہے، اس میں اور ذاتی خود غرضی میں فرق چھوٹے بڑے درجے ہی کا تو ہے، ورنہ روح اور حقیقت کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ پھر یہ صفت محمود کس طرح ہو جائے گی؟ حالاں کہ یہ خود غرضی بڑی ہونے کی وجہ سے اور زیادہ قابلِ مذمت ہونی چاہیے اور جب قوم پرستی بھی خود غرضی ہی کا دوسرا نام ہے تو جو شخص قوم و ملک کے فائدے کے لیے خود غرضی کا مرتکب ہو سکتا ہے وہ آخر ذاتی اغراض کے لیے کیوں اس سے باز رہے گا؟ کیا چیز اس سے مانع ہو سکتی ہے؟

مصلحین کی کوتہ نظری

اصل بات یہ ہے کہ ہماری خواہشات تو بڑی نیک ہیں لیکن ہم کبھی سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر غور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں کہ یہ نیک خواہشات پوری کس طرح ہو سکتی ہیں۔ آزادی کے بعد ملک کے رہنماؤں کا سب سے مقدم فرض یہ تھا کہ وہ اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے کہ انگریزوں کی پیدا کردہ یا خود اس زمین سے ابھرنے والی وہ کیا خرابیاں ہیں جو پہلے مرحلے پر ان کی توجہ کی مستحق ہیں اور ملک کو آئندہ سعادت و ترقی سے ہم کنار کرنے کی حقیقی تدبیریں کیا ہو سکتی ہیں اور اس غور و فکر کے وقت نہ صرف یہ کہ وہ اپنے ذہن و دماغ کو مغربی تہذیب کے اثر سے بالکل آزاد رکھتے، بلکہ اس حوصلے کے ساتھ غور و فکر کرتے کہ ان کو دوسروں کو بھی راستہ دکھانا ہے۔ لیکن اس پر سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ غور کرنے کی بہ جائے انھوں نے گویا پہلے ہی قدم پر طے کر لیا کہ ہندستان کی حیثیت صرف انگریزوں کا اقتدار تھا۔ باقی رہے ان کے علوم و فنون، ان کی تہذیب و تمدن اور ان کا نظامِ حکومت۔ تو یہ سب چیزیں بس رحمت ہی رحمت ہیں۔ اس لیے ان کو نہ صرف یہ کہ بعینہٖ قائم رکھنا چاہیے، بلکہ جہاں تک ممکن ہو ان کو ترقی دینا چاہیے اور اسی شوقِ تقلید میں یہاں ایک طرف تو ہندستان کو ظاہری طور سے یورپ کا ایک خطہ بنا ڈالنے کی کوششیں شروع کر دی گئیں اور دوسری طرف نتائج پر دھیان دیے بغیر اس ملک کے لیے وہی لادینی نظامِ زندگی اختیار کر لیا گیا جو یورپ میں رائج ہے اور جس کا تھوڑا سا تجربہ ہندستان میں بھی کیا جا چکا تھا، حالاں کہ دراصل انگریزوں کا اقتدار جس قدر قابلِ نفرت تھا اس سے کہیں زیادہ قابلِ نفرت ان کی تہذیب اور ان کا نظامِ حکومت تھا، جس نے تھوڑے ہی عرصے

میں خود اس ملک کو بھی، جو کبھی اخلاق و روحانیت کا گہوارہ رہا ہے اخلاقی حیثیت سے پست سے پست تر بنا دیا ہے اور جس نے پوری دنیا کو اس طرح گندگیوں سے بھر دیا ہے کہ انسانیت صحیح معنوں میں اس سے پناہ مانگنے لگ گئی ہے۔

خرابیوں کی جڑ

اگر یہ بات صحیح ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق اس کے فکر و عقیدے کی پیداوار ہیں، افکار و عقائد تخم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اعمال و اخلاق اس کے برگ و بار کی! تو آپ خود ہی سوچیں کہ مغربی تہذیب و تمدن اور لادینی نظامِ زندگی کے ثمرات و نتائج کیا ہو سکتے ہیں؟

مغربی نظریۂ حیات

اگر اس دنیا کا کوئی خالق و مالک نہیں ہے جس کی رضا کا حصول ہماری جملہ انفرادی و اجتماعی کوششوں کا مقصود ٹھہرے اور جب اس کا عطا کیا ہوا کوئی ضابطہ اخلاق نہیں ہے، جس کو سامنے رکھ کر افراد و اقوام اچھائی یا برائی کا کوئی فیصلہ کر سکیں، اور جب اپنے اعمال کی کسی دانا و بینا ہستی کے سامنے کوئی جواب دہی کرنی نہیں ہے، جس کا اندیشہ ہمیں بااخلاق بنا سکے، تو پھر آپ ہی بتائیں کہ ہر فرد و ہر قوم کیوں نہ زیادہ سے زیادہ اس دنیا کے مزے لوٹنے کی کوشش کرے، کیوں نہ وہ اخلاقی ضابطے اپنی پسند و مرضی کے مطابق بنائے اور کیوں نہ وہ اپنے اغراض کے لیے دوسروں کی حق تلفیاں کرے۔ اور کون نہیں جانتا کہ ان ہی افکار و تصورات پر مغربی تہذیب و تمدن کی پوری عمارت قائم ہوئی ہے۔

بے شک انسان اپنی یا دوسروں کی خوشی کے لیے ایسے کام کر سکتا ہے جو صورتاً بھلے ہوں۔ لیکن ظاہر ہے افراد اور اقوام دونوں کی خوشیاں ایک دوسرے سے مختلف اور اکثر اوقات متصادم ہوتی ہیں۔ اس لیے بہ آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر خوشی کو مقصودِ عمل قرار دیا جائے تو دنیا انتشار و بدنظمی اور شر و فساد کا گہوارہ بن جائے گی۔

اسی طرح اگر خوشی کے بہ جائے ''کمال'' کو سعی و عمل کا مقصود قرار دیا جائے تو چوں کہ

خوشی ہی کی طرح کمال کے متعلق بھی انسانی تصورات ایک دوسرے سے مختلف اور متصادم ہیں، اس لیے اس کو مقصود ٹھہرانے کا نتیجہ بھی وہی ہوگا جو خوشی کو مقصود ٹھہرانے کا ہوسکتا ہے۔

احساسِ فرض کے تحت اپنے فرائض کو مخلصانہ ادا کرتے رہنا بھی لوگوں کی نگاہ میں زندگی کا ایک مقصد بن سکتا ہے۔ لیکن کیا اس سلسلے میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ فرائض کیا ہیں؟ اور کس طرح ان کو متعین کیا جاسکے گا اور کیوں وہ لوگوں کے لیے واجب العمل ہوں گے؟

خدا کو چھوڑ دینے کے بعد یہی وہ چیزیں ہیں جن کو لوگ اپنی زندگیوں کا مقصود بناتے ہیں۔ پھر کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ خوشی وکمال اور ادائے فرض کے نظریات پر، بدنیتی کے ساتھ نہیں، بلکہ پورے خلوص کے ساتھ عمل پیرا ہونے کے کیا نتائج دنیا میں رونما ہو رہے ہیں؟ چوروں، بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کا تو ذکر ہی کیا، جو بسا اوقات چوری، ڈاکے اور بدمعاشی جیسے جرائم خوشی ہی کے لیے کرتے ہیں، تعلیم یافتہ اور مہذب انسانوں اور لیڈروں تک میں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنی یا اپنی قوم کی خوشی کے لیے دوسروں کو شدید سے شدید نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کیا آپ ہندستان میں رہتے ہوئے اس بات سے انکار کرسکتے ہیں کہ ہندو مسلم بلووں کے موقعوں پر ایک مسلمان یا ایک غیر مسلم اپنے مقابل فرقے کے کسی بے گناہ کو قتل کر کے خوشی محسوس کرتا ہے اور اس کے فرقے کے کتنے ہی افراد اس پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں!

غور کیجیے خدا کو زندگی سے خارج کردینے اور خوشی وکمال کو مقصود ٹھہرا لینے کے بعد انسان کا نقطۂ نظر اپنے انفرادی معاملات میں کتنا ٹیڑھا ہوگیا ہے اور کیا کیا برائیاں کن کن شکلوں میں رونما ہو رہی ہیں؟

پھر غور کیجیے، خدا کو زندگی سے خارج کردینے کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہے کہ انسانی سعی و عمل کا کوئی حقیقی مقصد باقی نہیں رہتا ہے، بلکہ خیر وشر کو معلوم کرنے کا ذریعہ بھی ناپید ہوجاتا ہے۔

بے شک وجدان، عقل اور انسانی تجربات کسی نہ کسی حد تک خیر وشر معلوم کرنے میں معین ہوسکتے ہیں، لیکن کون نہیں جانتا کہ علم کے یہ وسائل اس بڑے مقصد کے لیے ہرگز کافی نہیں ہیں۔ وجدان صرف یہی نہیں کہ اکثر مسائل میں خاموش رہتا ہے، بلکہ اس کی آواز اتنی باریک ہے کہ ہر وقت سنی بھی نہیں جاسکتی اور مختلف حالات اور زمانوں میں اس کے فیصلے اکثر ایک

دوسرے سے مختلف بھی ہوتے ہیں۔

یہی حال عقل کا بھی ہے۔ یہ محدود و ناقص بھی ہے اور ساتھ ہی خواہشات اور ماحول سے اثر پذیر ہونے والے بھی۔ اس لیے یہ بھی پوری طرح اعتماد کے قابل نہیں رہے انسانی تجربات تو اول تو جب تک دنیا کی یہ گاڑی چلتی رہے گی، ان کو مکمل کہا نہیں جا سکتا کتنے ہی پچھلے تجربات ہیں جن کو رفتارِ زمانہ نے اب غلط ثابت کر دیا ہے اور اگر وہ کچھ قابلِ اعتماد ہوں بھی تو وہ مدوّن شکل میں کہاں موجود ہیں کہ لوگ ان سے خیر وشر معلوم کرنے میں مدد حاصل کر سکیں اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آج مختلف لوگ پچھلے تجربات ہی کا نام لیتے ہیں۔ لیکن وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف سمتوں میں چل رہے ہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس خدا کے سامنے جواب دہی کے تصور کو الگ کر دینے کے بعد کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ جاتی جو بھلائی اور راست روی کی محافظ بن سکے۔ حکومت اور سوسائٹی کو عام طور سے اس کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ یہ ان افراد ہی کا مجموعہ ہیں جن کے سامنے نہ کوئی صحیح و متعین مقصدِ زندگی ہے اور نہ خیر وشر معلوم کرنے کا کوئی متعین ضابطہ اور ان کو جو بھی اثر و قوت حاصل ہے، اس کا تعلق انسان کے صرف ظاہر سے ہے، باطن پر ان کی کوئی حکومت نہیں۔

بہ ہر حال ان سوالات پر اگر آپ سنجیدگی کے ساتھ غور کریں تو آپ محسوس کریں گے کہ کائنات اور اس کے اندر انسان کے مقام و حیثیت کے بارے میں جو نظریات یورپ نے پیش کیے ہیں ان کو قبول کر لینے کے بعد زندگی میں اخلاق و انسانیت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، چناں چہ یورپ اور اس سے متاثر ملکوں میں آج بد اخلاقیوں کا جو طوفان امنڈ پڑا ہے، یہ نہ سمجھیے کہ وہ کچھ اتفاقی حادثہ ہے، بلکہ درحقیقت ان نظریات کا براہ راست نتیجہ ہے۔ اسی طرح خود اس ملک کے حالات جو انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں سے روز بہ روز خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے ہیں تو گو اس کے کچھ اسباب مقامی و ملکی بھی ہیں لیکن حقیقتاً یہ زیادہ تر یورپ کے انھی لادینی افکار و نظریات کا نتیجہ ہیں، کم از کم ان کی یہ کثرت تو ان کی ہی رہینِ منت ہے۔ اس لیے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اخلاق و دیانت کا نام لینا ترک کر دینا چاہیے اور اس کے جو کچھ بھی نتائج برآمد ہوں ان کو بھگتنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ یا اگر اس خودکشی کے لیے آمادہ

نہیں ہیں تو پھر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے نجات کی کیا شکل ہے اور اس کی بہ جائے وہ کون سا نظام ہو سکتا ہے جو ہمارے لیے ہر طرح سے مفید اور ہر پہلو سے قابل قبول ہو؟ قبل اس کے کہ اس سلسلے میں کچھ عرض کروں، دو باتوں کی طرف میں خاص طور سے آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

انکار بلا تحقیق

پہلی بات یہ کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ یورپ نے جو لادینیت کی راہ اختیار کی ہے وہ کوئی علم و تحقیق کا نتیجہ ہے۔ یورپ میں لادینیت کی ابتدا اور اس کی ترقی کے اسباب کا اگر آپ تاریخی جائزہ لیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ درحقیقت کچھ وقتی اسباب و وجوہ کا نتیجہ ہے اور اس کا رشتہ علم سے زیادہ ایک منتقمانہ ذہنیت سے جڑا ہوا ہے جو یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے وقت، غلط مذہبیت اور مذہب کو آلۂ کار بنانے والے مذہبی اشخاص کے غلط طرزِ عمل کی بنا پر اس وقت کے اصحاب علم و تحقیق میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور یہ بھی نہ سمجھیں کہ اب بھی علمی طور سے پورا یورپ ان نظریات سے متفق ہے۔ وہاں بہ کثرت ایسے ارباب تحقیق پائے جاتے ہیں جن کا علمی مرتبہ لادینیت کے علم برداروں سے کسی طرح فروتر نہیں ہے اور یہ لوگ ان نظریات کو غلط سمجھ رہے ہیں اور ان کی غلطیاں دلائل سے ثابت کر رہے ہیں اور جہاں تک ان نظریات کے نتائج کا تعلق ہے، ان کی ہلاکت آفرینیاں تو اس درجہ عام اور اتنی واضح ہیں کہ ان کی بنا پر خود یورپ میں ان نظریات اور ان کی پیدا کردہ تہذیب و تمدن سے نفرت و بے زاری کا کھلم کھلا اظہار و اعلان کیا جا رہا ہے۔ یہاں موقع نہیں کہ اس قسم کے اعتراضات بیان کیے جائیں۔ صرف انگلستان کے ایک مشہور فلسفی سی۔ ایم جوڈ کی ایک ریڈیائی تقریر کے کچھ اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ مغربی تہذیب خود یورپ کے محققین کی نگاہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔

یورپ و امریکہ میں مہذب تعلیم یافتہ قوموں کے ہاتھوں خود اپنی ہی نوع کے خلاف قتل و نہب کا جو بازار گرم ہے اور حقیر و ذلیل مقاصد کے لیے خون اور روپے جس طرح برباد کیا جا رہا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں:

''جب ہم یہ صورت حال دیکھتے ہیں تو اس تہذیب وتمدن کی افادیت اور شرافت پر سے ہمارا ایمان اٹھ جاتا ہے جس کو ہم نے محض اس لیے اختیار کیا تھا کہ یہ ہماری فلاح و بہبود کی ضمانت ہوگی۔''

وہ مزید فرماتے ہیں:

''آخر اس تہذیب وتمدن کا مصرف کیا ہے، جس کو اختیار کرنے کے بعد بھی انسان اپنی ہی نوع کے لیے بھیڑیا ثابت ہوتا ہے، آج کے انسان اور عہدِ وحشت کے انسان میں کوئی تو فرق ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ جو تہذیب انسان کو اپنی نوع کا احترام نہ سکھائے، جو انسانیت کے ایک بڑے حصے کے لیے بوجھ اور زنجیر بن جائے اس کا مِٹ جانا اور مٹا دینا بہتر ہے۔''

محدود مذہبیت

دوسری بات، جو اس موقع پر عرض کرنی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ اس بات سے اطمینان محسوس نہ کریں کہ چوں کہ ہندستان نے ابھی دین کو بالکلیہ خیر باد نہیں کہہ دیا ہے، بلکہ یہاں کے لوگ مسجد و مندر کے ساتھ اب بھی اپنا رشتہ قائم کیے ہوئے ہیں اس لیے یہاں لادینیت کی وہ خرابیاں رونما نہ ہوسکیں گی، جو دوسرے ملکوں میں رونما ہوچکی ہیں۔ یہ اطمینان سراسر ناواقفیت کا نتیجہ ہوگا۔ لادینیت کا مطلب ہر صورت میں یہ نہیں ہے کہ مذہب کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی جائے۔ جن ملکوں میں لادینیت رائج ہے وہاں بھی مذہب کو صرف عام کاروبارِ زندگی سے نکالا گیا ہے۔ پرائیویٹ زندگی کی حد تک اس کو باقی رہنے کی اجازت دی گئی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ کثرت سے لوگ مذہب کو مان رہے ہیں اور اس کے اس محدود تصور کے ماتحت اب بھی ایک حد تک مذہبی زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن یہ مذہبیت خرابیوں کے لیے کسی درجے میں روک نہیں بن سکی، اس لیے آپ یہ دیکھ کر کہ لوگ اپنی پرائیویٹ زندگی میں عبادت یا پوجا پاٹ کرتے رہتے ہیں، یہ اطمینان ہرگز محسوس نہ کریں کہ اس کی وجہ سے وہ خرابیاں پیدا نہ ہوسکیں گی جو لادینیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ سوال کہ اس قسم کی مذہبیت کو کہاں تک مذہبیت کا نام دیا جاسکتا

ہے، ایک علیٰحدہ سوال ہے۔ یہاں موضوع کی مناسبت سے صرف اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جب ہماری زندگی کے تمام کاروبار خدا سے بے نیاز ہوکر انجام پائیں اور اسی کا پرچار بھی ہو، تو مذہب کے ساتھ یہ پرائیویٹ تعلق، زندگی پر کس درجہ اثر انداز ہوسکتا ہے اور باقی بھی رہ سکتا ہے یا نہیں؟ ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال پر محض نظری حیثیت سے غور کرنے کی بہ جائے آپ واقعات کی روشنی میں غور کریں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مذہب کے ساتھ یہ پرائیویٹ تعلق بھی روز بہ روز مضمحل ہوتا جارہا ہے اور جو لوگ اس وقت مذہب کے علم بردار ہیں وہ خود اسی لادینیت کے سیلاب میں بہتے نہیں چلے جارہے ہیں؟

صحیح نظامِ زندگی

اب آیئے، ہم اس سوال پر غور کریں کہ یورپ کے لادینی نظامِ زندگی کے مقابلے میں جس کی برائیوں پر اب تک تبصرہ کیا گیا ہے، وہ نظام کیا ہے جو صحیح بھی ہو اور ہر پہلو سے ہمارے لیے مفید بھی۔ اس نظام کی کچھ تفصیل بیان کرنے سے پہلے میں آپ پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر چند مغربی نظام کے غلبہ واقتدار کی بنا پر یہ نظام بہت سے لوگوں کی نگاہ میں شاید نیا ہو لیکن وہ نیا ہرگز نہیں ہے۔ یہی دنیا کا سب سے قدیم نظام ہے اور دنیا میں بارہا اس کا تجربہ بھی کیا جا چکا ہے اور یہ ہمیشہ کام یاب ثابت ہوا ہے، خود اس ملک کے بہت سے بزرگ قدیم زمانوں میں اس کے نام لیوا رہ چکے ہیں اور اب بھی یہ ملک ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے۔ ابھی حال میں اس ملک کے ایک لائق فرد ڈاکٹر رادھا کرشنن نے لندن سے ایک تقریر کی ہے جس میں انھوں نے ایک سیکولر اسٹیٹ کے نائب صدر ہوتے ہوئے بھی دنیا کو موجودہ ازموں کی بہ جائے ایک نئے نقطۂ نظر سے اپنے مسائل کو حل کرنے کی طرف دعوت دی ہے اور یہ نقطۂ نظر مذہبی نقطۂ نظر ہے۔ ہمیں کچھ تفصیل سے معلوم نہیں کہ موصوف کا تصور مذہبی نقطۂ نظر کے بارے میں حقیقتاً کیا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ تفصیلات میں، بلکہ بہت سے بنیادی مسائل میں بھی وہ ہم سے کچھ مختلف رائے رکھتے ہوں۔ لیکن کم از کم ان کے اس مشورے کی سمت وہی ہے جس کی ہم دعوت دیتے ہیں۔ اس لیے میں جو کچھ عرض کروں گا اس پر اس حیثیت سے غور نہ کریں کہ یہ کوئی نیا نقطۂ نظر ہے اور نہ یہاں کے غیر مسلم اس کو اس لیے نظر انداز کر دیں کہ اس وقت اس کی دعوت ان کے سامنے وہ لوگ پیش کر رہے ہیں جو مسلمان ہیں۔

کائنات کا صحیح تصور

مغربی تہذیب وتمدن پر جو تنقید کی گئی ہے اس سے آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس کی اصل خرابی یہ ہے کہ اس میں کائنات کی حقیقت اور اس کے اندر انسان کی حیثیت ومقام کو صحیح طور سے سمجھا نہیں گیا ہے۔ اس سے آپ خود بہ خود سمجھ سکتے ہیں کہ صحیح نظام زندگی وہی ہوسکتا ہے جس میں یہ بنیادی خرابی موجود نہ ہو، یعنی وہ اس سوال کے صحیح حل پر مبنی ہو کہ کائنات کیا ہے اور اس کے اندر انسان کا کیا مقام ہے؟

میں پہلے دلائل سے تعرض کیے بغیر اس صحیح حل کے کچھ موٹے موٹے خط وخال، ایک خاص ترتیب سے پیش کرتا ہوں۔ اگر ان کو سن کر آپ کا دل گواہی دے کہ صحیح حل یہی ہے اور آپ یہ بھی محسوس کرنے لگیں کہ اسی کے ذریعے دنیا کی موجودہ مشکلات حل ہوسکتی ہیں اور اسی کو اپنا کر وہ حقیقی سعادت وخوش بختی سے ہم کنار ہوسکتی ہے، تب تو مزید کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیوں کہ کسی حل کے صحیح ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ عقل وضمیر اس پر مطمئن ہوسکیں اور ہر مسئلہ اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھ جائے، ورنہ اس کے بعد دلیلوں پر بھی گفتگو ہوسکتی ہے۔

اس حل میں مغربی نظریات کے برعکس، تین باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

پہلی بات یہ کہ کائنات بھی مخلوق ہے اور اس کے اندر انسان بھی اور ان سب کا ایک خالق ہے اور خالق ہونے کی وجہ سے وہی ان کا حقیقی مالک بھی ہے، جس کو حق ہے کہ وہ کائنات اور انسانوں پر حکم رانی کرے اور مخلوقات کے لیے صحیح منصب ومقام یہی ہے کہ اگر وہ صاحبِ اختیار نہیں، تو چار وناچار، اور اگر کسی درجے میں صاحب اختیار ہیں تو اپنی خوشی سے، اپنی پوری زندگی میں اسی کی اطاعت وبندگی کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ خدا جب خالق ومالک ہے اور انسان کا اصل منصب یہی ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اس کی اطاعت کرے، تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کو اس کے خالق نے، جس کی ربوبیت نے اس کے لیے ہر طرح کی ضروریاتِ زندگی کا سامان کیا، زندگی گزارنے کے طریقے اور اپنی اطاعت کے ضابطے نہ بتائے ہوں، جب کہ بہ ظاہر انسان اس کا محتاج بھی ہے اور اس کو

وجدان و عقل کی جو قوتیں حاصل ہیں وہ اس مقصد کے لیے ناکافی بھی ہیں بہ الفاظ دیگر اس دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق خالق مالک کے بھیجے ہوئے ہدایت ناموں کو تسلیم کرنا ضروری ہے، جو ظاہر ہے، انسانوں ہی کے ذریعے انسانوں تک پہنچ سکتے ہیں اس لیے انبیاءؑ کا ایک سلسلہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جب اس دنیا کا ایک خالق و مالک ہے اور اس نے انسان کو اس دنیا میں اطاعت ہی کے لیے بھیجا ہے اور اس کے لیے اس نے ہدایت نامے بھی عطا کیے ہیں تو لامحالہ ایک ایسا دن ضرور آنا چاہیے جس میں اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ اس نے کس حد تک مالک کی اطاعت و بندگی کا حق اس کی ہدایت کے مطابق ادا کیا ہے اور یہ دن لامحالہ اس دنیا کے بعد ہی آنا چاہیے، جب کہ اس کائنات میں رہنے والے افراد اور قوموں کا پورا کارنامہ انجام پاچکا ہو۔

نتائج

اس دوسرے نقطۂ نظر کی ان بنیادی باتوں کو پیش نظر رکھ کر آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ان بنیادوں پر انفرادی و اجتماعی زندگیوں کا جو ڈھانچہ تیار ہوگا وہ اس ڈھانچے سے کتنا مختلف ہوگا جو مغربی نظریات سے تیار ہوتا ہے۔

سب سے پہلے پہلی اصل کو لیجیے۔ خدا کو اپنا اور کائنات کا خالق تسلیم کر لینے کے بعد انسان کا سر نہ حجر و شجر اور شمس و قمر کے سامنے جھک سکتا ہے اور نہ کسی اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کے سامنے۔ اس لیے اس کو عزت و سر بلندی کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو کسی اور نظریے کے ساتھ ممکن نہیں ہے اور آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ مغربی نظریات نے انسان کو خدا کی چوکھٹ سے ہٹا کر اس کو دنیاوی قوتوں اور انسانوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے بچالیا ہے۔ مختلف قوتیں اب بھی اس پر حکم راں ہیں اور انسان اب بھی، کسی نہ کسی شکل میں، انسانوں ہی کا غلام ہے، خواہ بہ صورت ڈکٹیٹر شپ ہو یا بہ صورت جمہوریت۔

خدا کو انسان اور کائنات کا خالق تسلیم کرنے کا دوسرا اہم نتیجہ یہ ہے کہ نسل و نسب اور رنگ و زبان اور جغرافیائی حدود کی بنا پر انسانوں میں جو باہمی تفریقات پیدا ہوگئی ہیں اس سے ان

کا خود بہ خود ازالہ ہو جاتا ہے۔ رجب سب کا خالق ایک ہی ہے اور سب انسان ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں تو ان میں ان بنیادوں پر تفریق و امتیاز کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔

پھر اس تصور کے ساتھ ان میں باہم اخوت کا رشتہ پیدا ہوتا ہے جو کسی اور مصنوعی طریقے سے پیدا نہیں ہو سکتا اور انسانوں ہی کے ساتھ نہیں، بلکہ دیگر مخلوقات کے ساتھ بھی ان کے برتاؤ کا طریقہ بدل جاتا ہے۔

اور اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنی جن قوتوں اور صلاحیتوں کا یا مال و دولت کا مالک ہے وہ فی الواقع اپنے کو ان کا مالک نہیں سمجھتا بلکہ اپنے کو ان کا امین سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی خواہشوں کے مطابق ان کو استعمال کرنے کا اپنے کو مجاز نہیں سمجھتا۔

خدا کو مالک مان لینے کے بعد انسان کا آزادانہ و غیر ذمے دارانہ طرزِ عمل بالکل بدل جاتا ہے۔ بہ حیثیت فرد اس کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں مالک کے منشا کے مطابق صرف ہوتی ہیں اور جب ایسے افراد سے کوئی مجموعہ تیار ہوتا ہے تو وہ بھی کسی طرح کوئی غیر ذمے دارانہ رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں اپنے کو خدا کا محکوم اور بندہ سمجھ کر اس کی اطاعت ہی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں اور یہ اطاعت زندگی کے کسی خاص جز و تک محدود نہیں ہوتی، پرائیویٹ اور پبلک زندگی اور سیاسی، معاشرتی، معاشی اور بین الاقوامی سارے معاملات و حالات پر حاوی ہوتی ہے۔

اب دوسری اصل کو لیجیے۔ یہ آپ پہلے سن چکے ہیں کہ خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو جانے کے بعد نہ تو بھلائی و برائی کے جانچنے کا کوئی صحیح معیار باقی رہ جاتا ہے اور نہ اس کو معلوم کرنے کا کوئی قابلِ اعتماد ذریعہ اور نہ ہی اس کو برقرار رکھنے کے قوی اسباب و محرکات۔ اس کے برعکس خدائی ضابطۂ حیات کو تسلیم کر لینے کے بعد خود بہ خود معیار بھی متعین ہو جاتا ہے اور ذریعہ بھی۔ اور چوں کہ یہ ہدایت نامہ خالق و مالک کا عطا فرمایا ہوا ہے، جس کی دل و جان سے وہ اطاعت کرنا چاہتا ہے، اس لیے خود اس کے اندر سے اس ضابطے پر عمل پیرا ہونے کی تحریک پیدا ہوتی ہے جو حکومت اور سوسائٹی کے اندیشے سے کہیں زیادہ مؤثر ہے۔

خدا کی ہدایت اور سلسلۂ انبیاء کو تسلیم کرنے کا یہ تو وہ فائدہ ہے جو اخلاق کے سلسلے میں پہلے قدم پر محسوس کیا جا سکتا ہے، یعنی یہ کہ اس کا معیار و ماخذ کیا ہے لیکن جو لوگ فلسفۂ اخلاق سے

واقفیت رکھتے ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ اخلاقی تعلیمات کو جب تک کہ عملی زندگی کے تمام پہلوؤں میں برت کر دکھلا نہ دیا جائے، عام طور سے لوگ نہ ان کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان کے اندر ان کو اختیار کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اس پہلو سے آپ دیکھیں تو انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت اور اُن کے اسوے دنیا کے لیے کتنی بڑی نعمت ہیں اور ان میں بھی خاص طور سے خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ، جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا پورا ریکارڈ پوری صحت کے ساتھ محفوظ بھی ہے۔

اب تیسری اصل یعنی آخرت کی جواب دہی کے تصور کو لیجیے۔ اس سے پہلے دونوں اصلوں کی جو خوبیاں گنائی گئی ہیں ان کا تکملہ اور تتمہ درحقیقت یہی تصور ہے۔ آخرت کی جواب دہی کا احساس ہی حقیقی ذمے داری کا احساس پیدا کرتا ہے اور اسی کے نتیجے میں انسان کا انفرادی و اجتماعی عمل صحیح رُخ اختیار کرتا ہے اور اس میں وہ روح پیدا ہوتی ہے جس کو خواہشات متاثر کر سکتی ہیں اور نہ مشکلات و ناکامیابیاں۔

یہ ہیں اس دوسرے خدا پرستانہ نظامِ زندگی کے وہ فوائد و ثمرات جو اجمالاً آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ اگر ایک طرف آپ ان کو رکھیں اور دوسری طرف غیر دینی نظام زندگی کے ان نتائج کو جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے تو آپ خود اندازہ کر لیں گے کہ ان میں کون قابل قبول ہے اور کس سے انسانیت کی مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔

لیکن یہاں پر ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہم نے اب تک ان دونوں نظام ہائے زندگی کے صرف موٹے موٹے اصولوں کو سامنے رکھ کر ان میں موازنہ کیا ہے۔ لیکن ان دونوں نظاموں کے ان موٹے موٹے اصولوں پر زندگی کے نہایت وسیع عملی خاکے بنتے ہیں اس لیے ان دونوں نظاموں کے باہمی فرق کا پورا اندازہ لگانے کے لیے آپ کو ان دونوں کے تفصیلی عملی خاکے پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہوگی۔

آپ کو معلوم ہے کہ لادینیت صرف ایک نظریہ ہی نہیں ہے اور نہ اس کے اثرات زندگی کے کسی خاص گوشے تک محدود ہیں، بلکہ یہ زندگی کے ہر ہر شعبے پر حاوی ہو چکی ہے اور اس کی بنیاد پر ہر شعبۂ زندگی کے متعلق مستقل نظامِ فکر بن چکے ہیں، یہ جمہوریت، یہ قوم پرستانہ

ڈکٹیٹرشپ اور آخر میں یہ اشتراکیت، یہ سب اسی لادینی تصورِ حیات کے پیدا کردہ سیاسی و معاشی نظام ہیں اور یہ آپ کو شاید معلوم ہی ہوگا کہ ان نظاموں نے دنیا کو کس قسم کے پھل دیے ہیں۔

اسی طرح اگر آپ دینی نظامِ حیات کو بھی اس کے ان اثرات و نتائج کی روشنی میں جانچیں، جو زندگی کے مختلف پہلوؤں میں اپنا اثر دکھلاتے ہیں تو آپ کو اس کے بارے میں بھی اندازہ ہو سکے گا کہ یہ کتنے وسیع اور گہرے اور کتنے مفید و بابرکت ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے مسائل خواہ سیاسی ہوں، یا معاشی یا معاشرتی، بہ ہر حال وہ بنیادی طور سے اس سوال سے متعلق ہیں کہ کائنات اور اس کے اندر انسان کی حیثیت کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اگر یہ نقطۂ نظر غلط ہے تو زندگی کے جس شعبے کے بارے میں بھی کوئی نظام سوچا جائے گا وہ غلط ہوگا، کیوں کہ جس اصل پر وہ قائم ہوتا ہے وہ خود غلط ہے۔ اور اگر وہ صحیح ہے تو پھر اس کی بنیاد پر جو چیز بھی تعمیر ہوگی، وہ صحیح ہی ہوگی۔ جمہوریت، اشتراکیت وغیرہ ازموں کی جملہ خرابیوں کی حقیقی جڑ یہی ہے کہ ان میں سیاسی و معاشی مسئلوں کو اس بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان اس کائنات کے اندر خود مختار ہے اور زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے اور انسان کا مرکزی مسئلہ صرف سیاسی یا معاشی مسئلہ ہے۔

ملکی مسائل اور اُن کا حل

اس وضاحت کی روشنی میں آپ غور کریں کہ آپ کے ملک کے جو فوری قابلِ توجہ مسائل ہیں کیا ان کا صحیح اور اطمینان بخش حل صرف اس خدا پرستانہ نقطۂ نظر میں مضمر نہیں ہے؟ اخلاقی برائیوں کا انسداد تو ظاہر ہے، اس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اور معاشی پریشانیاں بھی بڑی حد تک انھی اخلاقی برائیوں کا نتیجہ ہیں، اس لیے ان کا حل بھی صحیح معنوں میں اس پر ہی موقوف ہے۔ رہے انتشار اور پراگندگی کے بڑھتے ہوئے رجحانات، جو سیاسی حیثیت سے ملک کے لیے ایک بہت بڑا فتنہ ہیں تو ان کا حل بھی وحدتِ الٰہ اور وحدتِ انسانیت کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس پر آپ اچھی طرح غور فرمالیں۔

بین الاقوامی مسائل

میں نے اب تک اپنی گفتگو کو زیادہ تر ملکی مسائل تک محدود رکھا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں صرف اپنے ملکی مسائل ہی سے سروکار رکھنا چاہیے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ، جیسا کہ پچھلی تفصیل سے واضح ہوا ہوگا، درحقیقت اپنے زاویۂ نگاہ کو کسی ایک قوم و ملک تک محدود رکھنا نہایت تنگ نقطۂ نظر ہے، جس کا خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے کوئی میل ہی نہیں کیوں کہ وہ قوم و وطن کے حدود سے بالاتر اور محض انسانی نقطۂ نظر ہے۔ اور دوسرے یہ واقعہ بھی ہے کہ پہلے کسی زمانے میں اگر یہ ممکن بھی رہا ہو کہ کوئی قوم و ملک اپنے مسائل کو دوسرے ملکوں اور قوموں کے مسائل سے الگ کر سکے اور الگ کر کے ان کو حل کرے تو کم از کم اس زمانے میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے، علم کی ترقی نے دنیا کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ دنیا کے مختلف حصے آپس میں گھر آنگن کا تعلق رکھتے ہیں۔ ایک ملک خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی ہر اچھی بری حالت کا دوسرے ملکوں کی حالت پر اثر پڑ رہا ہے۔ اس لیے خود اپنے ملک کے مسائل حل کرنے کے لیے بھی دنیا کے مسائل کو نگاہ میں رکھنے کی ضرورت ہے۔

دنیا کے مسائل میں کچھ تو ہر ملک کے اپنے داخلی مسائل ہیں جو تقریباً اسی طرح کے ہیں۔ جیسے اس ملک کے مسائل۔ ان کے سلسلے میں مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ ان کے پیدا ہونے کے اسباب بھی وہی ہیں جو ہندستان کے ضمن میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ اس لیے جس حل کی نشاں دہی میں نے یہاں کے مسائل کے سلسلے میں کی ہے وہی ان ملکوں کے اس طرح کے مسائل کا بھی حل ہو سکتا ہے۔

دوسری قسم ان مسائل کی ہے جن کو بین الاقوامی مسائل کہا جاتا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت ان میں بنیادی اہمیت امن، آزادی اور انسانی حقوق کے مسائل کو حاصل ہے، جن کو نسلی غرور، معاشی حرص و طمع اور چند ملکوں کے سیاسی اقتدار کی بنا پر سخت خطرہ لاحق ہے اور اس کی بنا پر پچھلے دنوں دنیا کو دو عظیم جنگوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اور دوسری جنگ عظیم کی ہول ناکیوں سے نجات پاتے ہی، اب پھر تیسرے جنگ کے بادل سروں پر منڈلاتے نظر آ رہے ہیں۔

یو.این.او(U.N.O)

اس صورت حال پر ہر شخص تشویش محسوس کررہا ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے نجات کی سبیل کیا ہے؟ کیا اس کے لیے یو.این.او. سے کوئی امید وابستہ کی جاسکتی ہے، جس نے اس وقت تک کسی ایک مسئلے کو بھی سلجھایا نہیں ہے، بلکہ اور زیادہ الجھا دیا ہے؟ ہندستان کے فلسفی ڈاکٹر رادھا کرشنن اس پہلو سے پُرامید معلوم ہوتے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وفاقی قومیت کے نظریے کو پیش کرنے اور دنیا کو روحانی وسائل کو بہ روئے کار لانے کی دعوت دینے کے لیے انھوں نے یونسکو کے مقدس پلیٹ فارم کو منتخب کیا ہے۔لیکن ہماری ناقص سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب لوگوں کے ذہن ودماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ ہر قوم دوسری قوم سے جدا ہے اور حق و انصاف وہی ہے جس میں کوئی قومی مفاد ہو، تو وہ ڈاکٹر صاحب کے اس نکتے کی داد کس طرح دے سکتے ہیں کہ:

> ''عالمی قومیت کی وفاداری اور قومی وفاداری میں کوئی منافات نہیں ہے۔جارحانہ قوم پرستی ماضی کی یادگار ہے۔ہمیں اس کے دائرے سے باہر آنا چاہیے اور ایک بین الاقوامی سوسائٹی میں شریک ہونا چاہیے جو مستقبل میں امیدوں کا مرکز ہے۔''

اور ان لوگوں نے جب وحدتِ انسانیت کے تصور کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور اس دنیاوی زندگی ہی کو حقیقی زندگی سمجھ لیا ہے جس کے مفادات کے حصول میں کوئی اخلاقی ضابطے سامنے نہیں تو وہ یہ تربیت کس طرح حاصل کرسکیں گے، جس کی انھوں نے دعوت دی ہے کہ:

> ''یہ جولوگ سیاسی اقتدار، معاشی حرص اور نسلی غرور کے شکار ہیں ان کو اس سے نجات دلائی جائے۔''

یا یہ ادارہ اپنا یہ فریضہ کس طرح سمجھ سکتا ہے کہ:

> ''اس کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ خواہشِ امن کو ترقی دے بلکہ اس کو ایسے حالات برپا کرنے کا جذبہ بھی پیدا کرنا چاہیے جو امن، آزادی اور انسانی حقوق کو قائم کرسکے۔''

اگر یہ مقاصد حاصل کرنے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس لادینی تہذیب وتمدن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے جس نے دنیا کے حالات کو اس درجہ تک پہنچادیا ہے۔ اس کے بعد ایک صالح نظامِ زندگی کو اس کی جگہ پر قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ صالح نظام یقیناً مذہب ہی فراہم کرسکتا ہے جب تک یہ نہ ہوگا یہ خواب کی باتیں خواب ہی رہیں گی۔

مذہب کے غلط تصورات

لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ آج دنیا کو جس خدا پرستانہ نظام حیات کی ضرورت ہے اس کا مقصد ان مذہبی تصورات سے پورا نہیں ہوسکتا جن کو اس زمانے کا ذہن ودماغ کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہیں۔ اور نہ وہ تصورات ہی کچھ کار آمد ہوسکتے ہیں جن میں خود نسل ونسب کے امتیاز کی بیماریوں کو ہوا دینے یا خالق ومالک کے اقرار کو عملاً کالعدم کردینے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس غرض کے لیے درحقیقت وحدت اللہ، وحدتِ انسانیت اور پائدار اخلاق پر مبنی نظام حیات ہی کار آمد ہوسکتا ہے اور ہمارے خیال کے مطابق یہ باتیں ہر صحیح مذہب کی حقیقی بنیاد رہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعد کو انسانی آمیزش نے ان کو بدل دیا ہو۔

اس غرض کے لیے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ مذہبی زندگی کے بارے میں خود اہل مذہب کی بھی بعض ان خاص غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے، جو نظامِ حق کے برپا ہونے میں مزاحم ہیں۔ اس سلسلے میں دو باتیں خاص طور سے قابلِ لحاظ ہیں۔

ترک وتجرد

مذہب کے ماننے والوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ آدمی کو اگر واقعی مذہبی بننا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دنیا سے علیٰحدگی کا رویہ اختیار کرے۔ انسانی تعلقات خدا کے ساتھ تعلقات میں حارج ہوتے ہیں اور دنیاوی کاروبار میں شرکت روح کو گندہ کردیتی ہے جس کا مصفّٰی ہونا خدا کے ساتھ ربط قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تصور بنیادی طور سے غلط ہے اور اس تصور کا نتیجہ صرف یہی ہوسکتا

ہے کہ یہ دنیا فسق و فجور سے بھر جائے۔ اچھے لوگ جنگل اور پہاڑ کو آباد کریں اور دنیا پر اہل باطل کا اقتدار چھا جائے۔

انسان کے اندر جو مختلف قوتیں اور میلانات موجود ہیں وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ ترک و تجرد کی زندگی ایک غیر فطری زندگی ہے۔ صرف جنسی میلانات ہی کو لے لیجیے۔ اگر اس کے تقاضے اس طرح پورے نہ کیے جائیں جیسا کہ فطرت چاہتی ہے اور جس کا ضابطہ ان کے پیدا کرنے والے نے بنا دیا ہے تو اس کے اثرات خود فرد کے لیے بھی اور پورے معاشرے و اجتماع کے لیے بھی انتہائی تباہ کن ثابت ہوں گے۔ چناں چہ تاریخ اور روز مرہ کے واقعات شاہد ہیں کہ جب کبھی اس ترک و تجرد کے نقطۂ نظر کو اپنایا گیا اس کا شدید ردعمل انتہائی بھیانک برائیوں کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ پھر یہ نقطۂ نظر انسانی ساخت ہی نہیں بلکہ خود کائنات کی ساخت سے بھی غیر مطابق ہے۔ یہاں کی ہر چیز، صاف محسوس ہوتا ہے کہ انسانی فائدے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اگر انسان ان کو استعمال نہ کرے اور ان سے فائدہ نہ اٹھائے تو ان کی خلقت کی کوئی غرض و غایت ہی باقی نہیں رہے گی۔ پھر عملاً بھی یہ چیز ناممکن ہے۔ اتنے جنگل اور پہاڑ کہاں ہیں جہاں جا کر لوگ دنیا کو خیر باد کہہ سکیں۔ اس صورت میں جنگل اور پہاڑ ہی دنیا بن جائیں گے اور ساری دنیا اُجاڑ ہو جائے گی۔

اور پھر نتیجے کے طور پر اس نقطۂ نظر کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ روحانیت اور دنیاداری کے راستے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو جائیں گے۔ روحانی لوگ تو دنیا سے الگ ہو کر اپنے تزکیے و اصلاح میں لگ جائیں گے اور جو لوگ اس راستے کو اختیار نہ کرسکیں گے وہ روحانی زندگی کی طرف سے مایوس ہو کر زیادہ سے زیادہ دنیاداری میں غرق ہو جائیں گے۔ اس کا انجام یہی ہوسکتا ہے کہ دنیا فسق و فجور اور ظلمت سے بھر جائے اور واقعی نیک نفس لوگ اس سے گھبرا کر اسی غیر فطری زندگی کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔

اس بارے میں صحیح نقطۂ نظر، جو پچھلے بیان کردہ اصولوں کے مطابق سمجھ میں آتا ہے صرف یہ ہے کہ انسان اس دنیا کو دارالعذاب نہیں، بلکہ امتحان گاہ سمجھے اور یہاں کی ہر چیز کو اپنا دشمن نہیں، بلکہ خادم سمجھے اور اپنی مادی قوتوں اور صلاحیتوں کو بے کار و عبث، بلکہ روحانیت کے

لیے حارج سمجھنے کی بہ جائے خدا کا عطیہ اور اس کی بخشش سمجھے، جس کا مدّ عا یہ ہے کہ ان کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کیا جائے اور اس کے صحیح استعمال میں اپنے امتحان کی کام یابی سمجھے۔

مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے

دوسرا غلط تصور جو مذہب کے سلسلے میں رائج ہے، یہ ہے کہ مذہب کا تعلق کاروبار حیات سے ہے تو، لیکن وہ بس انسان کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق ہے۔ بقیہ کے سلسلے میں انسان آزاد ہے کہ اس کو جس طرح چاہے عقل و تجربہ اور فائدے کی روشنی میں گزارے۔ یہ نقطۂ نظر یوں تو ہمیشہ اور ہر دور میں کسی نہ کسی درجے میں پایا جاتا رہا ہے لیکن لادینی نظریۂ فکر نے اس زمانے میں اس کو تقریباً درجۂ کمال تک پہنچا دیا ہے، یہاں تک کہ حیرت ہوتی ہے کہ مذہب کے بڑے بڑے علم برداروں تک میں یہی ذہنیت سرایت کر گئی ہے، حالاں کہ یہ خیال بدایۃً غلط ہے۔ اگر واقعی خدا ہے، تو پوری زندگی کا خالق و مالک وہی ہے اس لیے اصولاً ہر شعبۂ زندگی میں اسی کے احکام کی اتباع ہونی چاہیے۔ کسی چیز کو اس سے مستثنیٰ رکھنا بے دلیل بات بھی ہے اور خلافِ حق بھی۔ مالک کوئی ہو اور حکم کسی کا بجالایا جائے۔ اس سے بڑی بے انصافی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ پھر اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ زندگی کو دو متضاد شعبوں میں تقسیم کرنے کا انجام کیا ہوگا؟ ان میں یا تو کش مکش ہوتی رہے گی، جس کا نتیجہ زندگی کے اختلال کی شکل میں نمودار ہوگا یا پھر غیر دینی عنصر غالب آجائے گا جو ہر طرح کی قوتوں سے مسلح ہے اور اس کے نتیجے میں دین ختم ہو کر رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ اس وقت دنیا کو جس قسم کے بھی، اندرونی اور بیرونی مسائل درپیش ہیں ان کا صحیح حل درحقیقت اس بات پر موقوف ہے کہ دنیا مغرب کے لادینی اثرات سے اپنے کو پاک کر کے پھر سے اپنی اصل کی طرف رجوع کرے، اپنے خالق و مالک کو پہچانے، اپنے کو اس کا محکوم و غلام سمجھے اور اپنی پوری زندگی اس کی دی ہوئی ہدایات کے سانچے میں ڈھال کر اس کی حقیقی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اصل کام یابی

اور میں یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس دینی نقطۂ نظر کی طرف صرف اس لیے لوٹنا نہیں ہے کہ ملکی یا بین الاقوامی مسائل کے حل کا اس پر دار و مدار ہے بلکہ چاہے یہ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں، ہمارے لیے نتائج سے قطع نظر، صحیح راہ یہی ہو سکتی ہے۔ جب ہم یہ جانتے ہیں کہ اس دنیا کا خالق و مالک ہے اور ہم اس کے بندے ہیں اور یہ دنیا دار الجزا نہیں، بلکہ دار العمل یا امتحان گاہ ہے اور ہمیں ایک روز خدا کے روبرو حاضر ہو کر اپنے تمام اعمال اور سرگرمیوں کا حساب دینا ہے تو ہمیں ہر حال میں صرف اس کی رضا کو مقصد بنانا چاہیے۔ اگر اس کے نتیجے میں وہ ہمیں دنیا میں بھی راحت و آسائش اور امن و سکون کی دولت عطا فرمائے تو یہ اس کا فضل ہوگا اور ہمیں بہ ہر حال اس کی توقع اور امید رکھنی چاہیے، کیوں کہ اس کا وعدہ یہی ہے۔ لیکن اگر بالفرض اس کی کسی مصلحت سے ایسا نہ بھی ہو تو اس کی وجہ سے ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی حقیقی کام یابی کی یہ راہ ترک کر دیں۔ دنیا کی کام یابی چھوٹی ہو یا بڑی، بہ ہر حال عارضی ہے اور حقیقی اور مستقل کام یابی محض آخرت کی کام یابی ہے۔ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰی۔"

جماعت اسلامی کی دعوت

اب تک آپ کے سامنے جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ زندگی کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر ہیں۔ ایک وہ جو مغربی تہذیب وتمدن پیش کرتا ہے اور اسی پر اس کی بنیاد قائم ہے اور دوسرا وہ جس کو مذہب پیش کرتا ہے اور جس کی دعوت ہر قوم اور ہر ملک میں ہمیشہ وہ لوگ دیتے رہے ہیں۔ جو انسانیت کے گل سر سبد تھے اور جن کا نام آج بھی عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور اس نظریہ کے مطابق جب بھی انفرادی و اجتماعی عمل کا کوئی نمونہ سامنے آیا ہے خواہ وہ کتنا ہی محدود وحقیر کیوں نہ رہا ہو انسانیت کو خیر وصلاح ہی کی نعمت حاصل ہوتی رہی ہے۔ جماعت اسلامی جس کی دعوت کی مجھے آپ کے سامنے وضاحت کرنی تھی اسی دوسرے نقطۂ نظر کی دعوت دیتی ہے، یہی اس کے قیام کا حقیقی مدعا اور اس کی سعی وعمل کا واحد مرکز ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ۱۹۴۱ء سے جب کہ اس کا قیام عمل میں آیا تھا اس وقت تک کیا کچھ کیا ہے؟ اس پر گفتگو کرنے کے لیے وقت اور فرصت درکار ہے۔ بہ ہر حال اس کی بہت کچھ تفصیلات اس کی رودادوں سے معلوم کی جاسکتی ہے اور اگر آپ نے قیم جماعت کی وہ رپورٹ سنی ہوگی جو صبح کے اجلاس میں پیش ہوئی ہے تو اس سے جماعت کے گزشتہ سال ڈیڑھ سال کی سرگرمیوں اور ان کی نوعیت کا بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں اس لیے اس موقع پر میں جماعت کی گزشتہ کارگزاریوں اور سرگرمیوں کا تذکرہ نظر انداز کرتے ہوئے، اختصار کے ساتھ اس کے بنیادی طریق کار پر کچھ مختصر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

طریق کار

ہر جماعت کا طریقِ کار اس کے مقصد کے تحت اور اس کی مناسبت سے متعین کیا جاتا ہے۔ جماعت کے مقصد کی جو توضیح آپ کے سامنے کی گئی ہے اس سے اس کی چند خصوصیات یقیناً آپ نے محسوس کی ہوں گی۔

پہلی یہ کہ یہ خدا پرستی کی دعوت ہے۔ اس لیے اس میں کسی دنیاوی غرض کا شائبہ نہیں پایا جاسکتا اور اگر ہو تو یہ اس کا نقص ہے جو خود اس کے ہی لیے تباہ کن ہوسکتا ہے۔

دوسری یہ کہ خدا پرستی کا مفہوم اس کے نزدیک نہایت وسیع ہے۔ اس کے دائرے میں انسان کی صرف انفرادی نجی زندگی ہی نہیں آتی، بلکہ اجتماعی زندگی بھی اپنے جملہ شعبوں سمیت اس کے مفہوم میں داخل ہے۔

تیسری یہ کہ خدا پرستی کے ساتھ، جس میں لامحالہ وحدتِ الٰہ اور وحدت انسانیت کا تصور شامل ہے، قوم پرستی، وطن پرستی اور نسل پرستی وغیرہ پرستیوں کا کوئی جوڑ نہیں لگ سکتا اس لیے جماعت کی دعوت بھی کسی خاص قوم و ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس کا تعلق ہر قوم و ملک سے ہے۔ سبھی اس کے مخاطب ہیں اور سبھی کا مفاد اس کے پیش نظر ہے۔

ان خصوصیات کو نگاہ میں رکھ کر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جماعت کا طریق کار ان سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے طریق کار سے قطعاً مختلف ہونا چاہیے جو یا تو مذہب کے محدود تصور کے ساتھ کام کر رہی ہیں، یا اپنے سامنے صرف دنیاوی یا کسی قوم و ملک کے قومی و ملکی و مفاد کو پیش نظر رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی نہ محدود معنوں میں کوئی مذہبی جماعت ہے اور نہ رائج الوقت معنوں میں سیاسی جماعت۔ اور اسی بنا پر ہمارا اب تک کا طریقِ کار یہ رہا ہے کہ ہم نے اپنے کو نہ صرف ہر اس تحریک سے علیٰحدہ رکھا بلکہ اس سے علیٰحدہ رہنے کی دعوت دی ہے۔ جس کا مدعا صرف کوئی دنیاوی و مادی غرض ہو اور اسی بنا پر ہمیں اب بھی ایسی تحریکات سے کوئی دل چسپی نہیں ہے، جو کسی دنیاوی غرض کے لیے ہوں۔

ہم نے اپنی دعوت کی دوسری خصوصیت کے پیشِ نظر ایک طرف خدا پرستی کے صحیح و وسیع

مفہوم کو دلائل کے ساتھ دلوں میں اتارنے کی کوشش کی ہے اور دوسری طرف مغربی نظریات پر مدلل اصولی تبصرہ کر کے یہ واضح کیا ہے کہ ان کے تحت زندگی کو خدا کے تصور سے خالی کر دینا یا اس کو پرائیوٹ زندگی تک محدود کر دینا کتنا غلط اور کتنا تباہ کن ہے اور اس سلسلے میں بہت وسیع لٹریچر تیار کیا گیا ہے۔

اور تیسری خصوصیت کے تحت ہم نے جہاں مسلمانوں تک اپنی دعوت پہنچانے کی کوشش کی ہے، وہاں اس بات کو بھی پیش نظر رکھا ہے کہ یہاں کے ہر فرقے کو اس سے روشناس کرا سکیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اردو کے علاوہ ملک کی دوسری زبانوں کو بھی اپنے کام کے لیے منتخب کیا ہے اور اسی غرض کے لیے ہندی میں قرآن مجید کا ترجمہ اور دیگر ضروری چیزیں شائع کر رہے ہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ اب تک ہم نے اپنا اولین مخاطب زیادہ تر مسلمانوں کو بنایا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر چہ ان کی اکثریت اس وقت عملاً اس سے غافل ہے لیکن چوں کہ عقیدۃً وہ اب بھی اسی کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، اس لیے دوسروں کے مقابلے میں ان سے ہمیں اس بات کی زیادہ توقع ہے کہ وہ اس دعوت پر سبقت کریں گے اور ان کے ذریعے اس دعوت کا عملی نمونہ سامنے آسکے گا۔

ان تین خصوصیات کے علاوہ ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہم دوسری جماعتوں کی طرح اپنے گرد کوئی بھیڑ جمع کرنا نہیں چاہتے جس سے وقتی طور سے جوش دلا کر کچھ کام لینا مقصود ہو، بلکہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ سب سے پہلے لوگ فکری طور سے ہماری دعوت پر متفق ہوں اور اس کے بعد جب وہ اسے حق سمجھ لیں تو اس کو اپنی پوری وسعت و استطاعت کے مطابق اپنی زندگی کی خصوصیت بنائیں اور اس کے خلاف کسی بات کو ارادی طور پر اختیار نہ کریں اور آخر یہ کہ اپنے اندر فکر و عمل کی ضروری تبدیلی پیدا کر کے اس بات کے لیے تیار ہو جائیں کہ سب مل کر حق کے علم بردار بنیں اور اپنے نمونے سے بھی دنیا کے سامنے اس کے حق ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

جماعت اسلامی کی تشکیل اسی طرح عمل میں لائی گئی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ جماعت میں جو لوگ شریک ہیں وہ کم و بیش اسی طرح اس میں شریک ہوئے ہیں۔ ہم اس سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں کہ نام تو خدا پرستی کا لیں، لیکن اپنے قصد و ارادے سے اس کے تقاضوں کو نظر انداز کریں، ہم اپنے نظریے کے مطابق دین کو پوری زندگی پر حاوی سمجھیں اور اضطرار کے بغیر

غیر دینی نظام کا جز بنیں، یا اپنے ہی خون پسینے سے اس کو پروان چڑھائیں۔ نعرہ تو ہم وحدت انسانی کا لگائیں۔ لیکن اپنی دل چسپیاں کسی خاص ملک وقوم ہی تک محدود رکھیں۔ ہم نے اپنی زندگی کو اس تضاد و منافقت سے پاک رکھنے کی پوری کوشش کی ہے اور اس کے لیے انفرادی و اجتماعی دونوں طرح سے سخت مشکلات کا مقابلہ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو اپنی دعوت کے صحیح تقاضوں کے مطابق پوری طرح تیار کرلیا ہے۔ لیکن بہ ہر حال نیت وکوشش یہی ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اس ارادے میں کام یابی عطا فرمائے۔ آمین!

یہ ہے ہمارے طریقِ کار کی مختصر وضاحت۔ اس کے بعد میں آپ کا وقت ان الزامات اور شکوک کی تردید میں صرف کرنا نہیں چاہتا جو بہت سے حلقوں میں ناواقفیت کی بنا پر ہمارے بارے میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جس مقصد کی وضاحت میں نے آپ کے سامنے کی ہے اور اس کے حصول کے لیے جس طریقِ کار کو مختصراً بیان کیا ہے اس کے بعد اس کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوئی ایسا طریق کار اختیار کریں جو اخلاق کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو، یا جو فرقے وارانہ، یا تخریبی کہا جاسکے۔ جب کبھی اس قسم کی بدگمانیاں ہمارے کانوں تک پہنچتی ہیں تو ہنسی بھی آتی ہے اور رنج بھی ہوتا ہے کہ اتنی صاف وواضح دعوت اور اس کے اتنے کھلے ہوئے طریقوں کی موجودگی میں لوگ کس طرح اس قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں!

مقصد اور طریق کار کی وضاحت کے بعد مجھے آخر میں چند باتیں مسلمانوں اور غیر مسلموں سے الگ الگ کہنی ہیں۔

غیر مسلموں سے خطاب

غیر مسلموں سے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد جن مشکل اور خطرناک مسائل سے ملک کو سابقہ پیش آرہا ہے وہ آپ کے سامنے آچکے ہیں اور ان کے ساتھ عالمی مسائل جن کا اثر لامحالہ ہمارے ملک پر بھی پڑتا ہے وہ بھی آپ کی نگاہ میں ہیں۔ کیا ان دونوں طرح کے مسائل کی موجودگی میں آپ یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ بے فکری اور اطمینان کے ساتھ

زندگی گزاری جائے اور جو کچھ پیش آرہا ہے یا آنے والا ہے اس سے بحث وتعرض نہ کیا جائے، یا آپ اپنی کچھ ذمے داری یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان حالات کو بدلنے میں جس حد تک بھی آپ حصہ لے سکتے ہوں، اس سے دریغ نہ کریں؟ پہلی صورت بے شک وقتی طور سے سکون واطمینان کی ایک صورت ہے۔ لیکن یہ اطمینان ایسا ہی ہوگا کہ طوفان سر پر آرہا ہو اور ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور یہ سمجھیں کہ اس طرح اس کی آفتوں سے ہم بچ جائیں گے، ظاہر ہے یہ اطمینان نہیں ہے بلکہ خودکشی کی ایک علامت ہے۔

یہی انجام ملکی مسائل سے غفلت اور بے پروائی کا بھی ہوگا پس اگر آپ خدانہ خواستہ اس انجام پر راضی ہیں تو ہمیں آپ سے کچھ کہنا نہیں ہے۔صرف آپ کی حالت پر افسوس کرنا ہے۔لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ غفلت اور بے پروائی آپ کے لیے، آپ کے خاندان کے لیے، آپ کے پڑوسیوں اور اہل محلّہ کے لیے اور پھر بہ حیثیت مجموعی پورے ملک کے لیے تباہ کن ہوسکتی ہے، تو آپ کا فرض یہ ہونا چاہیے کہ پوری سنجیدگی اور دقت نظری سے اس صورت حال کے جملہ اسباب کا تحقیقی جائزہ لیں اور پھر ان کے مناسب تدارک و اصلاح کے لیے کمر بستہ ہوجائیں۔ ہمارے خیال کے مطابق اس کے جو اسباب ہوسکتے ہیں، ضروری تفصیل کے ساتھ ہم نے ان کو بھی آپ کے سامنے پیش کردیا ہے اور پھر ہمارے نقطۂ نظر سے اصلاح کی جو واحد تدبیر ممکن ہوسکتی ہے اس کا بھی خلاصہ عرض کردیا ہے۔آپ ان پر غور کریں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کریں۔اس میں کسی تعصب وتنگ نظری کو ہرگز حائل نہ ہونے دیں۔ یہ مسئلہ اپنی حفاظت اور اپنی سلامتی کا مسئلہ ہے اور اس قسم کے مواقع تعصب وتنگ نظری کے لیے کسی طرح موزوں نہیں ہوتے اور پھر یہاں اس کا موقع بھی کیا ہے۔آپ کے سامنے اصولی امور کی حد تک کوئی نئی چیز پیش نہیں کی جارہی ہے۔آپ کو آپ ہی کا ایک بھولا ہوا سبق یاد دلایا جارہا ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جس خدا پرستانہ نظام زندگی کی ہم دعوت دیتے ہیں اس کے بنیادی اصول ہر قوم و ہر ملک کے اپنے آبائی اصول ہیں۔ کیوں کہ ان کی دعوت خدا کے نیک بندے، جن کو رسول و نبی کہتے ہیں، ہر دور میں ہر ملک وقوم کو دیتے رہے ہیں اس لیے اگر آپ ان کو اپنے قدیم مذہبی نوشتوں میں تلاش کریں گے، تو یقین ہے کہ اب بھی ان میں اس کے بہت سے آثار آپ کو مل جائیں

گے۔ لیکن میں تو اس سے بھی زیادہ ایک سہل راستے کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں، جو سہل بھی ہے اور پوری طرح محفوظ بھی۔ آپ اللہ کی بھیجی ہوئی آخری کتاب ''قرآن'' کا مطالعہ فرمائیں، جو اپنے کو خود اسی حیثیت سے پیش کرتا ہے کہ وہ تمام سابقہ آسمانی تعلیمات کا نچوڑ اور ان کا محفوظ کامل اور آخری نسخہ ہے۔ اس سے آپ کو پوری طرح اطمینان ہو جائے گا کہ اس کتاب نے زندگی کے لیے جو اصول متعین کیے ہیں وہی حقیقت ہیں اور ان پر ہی چل کر دنیا نجات سے ہم کنار ہو سکتی ہے اور یہاں یہ بات بھی آپ پیش نظر رکھیں تو اچھا ہے کہ دنیا نے ان اصولوں کو چھوڑ کر کافی ٹھوکریں کھائیں ہیں۔ غلط اور غیر فطری اصولوں پر چلنے کا انجام یہ ہوا ہے کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا ہے۔ اس لیے اب وہ پھر سے سوچنے پر مجبور ہو رہی ہے اور اگر اس کو اس ظلمت سے نجات حاصل کرنی ہے تو چار و نا چار اس کو انھی ہدایات کی طرف لوٹنا ہے جو اس کے خالق نے دی ہیں۔ چناں چہ اب تو یو، این، او تک میں مغربی نظریات پر بعض جری لوگ کھلّم کھلاّ تنقیدیں کرتے ہیں اور ان کے علم برداروں کو سوائے خاموشی کے ساتھ اسے سنتے رہنے یا شرم سے گردن جھکا لینے یا دبی زبان سے تائید کرنے کے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یو، این، او کے قیام کے اغراض جو کچھ بھی ہوں، اس کی تشکیل جس طرح بھی عمل میں آئی ہو اور اس وقت تک اس کی کارروائیاں اس کے بیان کردہ اغراض سے جس قدر بھی ہٹی ہوئی ہوں، لیکن وہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے دنیا کے ایک گھرانا ہونے اور تمام بنی نوع انسانی کے ایک برادری ہونے اور انسانیت کی بنیاد پر اپنے تمام مسائل حل کرنے کی بڑھتی ہوئی خواہش کی ایک علامت ہے۔ لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے محض ان مشکلات کے احساس کا نتیجہ ہے جو باطل افکار و نظریات نے پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان کو فی الواقع ان افکار و نظریات کے غلط ہونے کا یقین ہو گیا ہے اور جو کچھ اب وہ چاہنے لگے ہیں اس کی بنیاد کسی حقیقی نئے علم و تحقیق پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ان کی یہ خواہشیں محض خواہشوں کا درجہ رکھتی ہیں، ان کا عمل ان خواہشوں کے اثر سے خالی ہے یا اکثر ان کی خواہشیں اور عملی سرگرمیاں باہم ٹکراتی رہتی ہیں۔

بہ ہر حال ایک طرف یہ اصول و نظریات ہیں جن پر سے خود ان کے علم برداروں کا

اعتماد اٹھتا جارہا ہے اور اعتماد اٹھے یا بحال رہے ان کے نتائج وثمرات اس ملک میں، اور اس ملک کے باہر، حد درجہ تباہ کن ثابت ہورہے ہیں اور دوسری وہ دینی اصول ونظریات ہیں جن کی صداقت پر انسانی فطرت گواہ ہے جن کو ہر قوم وملک کے صالح اور عقل مند انسانوں نے ہمیشہ پسندیدہ سمجھا ہے اور ان کو اختیار کرنے کی دعوت دی ہے اور جن کی بنیادوں پر جب کبھی کوئی معاشرہ یا نظام حکومت قائم ہوا ہے اس سے دنیا کو امن وسکون نصیب ہوا ہے۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ آپ حسبِ دستور پہلے ہی نظریات کے مطابق چلتے رہیں اور ملک کو مزید تباہی و بربادی کی دعوت دیں یا آپ کو از سر نو اپنی تعمیر ان دوسرے نظریات کے مطابق کرنی ہے؟ آپ کو اپنے فیصلے کا اختیار ہے۔ لیکن ہم اپنے جذبۂ خیر خواہی کی بنا پر یہ کہنے کے لیے مجبور ہیں کہ ملک کی فلاح وسعادت اس دوسری ہی راہ کو اختیار کرنے میں مضمر ہے۔ لیکن آپ کو دھوکا نہ ہو میں اس راستے کی دعوت نہیں دے رہا ہوں جس کی دعوت یہاں کی بعض جماعتیں، جو احیاء ماضی کی خواہش مند ہیں، دیتی ہیں، یہ لوگ بے شک نام تو دین دھرم اور اللہ اور پرمیشور ہی کا لیتے ہیں لیکن ان کی سرگرمیوں پر قوم پرستی، وطن پرستی اور نسلی امتیازات کے رجحانات غالب ہیں اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، کسی دینی نظام میں ان کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ میں اس کی بہ جائے آپ کو بنیادی طور سے وحدتِ الٰہ، اس کے بھیجے ہوئے سلسلۂ ہدایت اور آخرت کی جزا و سزا پر ایمان لانے اور اس کو اپنے جملہ اعمال اور سرگرمیوں کی بنیاد بنانے کی دعوت دے رہا ہوں۔ باقی رہا یہ سوال کہ ان بنیادوں کو تسلیم کرنے کے بعد بھی زندگی کا کوئی مفصل عملی نقشہ تیار کرنے کے لیے کچھ تفصیلی خاکوں کی ضرورت پیش آئے گی اور وہ کہاں سے آئیں گے؟ تو اس بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ اس کے کچھ نہ کچھ خاکے تو شاید ہر مذہب میں مل سکیں گے، ان کو ان بنیادی اصولوں کے معیار پر پرکھ کر اختیار کیا جاسکتا ہے اور انھی بنیادی اصولوں کی روشنی میں ان میں جو خلا ہو اس کو قیاس واجتہاد سے پُر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جہاں تک مذہب اسلام کا تعلق ہے اس میں نہ صرف یہ کہ ایک پورے خدا پرستانہ نظام زندگی کے عملی خاکے موجود ہیں، بلکہ ان پر عمل درآمد کا ایک وسیع ریکارڈ بھی تاریخ میں محفوظ ہے، وہ اس سلسلے میں بہت زیادہ مفید ثابت ہوسکتا ہے اور نئے امور ومسائل کے حل کے لیے بہ ہر حال قیاس واجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

لیکن ابھی تو یہ مسائل بعد کے مسائل ہیں۔ سب سے پہلے مرحلے پر اصل سوال صرف اس نظریۂ زندگی کو قبول کرنے کی آمادگی کا ہے اور فی الحال ہم اُسی کی دعوت دیتے ہیں۔

مسلمانوں سے خطاب

اب میں اپنے مسلم بھائیوں سے کچھ خطاب کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو پوری سنجیدگی کے ساتھ اور پوری طرح غور وفکر کر کے اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ اسلام سے ہٹ کر زندگی گزارنی ہے، یا اس پر پوری طرح قائم رہ کر؟ اگر آپ خدانہ خواستہ پہلی صورت کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں، تو آپ کے لیے اس میں کوئی مانع نہیں ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس صورت میں وقتی طور پر کچھ افراد کو دنیاوی حیثیت سے کچھ فائدے بھی حاصل ہوسکیں۔ لیکن اگر آپ اس کے لیے تیار نہیں ہیں اور یقیناً آپ کی اکثریت اپنے ارادے کی حد تک ایسی ہی ہوگی، تو پھر سنجیدگی کے ساتھ اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام سے وابستہ رہنے کے معنی درحقیقت کیا ہیں۔ مسلمان آج جس طرح زندگی گزار رہے ہیں اس کو قطعاً غیر اسلامی زندگی تو نہیں کہا جاسکتا لیکن جس شخص کو اسلام سے ذرا واقفیت ہے وہ جان سکتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں سے جن باتوں کا تقاضا کرتا ہے بہت سے مسلمان ان کے احساس ہی سے سرے سے خالی ہو چکے ہیں، چہ جائے کہ وہ ان پر عمل پیرا ہوں۔ اسلام کا اپنے ماننے والوں سے اولین مطالبہ یہ ہے کہ جب انھوں نے اللہ کو خالق و مالک اور حاکم و معبود تسلیم کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و مقتدا تو پھر ان کو حتی الوسع اپنی پوری زندگی اس اعتراف و تسلیم ہی کے تحت گزارنی چاہیے، کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جو اللہ کے خالق و مالک اور معبود حقیقی کے اقرار کے منافی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہدایت کے خلاف ہو۔ پھر دین کا ایک کھلا ہوا تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ صرف اتنے ہی پر اکتفانہ کرلیں کہ آپ اپنی حد تک اس اقرار و ہدایت پر چل رہے ہیں، بلکہ آپ کا ایک اہم دینی فریضہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں۔ آپ کی حیثیت شہداء اللہ فی الارض کی ہے اور آپ کو خیر امت کا جو خطاب بارگاہِ خداوندی سے عطا ہوا ہے وہ آپ کے اسی منصب کی بنا پر ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (آل عمران:۱۱۰)

''(مسلمانو)! تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لیے ظہور میں آئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ پر (سچا) ایمان رکھنے والے ہو۔''

اور یہ ظاہر بات ہے کہ فریضۂ امر بالمعروف محض زبان سے ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے عمل کی شہادت بھی درکار ہے۔ پس جب تک آپ اپنی زندگی سے بھی اس حق کے حق ہونے کا ثبوت پیش نہیں کریں گے۔ جس کی طرف آپ دوسروں کو بلانا چاہتے ہیں اس وقت تک آپ کی زبانی جمع خرچ سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس وقت لوگ دنیا کے مختلف ازموں سے مایوس و پریشان ہونے کے بعد بھی اسلام کی طرف اس کی جملہ خوبیوں کے باوجود کیوں متوجہ نہیں ہوتے؟ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ خود ہماری زندگیاں اس کے اثر سے خالی ہیں بلکہ اکثر اوقات، ہم اپنی زندگیوں کے ذریعے اسلام کی بدنامی و رسوائی کے بھی باعث بنتے رہتے ہیں کیوں کہ مسلمان جو کچھ کرتے ہیں دوسرے لوگ اس کو سامنے رکھ کر اسلام کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔ اس طور سے صرف یہی نہیں کہ اس ملک کے رہنے والوں کو اسلام کے ذریعے جو نعمتیں حاصل ہو سکتی تھیں اور جن کے وہ ہمارے ہم وطن ہونے کی بنا پر مستحق بھی ہیں ان سے وہ محروم ہو گئے ہیں، بلکہ ہم نے اپنے ہاتھوں خود اسلام کو بھی سخت نقصانات پہنچائے ہیں۔ پس خود مسلمان بننے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم پر تبلیغ و اشاعت کی جو ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے انفرادی و اجتماعی دونوں طرح کے معاملات کو ٹھیک ٹھیک اسلام کے مطابق چلانے کی کوشش کریں۔ اسی کے ذریعے ہماری دنیا بھی درست ہو سکتی ہے اور آخرت کی کامیابی و فلاح کا تو اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے اور یہی ایک مسلمان کا حقیقی مقصود ہونا چاہیے۔ ہم آپ کو اسی راستے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کے سوا جتنے اور راستے ہیں ان سب کو غلط اور مسلمانوں کے لیے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ ان سے کچھ فائدے اگر پہنچیں گے بھی تو، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، محض دنیاوی فائدے ہوں گے اور وہ بھی وقتی و عارضی اور جہاں تک

اسلام اور مسلمانوں کی ملی حیثیت کا تعلق ہے ان کے سلسلے میں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکے گا بلکہ اس سے ان کو سخت نقصان پہنچے گا، کیوں کہ اسلام اور غیر اسلام دو متضاد چیزیں ہیں جن کو جمع کرنے سے مسلمانوں کا رویہ استقلال و یک سوئی سے خالی ہو جائے گا اور پھر ان کی ملی حیثیت باقی رہ سکتی ہے اور نہ وہ اسلام کے لیے کچھ مفید ہو سکتے ہیں، بلکہ صحیح معنوں میں ان تحریکات کے لیے بھی نہیں جن میں وہ اسلام کے لگاؤ کی بنا پر پوری ذہنی یک سوئی کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ ہندستان میں ایسے لوگوں اور ایسی جماعتوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو جمہوریت، اشتراکیت یا قوم پرستی اور وطن پرستی کے علم بردار ہوں۔ اگر آپ ان میں شریک ہو گئے تو اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ ان کے ذریعے جو تباہیاں پھیل رہی ہیں آپ کی شرکت سے ان میں کچھ اور اضافہ ہو جائے۔ لیکن دنیا تو ان ازموں کی بہ جائے ایک ایسے نظامِ زندگی کی منتظر و محتاج ہے جو اس کو اس کے موجودہ دکھوں سے نجات دلا سکے اور وہ یقیناً اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کتنی بڑی بد قسمتی ہے کہ ہر دین کے علم بردار تو ملتے ہیں۔ لیکن دین حق کی علم برداری کرنے والے مفقود نظر آ رہے ہیں۔ ہندستان میں اب بھی مسلمانوں کی تعداد چار کروڑ کے قریب بتائی جاتی ہے اور یہ سب اسی اسلام کے نام لیوا ہیں۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی علم برداری کی اہلیت و صلاحیت رکھتے ہیں وہ بھی اسلام کو چھوڑ کر انھی دوسرے ازموں کے حاشیہ بردار بنے ہوئے ہیں۔ اسلام کا نام لیتے بھی ہیں تو محض اس حیثیت سے کہ انسان کی پرائیویٹ زندگی کا معاملہ ہے یا حد سے حد یہ کہ محراب و منبر سے جب وعظ کہنا ہو تو اسلام کے نظام زندگی ہونے پر قرآن و سنت سے دلائل فراہم کر دیں۔ لیکن جب مسجد سے باہر قدم نکالیں تو نمونۂ زندگی اس بات کا پیش کریں کہ جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے، وہ ماضی کی بات ہے۔ اب اس زمانے میں اسلام نے کچھ اور شکل و قالب اختیار کر لیا ہے۔

بہ ہر حال ہماری موجودہ حالت اس پہلو سے بہت زیادہ افسوس ناک ہے۔ اس لیے میں سنجیدگی کے ساتھ آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ بہ حیثیت مسلمان اس پر غور کریں کہ یہ کہاں تک اسلام کے مطابق ہے۔ اگر فی الواقع آپ کو اسلام سے محبت اور لگاؤ ہے تو اپنی اس حالت کو یقیناً بدلنا ہو گا اور اس کی شکل صرف یہی ہے کہ آپ اپنے مسلمان ہونے کی حیثیت اور اس کے

تقاضوں کو ٹھیک طور سے محسوس کریں اور ان کے مطابق عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

یہی ہماری دعوت ہے۔ اس سلسلے کی مزید تفصیلات اگر آپ معلوم کرنا چاہیں تو وہ آپ کو ہمارے لٹریچر میں مل سکتی ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم کو، آپ کو اور سب کو اس راستے پر چلنے کی ہمت وتوفیق عطا فرمائے اور اس میں ہمیں ثابت قدم رکھے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہِ رَبّ العٰلمین۔

مسئلۂ انتخابات

اور

مسلمانانِ ہند

پیش لفظ

تقسیم کے بعد ہندستان کے مسلمان جس حالت میں زندگی گزار رہے ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کو ہر طرف سے ایسے احوال و مسائل نے آ گھیرا ہے کہ اگر اس موقع پر ان کی صحیح رہنمائی نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ یہ قوم ایک طرف اس ملک کے لیے وبالِ جان بن جائے گی جس میں وہ رہ رہی ہے ـــــ کیوں کہ اس وقت اس قوم کی سب سے نمایاں خصوصیت، مایوسی و اضطراب اور احساسِ کم تری ہے اور یہ ظاہر بات ہے کہ کسی ملک کے چار کروڑ سے زائد اشخاص پر اس قسم کی حالت کا طاری ہونا اس ملک کے حال و مستقبل کے لیے کوئی خوش گوار علامت نہیں ہے ـــــ اور دوسری طرف یہ قوم ان حالات میں گھر کر رفتہ رفتہ اسلام اور اپنی ملّی خصوصیات سے بھی بالکل کوری ہو جائے گی۔ جس کے بعد اگر یہ باقی بھی رہی تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا وجود و فنا دونوں برابر ہوگا۔

مسلمانوں کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے رہنمایانِ ملّت کا فرض تھا کہ وہ اس موقع پر آگے بڑھتے اور اتنی بڑی قوم کو یوں تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچاتے لیکن یہ دیکھ کر ہمارا دل خون ہوتا ہے کہ جن لوگوں پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ حقیقتاً اس کے اہل بھی ہیں وہ یا تو خود مایوسی کا شکار ہو کر گوشہ نشین سے ہو گئے ہیں یا اگر ان میں سے کچھ لوگ آگے بڑھ کر رہنمائی کا کام انجام دینا چاہتے ہیں تو وہ بالعموم اصلاح کے ایسے نسخے تجویز کر رہے ہیں جو مسلمانوں کے اصل مرض اور اس کے علاج سے کوئی حقیقی تعلق نہیں رکھتے۔ ان کا مقصد یا تو دفع

الوقتی ہے کہ ان کے خیال کے مطابق جب یہ قوم مرہی رہی ہے تو علاج و معالجہ سے فائدہ کیا ہے یا ان میں مریض کے مزاج اور اصل حالت سے زیادہ ماحول اور موسمی حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے اس لیے یہ تو ممکن ہے کہ وقتی طور سے ان نسخوں سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچ جائے لیکن جہاں تک اصل مرض کا تعلق ہے وہ ان نسخوں کے بعد بھی شاید جوں کا توں باقی رہ جائے اور اس لیے جو خطرات اس مریض کو درپیش ہیں وہ زود یا بدیر اس کے سامنے آ کر رہیں۔ اور یہ صورتِ حال ہمارے لیے اور زیادہ قلق افزا ہے کیوں کہ کچھ نہ ہونے کی حالت میں تو مریض کو اپنی صحت کی کم از کم فکر ہی ہوسکتی ہے لیکن اس صورت میں تو وہ اس جھوٹے اطمینان میں مبتلا ہوسکتا ہے کہ وہ علاج کر رہا ہے حالاں کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ علاج نہیں ہے۔

ہم اس خام خیالی میں مبتلا نہیں ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کے ہم اہل ہیں، حقیقتاً یہ کام اتنا مشکل اور پیچیدہ ہے کہ اس کے لیے ایک دو یا چند اشخاص کی فکر کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ اس کام کے لیے پوری ملّت کے اربابِ فکر کو سر جوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت ہے اور اسی وقت اس کا کوئی مستقل حل یا علاج سوچا جاسکتا ہے لیکن مذکورہ بالا حالات کو سامنے رکھتے ہوئے طبیعت اس پر راضی نہیں ہوتی کہ جب تک یہ کام نہیں ہوتا ہے اس وقت تک ہم بالکلیہ خاموش رہیں بلکہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم اس ضمن میں جو کچھ سوچ رہے ہیں اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں محض اس لیے دریغ نہ کریں کہ ہم سے زیادہ اہل لوگ اس موقع پر خاموش ہیں اور خاص طور سے یہ احساس اس کے لیے اور زیادہ محرک بن رہا ہے کہ ہم جو کچھ پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ہمارے نزدیک قرآن حدیث سے اخذ کیا ہوا نسخہ ہے اس لیے اس کا پیش کرنے والا کوئی ہو وہ بہ ہر حال لوگوں کے لیے ایک قابلِ اعتنا چیز ہے۔

اسی احساس کے تحت تقریباً ایک سال پہلے میں نے ماہ نامہ ''زندگی'' میں مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، جس کا مقصود یہی تھا کہ ملک و ملّت کے صحیح حالات کا جائزہ لیا جائے اور اس ضمن میں جو مختلف حل لوگوں کی طرف سے پیش کیے جا رہے ہیں ان کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ وہ کہاں تک صحیح اور قابلِ اخذ ہیں۔ اور اس کے بعد یہ واضح کیا جائے کہ ہمارے نزدیک

مسلمانوں کے مسائل کا صحیح حل کیا ہے، لیکن ابھی اس سلسلے کے چند ہی مقالات شائع ہوئے تھے کہ ملک میں الیکشن کا چرچا شروع ہو گیا اور چوں کہ آئندہ الیکشن کو گوناگوں وجوہ سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اس کے نتائج مسلمانوں کے حال و مستقبل پر بہت گہرا اثر ڈالنے والے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس سلسلے کو عارضی طور سے ملتوی کر کے پہلے الیکشن کے مسئلہ کو لے لیا جائے جو بہ ہر حال اس عمومی مسئلہ کی ہی ایک کڑی ہے اور اس سے فارغ ہو کر اس اصل سلسلے کو شروع کیا جائے۔ اس خیال کے تحت میں نے الیکشن پر لکھنا شروع کیا چناں چہ اس وقت تک اس کے سلسلے میں متعدد نمبر شائع ہو چکے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ جن لوگوں نے اس سلسلے کو ملاحظہ فرمایا ہے وہ اس کو پسند کرتے اور اسے وقت کی ایک ضروری چیز سمجھتے ہیں چناں چہ متعدد رسائل نے اس کو اپنے صفحات میں نقل کیا ہے اور کثرت سے لوگوں نے ہمت افزائی کے خطوط لکھے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ خواہش بھی کی ہے کہ اس کو مکمل کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

یہ مجموعہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ انہی حضرات کی خواہش و مطالبہ کی تکمیل ہے۔

میری خواہش یہ تھی کہ اس سلسلۂ مقالات کو کتابی شکل میں شائع کرنے سے پہلے میں اس پر کچھ اطمینان کے ساتھ نظرِ ثانی کر سکتا لیکن افسوس ہے کہ مصروفیتوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اور خاص طور سے اس کے آخری ابواب جو خلاصۂ بحث کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی تسوید و ترتیب کے لیے تو بہت ہی ناکافی وقت مل سکا ہے کیوں کہ مصروفیتوں کے ساتھ الیکشن کے سر پر آجانے کی وجہ سے اس کو شائع کرنے کی جلدی بھی ہے، تاہم نظرِ ثانی میں کافی اصلاح و ترمیم اور اضافہ کر دیا گیا ہے اور بعد کا حصہ بھی جہاں تک ہمارے مدعا کا تعلق ہے اس کی وضاحت کے لیے غالبًا بالکل کافی ہے، رہی اس کی تفصیل تو ان شاء اللہ فرصت مل سکی تو آئندہ اس کی کمیوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

آخر میں، میں یہ گزارش کرنی چاہتا ہوں کہ اس سلسلۂ مقالات کا جو اصل مقصود تھا

یعنی یہ کہ مختلف طریق ہائے عمل میں سے صحیح طریقِ عمل کھل کر آمنے آجائے اس کے لحاظ سے میرے لیے یہ ناگزیر تھا کہ ان طریقہ ہائے عمل پر تنقیدی نگاہ ڈالوں اس لیے مجھے اس کتاب میں جابجا مختلف جماعتوں اور اداروں پر تھوڑی بہت نکتہ چینی بھی کرنی پڑی ہے، یہ کام میں نے مجبوراً اور بادلِ ناخواستہ کیا ہے اس لیے اس کے لیے مجھے معذور سمجھا جائے اور اس سے کوئی غلط معنی نہ نکالے جائیں۔

رام پور ابواللیث

آئندہ انتخاب کی اہمیت

جمہوری نظام حکومت میں انتخابات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوا کرتی ہے۔ طرز حکومت کی تبدیلیوں اور نظم ونسق اور عام حالات میں اچھے یا بُرے ہر طرح کے انقلابات کا دامن انتخابات ہی کے ساتھ بندھا ہوا رہتا ہے، اس لیے ہندستان میں بھی جمہوریت کے ابتدائی تجربہ ہی کے وقت سے انتخابات کی اچھی خاصی اہمیت محسوس کی جاتی رہی ہے لیکن آزادی کے بعد انتخابات کی اس اہمیت میں اب بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ آئندہ انتخاب آئین جدید کے بہ موجب بالغ رائے دہندگی کے اصول پر منعقد ہونے والا ہے اور اس وقت ملک میں متعدد ایسی پارٹیاں موجود ہیں جو اپنے سامنے ملک کے آئندہ نظم حکومت کے بارے میں اپنا خاص اور ایک دوسرے سے مختلف نظام اور پروگرام رکھتی ہیں اس لیے آئندہ انتخابات کا مسئلہ اس وقت بڑے معرکہ کا مسئلہ بنا ہوا ہے اور لوگ اس وقت سب سے زیادہ اسی مسئلہ کی طرف متوجہ ہیں۔ ہر پارٹی جو انتخابات میں حصہ لینا چاہتی ہے وہ ابھی سے اس کے لیے سرگرم عمل ہے۔ ہر طرح کی تیاریاں مکمل کی جارہی ہیں تاکہ انتخابات میں زیادہ سے زیادہ کامیابیاں حاصل کی جاسکیں اور اس موقع کے ضائع ہوجانے کے بعد آئندہ پانچ سال تک انھیں زحمت کشِ انتظار نہ ہونا پڑے۔ جو جماعتیں حکومت واقتدار سے اس وقت محروم ہیں ان کی سرگرمیاں خاص طور سے بہت تیز ہیں اور یہ بالکل قدرتی بات ہے کیوں کہ انھیں ایک رائج ومقبول نظامِ حکومت کا مقابلہ کرنا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی قائم شدہ نظم حکومت کو اکھاڑ پھینکنا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جو پارٹی برسر اقتدار ہے وہ بھی ہر چند اپنی جگہ کچھ مطمئن سی ہے کہ اس کو شکست دے دینا کسی پارٹی کے لیے کوئی آسان

بات نہیں ہے لیکن وہ بھی اپنی تیاریوں سے غافل نہیں ہے، اس نے بھی الیکشن جیتنے کے لیے ہر طرح کے انتظامات شروع کردیے ہیں کانگریس کے آئین پر نظر ثانی، کانگریس کی اندرونی اصلاح کے چرچے اور مختلف کمیٹیوں کا قیام یہ سب اسی تیاری کی تمہید ہیں۔ بہ ہر حال آزاد ہندستان کے اس پہلے انتخاب کی پوری اہمیت یہاں کی ہر جماعت پوری طرح محسوس کر رہی ہے اور اسی کے مطابق اپنی پوری کوشش کے ساتھ اس انتخاب میں کام یابی حاصل کرنے کے لیے سرگرم کار ہے۔

مسلمانوں کی غفلت

لیکن جہاں ایک طرف انتخابات کی یہ ہماہمی ہے اور اس کے لیے شدومد کے ساتھ یہ تیاریاں ہیں وہیں یہ بات ہمارے لیے انتہائی رنج وقلق کا موجب ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے لیے یہ انتخابات جیسے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے ہیں۔ ان کی مجلسیں بالعموم ان کے ذکر سے خالی ہیں یا اگر ان کا ذکر ہے تو محض اس حیثیت سے کہ ملک میں کوئی تماشا ہونے والا ہے جس میں ان کو اس حیثیت سے حصہ لینا ہے کہ اس سے وہ کچھ لطف وتفریح حاصل کرسکیں اور بس، اس سے زیادہ وہ ان کو اس سے کوئی غرض ومطلب نہیں ہے۔ اور ہمارے اندازے کے مطابق مسلمانوں کی اکثریت ان ہی دوقسموں میں منقسم ہے اور ان کے علاوہ جو لوگ ہیں ان کو مسئلہ انتخاب سے بلاشبہ دل چسپی ہے لیکن ان کی دل چسپی محض اس حیثیت سے ہے کہ ان کو ہندستان کی چند مخصوص پارٹیوں میں سے کسی ایک کو اپنی تائید وحمایت کے لیے منتخب کرنا ہے یا وہ پہلے ہی سے ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر چکے ہیں اور اب اس کو انتخاب میں کام یاب بنانے کے لیے میدانِ جہاد میں اترنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ انتخابات ان کی قسمت پر بھی اثر انداز ہونے والے ہیں اور ان کا ان کی مخصوص ملی حیثیت پر بھی بہت گہرا اثر پڑنے والا ہے اس لیے، انھیں اپنے مخصوص زاویۂ نظر سے ان کا مطالعہ کرنا ہے اور اس کے مطابق کسی عملی اقدام کی ضرورت ہے تو اس اہم تر سوال سے ان کا ذہن یکسر خالی ہے۔ کیا کسی قوم کی اجتماعی موت کا اس سے بڑا بھی کوئی ثبوت ہوسکتا ہے؟ اور اگر اس حالت کے نتائج کو ذہن میں رکھ کر غور کیا جائے تو کیا اس۔ ے بھی کوئی بڑا موقع حسرت وماتم کا ہوسکتا ہے؟

غفلت کے مہلک نتائج

ہندستان میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد چار کروڑ کے قریب بتائی جاتی ہے اور بہ ظاہر اُن کے بارے میں یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ان کا مستقل فیصلہ یہیں رہ کر زندگی گزارنے کا ہے کیوں کہ اگر یہ بھاگنے والے لوگ ہوتے یا ان کے لیے بھاگنے کے مواقع اور سہولتیں ہوتیں تو وہ آج سے پہلے اس وقت بھاگ چکے ہوتے، جب یہاں کے خاص حالات کے تحت یہاں سے مسلمانوں کی عام بھگدڑ مچی ہوئی تھی لیکن اگر اُس وقت انھوں نے بھاگنے کا نام نہیں لیا تو بہ ظاہر یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ کی حد تک اپنی قسمت ہندستان کے ساتھ وابستہ کر چکے ہیں اور وہ اسی سرزمین میں زندہ رہ کر اسی کی خاک میں پیوست بھی ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہے تو یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ان کے اس فیصلے کے ساتھ ان کا یہ رویہ کہاں تک مطابقت رکھتا ہے کہ وہ یہاں کے عام حالات یہاں تک کہ انتخابات جیسے مسائل سے بھی بالکل بے تعلق ہو کر زندگی گزاریں!

اس ضمن میں سب سے پہلی قابلِ غور بات یہ ہے کہ قوموں کی زندگی کا دارومدار عمل اور حرکت پر ہے اور جمود و تعطل موت کا پروانہ ہے۔ اس لیے مسلمان اگر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنا یہ رویہ ناگزیر طور پر بدلنا پڑے گا۔ ورنہ زمانہ ان کے ساتھ وہی برتاؤ کرے گا جو مردہ لاشوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہ ان کو روندتا اور کچلتا ہوا آگے بڑھ جائے گا اور یہ قوم موت کی سسکیوں میں مبتلا ہو کر وقت پر اپنا دم توڑ دے گی۔ لاسامح اللہ

دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی قوم معاملات زندگی سے غیر متعلق ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس زمانہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ کسی ملک کے چھوٹے بڑے ہر انقلاب کا اثر اس کے گوشے گوشے پر پڑتا ہے اور چھوٹی بڑی ہر قوم اس سے متاثر ہوتی ہے اس لیے مسلمانوں کو یہاں کے ہر پیش آنے والے انقلاب پر بہت گہری نظر رکھنی ہے اور اس کے مطابق ان کو اپنی تیاریاں کرنی ہیں ورنہ یہ کوئی عجیب بات نہ ہوگی کہ آپ میٹھی نیند سوتے رہیں اور کوئی خطرناک انقلاب دفعتاً یا اپنی دھیمی رفتار سے اس طرح آپ کے سروں پر آکر کھڑا

ہو جائے کہ اس کو دیکھ کر آپ کے ہوش و حواس جواب دے دیں اور آپ کے لیے اس سے کوئی جائے فرار باقی نہ رہ جائے یا جس چیز کو آپ تماشا سمجھ کر اس سے لطف و تفریح حاصل کر رہے ہوں اسی سے آپ کے لیے کوئی ایسا فتنہ اٹھ کھڑا ہو جو آپ کی رہی سہی حیثیت کو بھی ختم کر دے اور خاص کر انتخابات کا معاملہ تو اس زمانہ میں طرح طرح کے انقلابات کا پیش خیمہ ہوتا ہے، ملک کے عام حالات اسی کے تابع ہوتے ہیں، اسی کے نتائج سے ملکی نظم و نسق کا سر رشتہ وابستہ ہے اس لیے کوئی قوم جو زندگی سے دست برداری کا فیصلہ نہ کر چکی ہو وہ اس کو اپنے لیے تماشا نہیں بنا سکتی اور نہ اس سے بے تعلقی اور بے توجہی اختیار کر سکتی ہے۔ اور ہندستان میں تو انتخاب کا معاملہ مسلمانوں کے لیے اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ انتخابات میں حصہ لینے والی متعدد پارٹیاں ایسی ہیں، جن کی انتخابی دل چسپی زیادہ تر مسلمانوں ہی کے پیش نظر ہے اور مسلمانوں کے لیے کچھ خصوصی فیصلے، ان کے انتخابی نقطۂ نظر کا اہم جز ہیں اور یہ بات تو بلا استثناء ان میں سے ہر ایک کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ وہ جن نظاموں کو اپنا کر میدان انتخاب میں اتر رہی ہیں یہ وہ نظام ہائے حیات ہیں جن کا ایک مسلم کے تصورِ حیات سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اور ان میں سے کسی کی کام یابی کا بھی مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہندستان کے مسلمان اپنے گوشت پوست کے لحاظ سے تو زندہ رہیں لیکن ان کی ملی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

بے تعلقی علاج نہیں ہے

ہمیں اس بات کا بہ خوبی احساس ہے کہ تقسیم کے بعد ملک کے حالات کچھ ایسے رہے ہیں کہ ان کی وجہ سے مسلمانوں پر ایک خاص طرح کے اضمحلال اور پژمردگی کی کیفیت طاری ہو گئی ہے اور جیسا کہ قاعدہ ہے اس پژمردگی نے ان کو ایک خاص طرح کے چڑچڑے پن میں مبتلا کر دیا ہے جس کی وجہ سے ان کا حال بعینہٖ اُس بچہ کا سا ہو گیا ہے جو والدین یا کسی اور کے کسی ناروا سلوک سے خفا ہو کر زمین پر بیٹھ رہتا ہے اور پھر سمجھانے والوں کی منت و سماجت پر بھی اٹھنے کا نام نہیں لیتا بلکہ اور زیادہ غصہ ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ نوچنے لگتا ہے۔ ان کی اس کیفیت کا ہمیں اندازہ ہے اور ہم اس کو ایک حد تک حالات کا قدرتی نتیجہ بھی سمجھتے ہیں۔ اس طرح کے

حالات میں جو قوم بھی مبتلا ہوگی اس کا کم وبیش اس طرح کی کیفیات میں مبتلا ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ بلکہ ہمارا تو خیال ہے اور ہم اس پر مسلمانوں کو مستحق تعریف سمجھتے ہیں کہ ان حالات کا وہ کم سے کم اثر انھوں نے قبول کیا ہے جو دنیا کی کوئی قوم قبول کرسکتی ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو اپنے غم وغصہ کی کیفیتوں سے بالکل الگ ہوکر اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ان جذبات کے تحت جو رویہ اس وقت اختیار کیے ہوئے ہیں وہ ان کی شکایات کے ازالہ کی تدبیر ہے یا وہ آئندہ ان میں اور زیادہ اضافہ کا باعث ثابت ہوگا۔ بچے اگر ضد کی راہ اختیار کرتے ہیں تو وہ اپنی کم عقلی کی وجہ سے اس کے لیے معذور سمجھے جاسکتے ہیں اور شاید ان کا یہ ضد کا رویہ بھی اس اعتماد پر مبنی ہوتا ہے کہ ان کے والدین اور اعزّہ ان کو زمین سے اٹھا کر سینے سے لگالیں گے، لیکن مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ ان کو منانے والا کوئی نہیں ہے، اس لیے ان کو ضد کی بہ جائے خود سوچ سمجھ کر ایسا رویہ اختیار کرنا چاہیے جس میں ان کا فائدہ ہو ورنہ ان کو بیٹھے چھوڑ کر آگے بڑھنے والے آگے بڑھ جائیں گے اور ہوسکتا ہے کہ آگے بڑھنے والے ان کو بیٹھے دیکھ کر اور دو چار ٹھوکریں رسید کردیں۔ یہ دنیا بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے، یہ کش مکش کا مقام ہے، اس لیے مسلمانوں کو یہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ جو کچھ ہونے والا ہے ہوتا رہے گا، ان کی علیٰحدگی کی وجہ سے کوئی کام بند نہیں ہوجائے گا اس لیے انھیں جو کچھ کرنا ہے اسے کرنے کی فکر کرنی چاہیے ورنہ بعد کو پچھتانے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تو کیا مسلمان خدانخواستہ اپنے اسی طرح کے انجام کے لیے آمادہ ہیں؟

کام کے غلط نقشے

مسلمانوں کی اکثریت کا عام طرزِ عمل تو وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے یعنی جمود وخمود اور معاملاتِ زندگی سے بےتعلقی لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو معاملات ومسائل میں حصہ لے رہے ہیں یا لینا چاہتے ہیں لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُنھوں نے اب تک اپنے کام کے جو نقشے تیار کیے ہیں وہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لیے انتہائی مہلک اور اسلامی نقطۂ نظر سے حد درجہ غلط ہیں۔

قومی تنظیم

کچھ لوگ اس انداز میں سوچ رہے ہیں اور ہمیں اندیشہ ہے کہ انتخابات کا زمانہ جتنا قریب آتا جائے گا اس انداز کے سوچنے والوں کی تعداد بڑھتی جائے گی کہ اس وقت سب سے مقدم کام مسلمانوں کی قومی تنظیم ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانیاں پیش آرہی ہیں وہ قومی تنظیم کے فقدان کا براہِ راست نتیجہ ہیں اور آئندہ کے لیے اُن کو جو خطرات درپیش ہیں ان کا مداوا اگر ممکن ہے تو اس کی واحد راہِ عمل قومی تنظیم ہے۔ گزشتہ دنوں یوپی کے بعض مقامات پر مسلمانوں کے بعض کنونشن منعقد ہو چکے ہیں اور جہاں تک ہم نے اندازہ کیا ہے ان میں شریک ہونے والوں کے ذہن و دماغ پر یہی احساس سب سے زیادہ چھایا ہوا رہا اور ہمارا خیال یہ ہے کہ جو لوگ اس سے پہلے مسلمانوں کی قومی تنظیم کی تحریک سے وابستہ رہ چکے ہیں ان کی اکثریت زیادہ تر اسی طرزِ عمل کی حامی ہے لیکن ہم نے اس مسئلہ پر جہاں تک غور کیا ہے ہماری قطعی دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ یہ طرزِ فکر خاص کر ہندستان کے موجودہ حالات میں انتہائی غلط اور حددرجہ تباہ کن ہے۔

بلاشبہ یہ پسندیدہ بات ہے کہ ہندستان کے مسلمان متحد ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ بالکل بکھرا ہوا ہے، وہ انتہائی پراگندگی کی زندگی گزار رہے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ہندستان میں چار کروڑ کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی بالکل بے وزن ہو کر رہ گئے ہیں اور اس کے باعث وہ طرح طرح کے نقصانات اٹھا رہے ہیں جن سے بچنے کے لیے ان کا متحد ہونا ضروری ہے اور آئین کے بہ موجب ان کو ایسا کرنے کا پورا پورا حق بھی حاصل ہے؟ لیکن اس کے ساتھ میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ یہ اتحاد و تنظیم اگر محض قومیت کی بنیاد پر قائم ہوگی اور اس کا مقصد محض یہ ہوگا کہ ہندستان کی موجودہ پارٹیوں پر اس کا دباؤ ڈالا جائے اور ان سے اپنے قومی حقوق کے بارے میں کوئی سودا کیا جائے تو یہ اتحاد و تنظیم ان کے لیے دینی حیثیت سے بھی غلط ہوگی اور اس سے ان کو دنیوی اعتبار سے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکے گا۔

اس ضمن میں سب سے پہلا سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی

موجودہ انتشار کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ بات عملاً ممکن بھی ہے؟ ہندستان کے موجودہ حالات بلاشبہ ان کے اتحاد و تنظیم کے داعی و محرک ہیں چناں چہ اسی بنا پر اس وقت بہتوں کے دلوں میں اس کی خواہش اور امنگ کروٹیں لے رہی ہے لیکن دوسری طرف حالات ہی نے ان کے لیے اس اتحاد و تنظیم میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کردی ہیں۔ مسلمانوں کا حال ایک عرصہ سے یہ ہو رہا ہے کہ ان کا دین کا رشتہ جو اُن کے درمیان حقیقی رابطۂ اتحاد تھا بہت کم زور ہوگیا ہے۔ وہ حبل اللہ المتین کو چھوڑ کر مختلف احزاب میں تقسیم ہوگئے ہیں جن کا کسی ایک نقطۂ اتحاد پر جمع ہونا بہت دشوار کام ہے، پھر اسی کے ساتھ بلکہ اس کے نتیجہ میں ان میں مفاد پرستی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے جس کے باعث اسلام یا مسلمانوں کے حقیقی مفاد کی ان کی نگاہوں میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ اگر وقتی جذبات کے تحت جمع بھی ہوسکتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے کبھی کبھی ہوا ہے تو وہ ایک عارضی اور وقتی چیز ہوتی ہے، جمع ہوتے ہی وہ منتشر ہونا شروع کردیتے ہیں اور وہ جمع ہونا بھی اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ اس پر اس لفظ کا اطلاق صورت کے لحاظ سے تو شاید کسی درجے میں صحیح ہوسکے لیکن حقیقتاً وہ جمع ہونا بھی درحقیقت انتشار ہی کی ایک شکل ہوتی ہے کیوں کہ وہ حقیقی روح جو جمعیت کا خاصہ ہے وہ کسی طرح پیدا نہیں ہو پاتی اور اسی بنا پر وہ نہ تادیر قائم رہ سکتی ہے اور نہ کسی ناموافق حالت کا مقابلہ کرسکتی ہے۔

اور تقسیم کے بعد تو ان کے انتشار کی یہ کیفیت اور زیادہ نمایاں ہوگئی ہے، ان میں کسی طرح کی فکری ہم آہنگی اور یک جہتی موجود نہیں ہے۔ اور اس وقت ہندستان کے مخصوص حالات بھی ایسے ہیں جو اس میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔ اور یہ پچھلے دور کے موانع کے ماسوا ہیں۔ مسلمانوں میں ابن الوقت اور مفاد پرست قسم کے لوگ پہلے بھی تھے لیکن اس وقت حالات ایسے مجبور کن نہیں تھے کہ وہ اسلام یا مسلمانوں کے ساتھ اپنے تعلق کو مصلحتاً بھی ظاہر نہ کرسکیں لیکن اب لوگوں کی مصلحت اندیشیاں ان کو اسی بات پر مجبور کر رہی ہیں چناں چہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے بڑے بڑے لوگوں کا یہ شیوہ سا ہوگیا ہے کہ وہ علانیہ ان سے اپنی بے تعلقی کا مظاہرہ کریں اور کتنے لوگ تو ایسے ہیں جو محض اظہارِ بے تعلقی کو کافی نہ سمجھ کر ان چیزوں سے اپنا تعلق قائم کرتے جارہے ہیں جن سے تعلق کے معنی ترکِ دین کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتے،

مسلمانوں کی اس حالتِ انتشار کا اندازہ آپ اور باتوں کے سوا صرف اتنی ہی بات سے بہ خوبی کر سکتے ہیں کہ آج ہندستان کی کوئی پارٹی نہیں ہے جس میں مسلمان شریک نہ ہوں، حد یہ ہے کہ ہندو مہا سبھا کے جنرل سکریٹری کے بیان کے مطابق بہت سے مسلمان ہندو مہا سبھا میں بھی شریک ہو رہے ہیں جس کے مقاصد و عزائم مسلمانوں کے لیے کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہیں۔ گویا مسلمانوں کی حیثیت اس وقت یہ ہوگئی ہے کہ نہ ان کا خود اپنا کوئی وجود ہے اور نہ کوئی مخصوص مطمحِ نظر، وہ ہر اس پارٹی کا ممبر بن سکتا ہے جس کی ممبری اس کے سامنے پیش کی جائے اور جس کے ذریعہ اس کے خیال کے مطابق کوئی چھوٹے سے چھوٹا دنیاوی فائدہ پہنچ سکتا ہو، پس جب حالت یہ ہو تو آپ کے پاس آخر وہ کون سی تدبیر ہے جس کے ذریعہ آپ یہ توقع کر سکتے ہوں کہ مسلمان مستقلاً نہ سہی انتخاب کی عارضی مدت کے لیے، انتخاب کو اپنے لیے مفیدِ مقصد بنانے کی خاطر مجتمع ہو سکیں گے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مسلمان اپنی اندرونی کم زوریوں اور بیرونی موانع کے باوجود متحد ہو سکتے ہیں تو بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جہاں تک الیکشن کا تعلق ہے اور جس پر غور کرنا اس وقت اصل مقصود ہے اس میں کام یابی حاصل کرنے کے لیے یہ تنظیم مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

قومی تنظیم اور الیکشن

انتخاب میں حصہ لینے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان بہ حیثیت جماعت الیکشن میں حصہ لیں اور اپنے طور سے اپنے امیدوار کھڑے کریں۔ لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں مسلمان شاید ایک دو نشستیں بھی حاصل کرنے میں کام یاب نہیں ہو سکیں گے۔ ہندستان کا آئندہ انتخاب جداگانہ طرز کی بہ جائے مخلوط بنیاد پر ہوگا جس میں کسی امیدوار کی کام یابی کے لیے ضروری طور پر غیر مسلموں کی تائید و حمایت کی ضرورت ہوگی کیوں کہ ہندستان میں شاید ہی کوئی حلقۂ امیدواری ایسا ہوگا جس میں مسلمانوں کی اتنی اکثریت ہو کہ وہ تنہا اپنے ووٹوں کے بل بوتے پر کام یابی حاصل کر سکیں انھیں لامحالہ غیر مسلموں کی تائید و حمایت کی ضرورت پیش آئے گی اور

موجودہ حالات میں یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ ان کے ووٹ اگر کسی مسلم امیدوار کو مل بھی سکتے ہیں تو وہ یقیناً وہ نہیں ہوگا جس کی تائید مسلمانوں کی تنظیم کر رہی ہو، یہ چیز عام غیر مسلموں کے نزدیک اس امیدوار کی نالائقی کی سب سے بڑی دلیل ہوگی۔ اُن کا ووٹ اگر کسی مسلمان کو مل سکے گا تو وہ ایسا ہی مسلمان ہوگا جو مسلمانوں سے اپنا رشتہ ناتہ منقطع کر چکا ہو اور اس کے دلائل وشواہد بھی اپنے ساتھ رکھتا ہو اور ایسے امیدواروں کا مل جانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ہم میں ایسے لوگوں کی کمی یوں بھی نہیں ہے اور اگر ہو تو ضرورت پڑنے پر اس کا انتظام بآسانی ممکن ہے اور ضرورت بہ ہر حال ہوگی کیوں کہ جب تک کچھ مسلمانوں کے نام ممبران کی فہرست میں شامل نہ ہوں گے، ہندستان کے سیکولرزم کا روپ ناقص رہ جائے گا اس لیے ایسے امیدوار ہر قیمت پر فراہم کیے جائیں گے۔

دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان اپنے امیدوار علیحدہ نہ کھڑے کریں بلکہ موجودہ پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی سے کوئی سمجھوتہ کرلیں اور پھر اس کے ساتھ مل کر الیکشن جیتنے کے لیے جدوجہد کریں۔

اگر یہ صورت ممکن العمل ہو تو مخلوط انتخاب کی حالت میں بلاشبہ یہ صورت مسلمانوں کے لیے بہت کچھ سفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن اس کا ممکن العمل ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے اس میں رکاوٹ تنہا یہی بات نہیں ہے کہ ہندستان کے مسلمان یا ان کی اکثریت کسی ایک پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ پر متفق نہیں ہو سکتی بلکہ خود ان پارٹیوں کی طرف سے اس کے لیے آمادگی ایک بڑی مشکل بات ہے۔ یہ پارٹیاں بلاشبہ اس وقت آپ کی حمایت وتائید کی بھوکی ہیں اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہندو مہاسبھا تک نے بھی اپنا دروازہ مسلمانوں کے لیے کھول دیا ہے لیکن اگر آپ کو ان کی ذہنیت کا اندازہ ہو تو آپ بآسانی اسے محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کی تائیدوں کے حاصل کرنے کے لیے آپ کے ساتھ کوئی ایسا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتیں جو مسلم قوم کے لیے بہ حیثیت قوم کچھ سودمند ہو سکے، ان کی اولین کوشش تو یہ ہوگی کہ وہ گرہ سے کچھ خرچ کیے بغیر محض ڈرا دھمکا کر آپ کے ووٹ حاصل کرلیں لیکن اگر آپ جرأت سے کام لیں گے اور اُن کی دھمکیوں میں نہیں آئیں گے تو پھر وہ آپ کو آپ کے ووٹوں کی زیادہ سے زیادہ جو قیمت دے سکتے ہیں وہ چند خوشامدانہ الفاظ ہوں گے یا مستقبل کے کچھ زبانی یا کاغذی وعدے، جن کی

اہمیت زیادہ سے زیادہ انتخاب کے زمانہ تک باقی رہے گی اور اس کے بعد وہ حوالۂ طاق نسیاں ہوجائیں گے۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ یہ پارٹیاں آپ کے ساتھ جو کچھ بھی سودا کرنا چاہیں گی وہ آپ کی قومی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ ہندستان کی تمام پارٹیاں خواہ وہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیاں ہی کیوں نہ ہوں اگرچہ باہم مختلف امور میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اس ایک نقطہ پر وہ سب متفق ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی معاملہ ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر نہ کیا جائے اور اس کے وجوہ بالکل ظاہر ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہاں کی ہر پارٹی خواہ وہ اپنے کو کیسے ہی عالم گیر و ہمہ گیر اصولوں کی حامل کیوں نہ ٹھہراتی ہو، ایک قومی نظریہ کی، اپنے مخصوص مفہوم کے ساتھ، دل سے حامی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر کوئی معاملہ کرنا اس نظریہ کے سراسر منافی ہے، ان میں سب سے زیادہ وسیع ظرف رکھنے والے بھی اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں کا کوئی قومی وجود ہو اور وہ ان پر اس کا کوئی معمولی دباؤ بھی ڈال سکیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ایسا کرنا کھلے طور پر ایک بے اصولی کی بات ہے۔ یہ پارٹیاں بہ ہر حال اپنے سامنے کچھ نہ کچھ اصول و مقصد رکھتی ہیں جن کو وہ حتی الوسع نباہنا چاہتی ہیں، وہ اگر اپنے اصول اور مقصد کو چھوڑ سکتی ہیں تو اسی وقت جب اس سے کوئی بڑا فائدہ مقصود ہو۔ مثلاً سننے میں آ رہا ہے کہ بعض مشہور اصولی جماعتیں الیکشن جیتنے کی خاطر ایسی پارٹیوں کے ساتھ اتحادِ عمل کرنے پر آمادہ ہیں جن کے درمیان باہم کسی تیسری پارٹی کی مشترکہ دشمنی اور مخالفت کے سوا اور کوئی رشتۂ اتحاد نہیں ہے لیکن ظاہر ہے مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کی نوعیت یہ نہیں ہے اس سے جتنا فائدہ پہنچ سکتا ہے اس سے زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ قومی بنیاد پر سمجھوتہ کر کے کوئی پارٹی الیکشن جیتنے میں کام یاب نہیں ہوسکتی۔ یہ سمجھوتہ بہ جائے خود اس پارٹی کی ''قومی غدّاری'' کا سب سے بڑا ثبوت ہوگا اور یہ بات اسے الیکشن میں لے ڈوبے گی۔

ایسی حالت میں عقل مندی کا تقاضا ہر پارٹی کے لیے یہی ہے کہ وہ اپنے اصولی ہونے پر سختی سے جمی رہے اور اس میں ذرہ برابر لچک پیدا نہ ہونے دے۔ الیکشن کا زمانہ کیسے ہی جنون کا

زمانہ کیوں نہ ہو کوئی پارٹی الیکشن جیتنے کے شوق میں اتنی دیوانی نہیں ہوسکتی کہ وہ مسلمانوں کے تھوڑے سے ووٹوں کے لیے یہاں کی اکثریت کو اپنا مخالف اور دشمن بنالے لیکن اگر کوئی پارٹی ایسی نکل بھی آئے تو اس سے بھی بڑی دیوانگی کی بات یہ ہوگی کہ آپ کسی ایسی دیوانہ پارٹی کے ساتھ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں کوئی سمجھوتہ کریں۔اس صورت میں اگر مسلم قوم کا بیڑا خدا نہ خواستہ کل ڈوبنے والا ہوگا تو آج ہی ڈوب جائے گا۔تو کیا اس کے لیے آپ کا دل آمادہ ہے؟

قومی تنظیم سے الیکشن میں فائدہ اٹھانے کی تیسری شکل یہ ہوسکتی ہے کہ مسلمان متحد ہونے کے بعد اگر بہ حیثیت قوم کسی پارٹی سے کوئی سمجھوتہ نہ کرسکیں تو کسی منظّم طریق کے مطابق وہ الگ الگ ٹولیوں میں مختلف پارٹیوں میں شریک ہوں اور اس پارٹی کو کام یاب بنانے میں حصہ لے کر اس کی فتوحات میں ساجھی بنیں۔

یہ صورت دیکھنے میں بڑی خوش نما معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس کی گہرائیوں میں اتر کر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ اول تو یہ صورت بھی ناقابل عمل ہے اور دوسرے اس سے مسلمانوں کو بہ حیثیت قوم کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہے۔ ناممکن العمل اس لیے کہ ایک طرف مسلمان افراتفری کے شکار ہیں، نہ وہ متحد ہوسکتے ہیں اور نہ ان میں بہ حالات موجودہ اس کی صلاحیت ہی ہے کہ وہ منظّم طور پر اس تدبیر کو زیرِ عمل لائیں۔ اور دوسری طرف یہ کام بھی چوں کہ مسلم قوم کی قومی تنظیم ہی کا ایک شاخسانہ ہوگا اس لیے اس کے ساتھ ان پارٹیوں کا طرزِ عمل وہی ہوگا جو اس سے پہلے اجتماعی سمجھوتہ اور تعاون کے ضمن میں گزر چکا ہے، اس لیے اس کا نتیجہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہوسکتا۔

اور غیر مفید اس لیے کہ ان دونوں باتوں کی موجودگی میں اس تدبیر کی جو عملی شکل ہوگی وہ صرف یہی ہوسکتی ہے کہ ان پارٹیوں میں مسلمان محض اپنی انفرادی حیثیت میں شریک ہوں اور وہاں پہنچ کر اپنے طور پر اسلام یا مسلمانوں کی کوئی خدمت بجالائیں، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ان کی یہ انفرادی شرکت مسلمانوں کے عمومی فائدے کے لحاظ سے بالکل ہی بے سود ثابت ہوگی جس کے وجوہ کھلے ہوئے ہیں۔

کسی پارٹی میں کسی مسلمان کی شرکت خواہ وہ عارضی طور سے انتخاب ہی کی خاطر کیوں

نہ ہو کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے کہ آپ نے اس کا ارادہ کیا اور یہ پورا ہو گیا اس کے لیے آپ کو سب سے پہلے امتحان و آزمائش کی ایک کڑی منزل سے گزرنا ہوگا۔ یہ اللہ کا دین تو ہے نہیں جس میں شرکت بہت آسان ہوگئی ہے، یہ پارٹیوں کا معاملہ ہے جو دکھاوے ہی کے لیے سہی بہ ہر حال اپنے سامنے کچھ اصول و مقصد رکھتی ہیں اور جب تک ان کو کسی کے بارے میں یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ وہ دل سے ان کے اصول اور مقاصد کا ماننے والا ہے، آسانی کے ساتھ اپنا دروازہ اس کے لیے کھول نہیں سکتیں اور خاص کر ایک مسلمان کے حق میں تو وہ اس احتیاط کی بہت زیادہ ضرورت محسوس کرتی ہیں کیوں کہ مسلمانوں کے بارے میں ان کو جو کچھ واقفیت ہے اس کے لحاظ سے وہ ان کے بارے میں پہلے ہی سے یہ بدگمانی یا خوش گمانی رکھتی ہیں کہ وہ ان کے اصولوں سے زیادہ اسلام کے اصولوں کا پابند ہوگا بہ ہر حال کافی چھان بین اور آزمائش کے بعد وہ کسی مسلمان کو اپنے اندر گھسنے کی اجازت دے سکتی ہیں اور اس کے بعد بھی وہ آخر دن تک اس سے مطمئن نہیں ہو سکتی ہیں اس لیے تحقیقات اور آزمائشوں کا سلسلہ داخلہ کے بعد بھی ختم نہیں ہو جائے گا، نئے نئے سوالات اور مواقع، خلوص و وفاداری کی جانچ کے لیے برابر سامنے آتے رہیں گے۔

پھر داخلہ کے بعد ہر مسلمان ممبر کو پارٹی ڈسپلن کا پورا پورا پابند ہونا پڑے گا۔ کوئی ممبر پارٹی کے فیصلوں سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتا ورنہ اس کی کم از کم سزا اخراج ہے۔ گویا کسی پارٹی میں شامل ہونے کے بعد آپ کی پوری حیثیت پارٹی میں ضم ہو جائے گی، یہاں تک کہ آپ اپنے زبان و دل کے بھی مالک نہیں رہیں گے۔ ایسی حالت میں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آپ انفرادی حیثیت میں کسی پارٹی میں شریک ہو کر اسلام یا مسلمانوں کے فائدے کے لیے کیا کام کر سکتے ہیں، الّا یہ کہ آپ اپنے اندر اتنی قوت رکھتے ہوں کہ آپ اس پارٹی کو بنیادی طور سے بدل ڈالیں لیکن کوئی احمق ہی ہوگا جو موجودہ حالات میں اس کے امکان کا تصور بھی کر سکے، یہ تو خیر دور کی بات ہے آپ کو اکثر حالات میں تو شاید یہ دیکھنا پڑے گا، جیسا کہ اس وقت عملاً دیکھا جا رہا ہے کہ محض مسلمان ہونے کی بنا پر آپ اپنے دوستوں کی نگاہوں میں کچھ کھٹک تو نہیں رہے ہیں اور پھر اگر آپ کو اس پارٹی میں رہنا ہے تو اس طرح کے اشتباہ کو رفع کرنے کے لیے آپ کو ایسی حرکتیں کرنی پڑیں گی جو اسلام یا مسلمانوں کے لیے بہ جائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوں۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آپ جب اپنی وفاداری کا پورا پورا امتحان دے چکیں اور اس میں سو فیصدی کام یاب ہو جائیں تو آپ اس پارٹی کی طرف سے الیکشن میں امیدوار بنا کر کھڑے کر دیے جائیں بلکہ اگر آپ کا نصیب زور آور ہوگا تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الیکشن میں اس پارٹی کے کام یاب ہو جانے پر آپ کو کوئی عہدہ و منصب بھی حاصل ہو جائے لیکن یہ یاد رکھیے کہ یہ سب عنایتیں آپ کے ''لایق'' ہونے کی شرط پر ہوں گی۔ نہ کہ اس بنیاد پر کہ آپ مسلمان ہیں اور ان عنایتوں سے آپ شخصی طور سے متمتع ہوسکیں گے اس سے آپ اسلام یا مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔

مذکورہ بالا باتوں کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں تو آپ پر یہ بات بہ خوبی واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کی قومی تنظیم، واقعات و تجربات کی روشنی میں کتنی غلط اور بے نتیجہ ہے اور اس سے ان کو نہ دین کا کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ دنیا کا لیکن اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے میں آپ کی توجہ ایک اور اہم بات کی طرف بھی مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ان باتوں سے قطع نظر کہ بہ حالات موجودہ قومی تنظیم کی نازک بیل کا منڈھے چڑھنا بھی ہے یا نہیں اور اس کے ذریعہ ہم الیکشن میں کوئی کام یابی حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں، ہمارے لیے سب سے زیادہ قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ قومی تنظیم کے جو تلخ تجربات ہم نے اٹھائے ہیں، جن کا ایک شاخسانہ ہماری موجودہ مشکلات و مصائب بھی ہیں، ان کے بعد اب دوبارہ اس کا تجربہ کرنا ہمارے لیے کہاں تک مناسب ہوسکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ہندستان میں جو ہندو مسلم کش مکش پیدا ہوگئی ہے اور جس میں خود ہماری غلط کاریوں کا بھی کافی دخل ہے اس کا ختم ہونا اسلام کے لیے بھی مفید ہے کیوں کہ اس کش مکش نے غیر مسلموں کے دل و دماغ کا دروازہ اسلام کے لیے بند کر دیا ہے اور یہ مسلمانوں کے دنیاوی فائدوں کے اعتبار سے بھی ضروری ہے کیوں کہ قومی بنیادوں پر مسلمانوں کی تنظیم اور قومی حقوق کے لیے ان کی کش مکش کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ فرقہ وارانہ کشیدگی میں اور زیادہ اضافہ ہو اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندستان میں جہاں تقسیم کے بعد مسلمانوں کی حیثیت ایک قابل رحم اقلیت کی ہوگئی ہے۔ یہ کشیدگی ان کے لیے مستقل نقصانات و خطرات کا موجب ہوگی نہ کہ کسی خیر و فلاح کی۔

اور ایک اس سے بھی اہم بات اور ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے بھی عرض کر دوں کہ قومی تنظیم کے مسئلہ پر غور کرتے وقت کبھی آپ نے اس سوال پر بھی غور کیا ہے کہ دنیا میں آپ کی

صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا محض یہ کہ آپ بھی دنیا کی اور قوموں کی طرح کی ایک قوم ہیں اس لیے انھی کی طرح بالکل قومی بنیادوں پر آپ کو اپنی تنظیم کی فکر کرنی چاہیے یا یہ ہے کہ آپ ایک اصولی جماعت ہیں جو دنیا میں خدا کا آخری پیغام اپنے قول و عمل کے ذریعہ پیش کرنے کے لیے مبعوث کی گئی ہے؟ اگر فی الواقع آپ کا خیال یہی ہے کہ آپ قوم ہیں تو ضرور اپنی تنظیم انھی اصولوں پر کیجیے جو اور قوموں کے سامنے ہیں اور اس راہ کی کسی شکل یا خطرہ کی کوئی پرواہ نہ کیجیے لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ آپ اپنے کو قوم کی بہ جائے حزب اللہ سمجھتے ہیں تو ضروری طور پر آپ کو اپنا زاویۂ نظر اور طریقِ کار سب کچھ بدلنا پڑے گا اور اس تبدیلی کے بعد قومی تنظیم کے بارے میں آپ کا موجودہ نقطۂ نظر خود بہ خود بدل جائے گا۔

سیاسی پارٹیوں میں شرکت

مسلمانوں میں سوچنے اور کام کرنے والوں کا ایک دوسرا طبقہ وہ ہے جو قومی تنظیم کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر کا تو حامی ہے، وہ اس کو ناممکن بھی سمجھتا ہے اور مسلمانوں کے لیے تباہ کن بھی، لیکن اسی کے ساتھ وہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ مسلمانوں کو اپنے حقوق کے لیے اور خاص طور سے انتخابات سے فائدہ اٹھانے کے لیے ملک کی کسی نہ کسی پارٹی میں ضرور شریک ہو جانا چاہیے چناں چہ انھوں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق ان جماعتوں میں سے کسی نہ کسی کو اپنے لیے منتخب بھی کر لیا ہے اور اب ان کی کوششیں انھی کی تائید و حمایت کے لیے وقف ہیں۔ ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ جب ہم ملکی سیاست سے الگ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتے اور نہ ہندستان کے موجودہ حالات کے تحت اپنی کوئی جداگانہ تنظیم قائم کر سکتے ہیں تو اس کے سوا ہمارے لیے چارۂ کار ہی کیا ہے کہ ہم جس پارٹی کی شرکت کو اپنے لیے زیادہ مفید خیال کریں اس میں شریک ہو جائیں۔ اس طرزِ فکر کے حامیوں میں ایک طبقہ تو اُن مسلمانوں کا ہے جس کا رشتہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یا تو پہلے ہی سے بہت کم زور ہو چکا تھا اور وہ محض ظاہر داری کے طور پر، یا جرأت کی کمی کی وجہ سے، اسلام اور مسلمانوں سے اپنے تعلق کو نباہ رہا تھا یا تقسیم کے بعد یہاں کے حالات نے اس کو ذہنی شکست خوردگی میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے بالکل مایوس ہو چکا ہے اس لیے وہ بغیر کسی ذہنی خلش کے ان پارٹیوں میں سے کسی پارٹی کا حامی و ہم نوا

بن گیا ہے اور ذاتی طور سے وہ اس کو مفید سمجھتے ہوئے اس پر مطمئن ہے۔ رہا اسلام یا مسلمانوں کا فائدہ تو گو اس کو اس سے کچھ مطلب وسروکار نہیں ہے لیکن ان کے ساتھ اپنے ظاہری تعلق کو نباہنے کے لیے وہ کبھی کبھی اس پہلو سے بھی اس شرکت کے فوائد پر وعظ کہہ دیا کرتا ہے۔

اس طرح کے لوگ ظاہر ہے اس وقت ہمارے مخاطب نہیں ہیں، جن کو فی الواقع نہ اسلام کے فائدہ ونقصان سے کوئی بحث ہو اور نہ مسلمانوں کے فائدہ ونقصان سے۔ ان کے سامنے زیادہ تر اپنی ذاتی عزت وسربلندی ہو اور بس، ایسے لوگ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ہندستان میں اسلام یا مسلمانوں کو کیا مشکلات درپیش ہیں اور ان کے حل کی صحیح تدبیر کیا ہوسکتی ہے، اس لیے اس موقع پر ایسے لوگوں سے تعرض کرنا ایک بالکل غیر ضروری بات ہے۔

لیکن یہ قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایسے ہی لوگوں کے زمرہ میں ہمیں ایسی ہستیاں بھی نظر آتی ہیں جن کے سروں پر علم وفضل کی دستاریں بندھی ہوئی ہیں اور ان کی زبانیں قال اللہ وقال الرسول کی نغمہ سنج ہیں اور فی الواقع ان کو اسلام اور مسلمانوں سے نہایت گہرا تعلق بھی ہے، ایسی محترم ہستیاں، جن کا احترام ہمارے دل کے رگ وریشہ میں سمایا ہوا ہے جب کوئی ایسی روش اختیار کریں جو ہمارے نقطۂ نظر سے صحیح نہ ہو تو ان پر تنقید کرنا ظاہر ہے ہمارے لیے کتنا مشکل کام ہوگا لیکن ہم سمجھتے ہیں یہ ہماری سخت دینی مداہنت ہوگی اگر ہم ان ہستیوں کے احترام کی وجہ سے ان کے اس رویہ کے بارے میں جسے ہم پوری دیانت کے ساتھ غلط سمجھتے ہیں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار نہ کریں اس لیے ان کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے ہم چند جملے ان کی اس روش کے بارے میں بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک ان حضرات کا یہ رویہ خواہ کتنے ہی خلوص ودیانت پر کیوں نہ مبنی ہو، دینی اور دنیاوی دونوں حیثیتوں سے غلط اور مسلمانوں کے لیے انتہائی مہلک ہے۔

جہاں تک اس مسئلہ کے دینی پہلو کا تعلق ہے اس وقت اس پر کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے اور نہ اہل علم کے تخاطب میں اس کی کوئی خاص ضرورت ہی ہے وہ خود بادنیٰ توجہ اس کو معلوم کر لے سکتے ہیں بہ شرطے کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان حضرات نے آج سے بہت پہلے، آج سے بالکل مختلف حالات میں، اپنے لیے جو راستہ پسند کیا تھا اس پر

اب تک آنکھیں بند کئے ہوئے چلے جارہے ہیں اور اس پر دوبارہ نظر ثانی کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھتے یا اگر گستاخی نہ ہوتو ہم یہ بھی عرض کردیں کہ اگر ان میں سے کچھ لوگوں کو اس پر کبھی کوئی بے اطمینانی محسوس بھی ہوتی ہے تو اپنی قدیم راہ کا طبعی انس ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے یا ضعف ہمت قدم روک کر کھڑا ہوجاتا ہے اور حقیقتاً یہ ذرا مشکل بات بھی ہے آدمی زندگی بھر جو کام اس اعلان کے ساتھ ساتھ کرتا رہا ہو کہ کرنے کا حقیقی کام یہی ہے وہ بڑی آسانی کے ساتھ اسے ترک کرکے اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرسکتا اور نہ نئے راستے کے اختیار کرنے کی جو دشواریاں ہیں ان کے مقابلے کی وہ ہمت کرسکتا ہے بہ ہر حال ہمیں اس سے کچھ زیادہ سروکار نہیں ہے کہ ان حضرات کے اپنی روشِ قدیم پر بہ دستور قائم رہنے کے حقیقی اسباب کیا ہیں اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے البتہ اصولی طور سے ہم اپنے علم کے مطابق یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ روش نہ دین کی حقیقی مصلحتوں اور تقاضوں کے مطابق ہے اور نہ ان کے رتبہ اور ذمہ داریوں کے شایان شان ہے اور یہ بات کسی لمبی چوڑی گفتگو کی بہ جائے صرف اس مختصر بات سے واضح ہوسکتی ہے کہ ہم اور آپ سبھی جانتے ہیں کہ اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو چند عقائد و رسوم تک محدود ہو بلکہ وہ ایک مستقل نظامِ حیات ہے جس کے دائرے میں تمام انسانی امور و معاملات داخل ہیں اور ہر وہ شخص جو اسلام کا نام لیوا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ پوری طرح اس نظامِ حیات اور طریقِ زندگی کو عملاً اپنانے اور اس کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ اس لیے ایک مسلمان کی حیثیت نہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے کو کوئی قوم سمجھ کر دنیا کی اور قوموں کی طرح قومی بنیادوں پر اپنے معاملات کو سلجھانے کی کوشش کرے اور نہ یہ ہے کہ وہ چند رسوم و عادات ادا کرکے اپنے دوسرے معاملاتِ زندگی کو اپنے طور سے یا کسی رائج الوقت نظریۂ حیات کے تحت چلانے کے لیے اپنے کو آزاد سمجھ لے۔

اس بنیادی بات کو سامنے رکھتے ہوئے آپ خود غور کریں کہ آپ کے مسلم ہونے کی یہ حیثیت آپ سے کیا تقاضا کرتی ہے اور یہ روش اس حیثیت کے کہاں تک مطابق ہے کہ آپ دین کے چند احکام پر عمل کرکے اپنی جگہ مطمئن ہوجائیں کہ آپ اسلام کا حق ادا کررہے ہیں اور اپنے بقیہ امور و معاملات کو نظر انداز کرکے ان پارٹیوں میں شریک ہوجائیں جن کا نظریۂ حیات آپ کے نظریۂ حیات سے قطعاً مختلف ہے بلکہ اس کی کامل نفی پر مبنی ہے۔

ملک کی موجودہ پارٹیاں

اس وقت موقع نہیں ہے کہ ہم ملک کی موجودہ پارٹیوں کے اصول و مقاصد پر کوئی مفصل تبصرہ کریں لیکن چند جملے ہم ان میں سے ہر ایک کے بارے میں لکھنا چاہتے ہیں تاکہ آپ ان سے اندازہ کرسکیں کہ ان کی شرکت کہاں تک ایک مسلم کی صحیح حیثیت کے مطابق ہوسکتی ہے۔

سوشلسٹ پارٹی آج ہمارے بہت سے علماء کا بھی مرکز امید ہے، لیکن کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ سوشلزم اپنی بنیاد اور اصول میں اسلام سے قدم قدم پر متصادم ہے۔ اسلام اس کائنات کے لیے ایک خالق کو مان کر اور اس کو انسان کا حقیقی مالک تسلیم کرکے آگے قدم بڑھاتا ہے اور سوشلزم اس دنیا کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتا اور انسان کو اس میں حقیقی فرماں روا کا درجہ عطا کرتا ہے۔ ایک کا مقتدا محمد العربی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور دوسرا لینن اور اسٹالن کا پجاری ہے۔ ایک کے لیے صحیفۂ ہدایت قرآن ہے اور دوسرا ''کیپٹل'' سے ہدایت و روشنی حاصل کرتا ہے۔ ایک کا قبلہ کعبہ ہے اور دوسرا اپنا سرِ عجز و نیاز ماسکو کی طرف جھکاتا ہے۔

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بہ کجا

اور اسی پر کمیونسٹ پارٹی کو بھی قیاس کرلیجیے جو ان مخصوص معاملات میں اس سے بھی چند قدم آگے ہے۔

جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

یہی معاملہ کانگریس کا بھی ہے۔ اس کے لادینی جمہوریت کے اعلان کی وجہ سے بہت سے مسلمان اسے دیگر جماعتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ بہتر اور اپنے دین و مذہب کے لیے بالکل بے ضرر سمجھتے ہیں لیکن ان کا ایسا سمجھنا سادہ لوحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اول تو یہ لادینیت کا تصور خود کانگریس کے دائرۂ عمل میں کاغذی اعلان سے زیادہ کوئی قیمت نہیں رکھتا جیسا کہ اس کے اس وقت تک کے کارنامے شاہد ہیں اور دوسرے لادینیت خود ایک دین ہے جس کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان خدائی دین سے بے نیاز ہوکر جمہور کی خدائی کے آگے جھک جائے۔

قابلِ ذکر جماعتوں میں ایک بڑی جماعت ہندو مہاسبھا بھی ہے جس نے انتخاب کے

موقع پر نہایت فیاضی کے ساتھ اپنا دروازہ مسلمانوں کے لیے بھی کھول دیا ہے لیکن اس کے ضمن میں ہم کسی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہندومہاسبھا کے عزائم اور عملی سرگرمیوں سے ہر مسلمان آگاہ ہے اس لیے اس کے بارے میں بآسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں شرکت کے کیا معنی ہوسکتے ہیں۔ خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی۔ ہندومہاسبھا کے نیتوں کا اندازہ صرف اتنی بات سے بہ آسانی کیا جاسکتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو پارلیمنٹری سرگرمیوں میں تو شرکت کی آزادی عطا فرمائی ہے لیکن اس کے ماسوا وہ کسی اور دائرہ میں ان کے قدم کو آنے دینا نہیں چاہتی گویا ہندومہاسبھا مسلمانوں سے اس بات کی تو ضرور خواہش مند ہے کہ وہ آئندہ الیکشن میں اسے کام یاب ہونے میں مدد دیں لیکن وہ ان مقاصد وعزائم میں کسی طرح کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہے جو مسلمانوں کو پامال کرنے کے لیے اس نے پہلے سے تیار کیے ہیں بہ الفاظ دیگر اس کی خواہش یہ ہے کہ الیکشن کا لالچ دے کر مسلمانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا جائے تاکہ انھی کے حربوں سے ان کا صفایا کیا جاسکے، کیا ستم ظریفی کی اس سے بھی نادر کوئی مثال ہوسکتی ہے؟

ہمیں یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہے کہ ہندومہاسبھا جو نعرے لگاتی ہے ان میں سے بہت سے نعرے ایسے بھی ہیں جن کی واقعی ہمیں قدر کرنی چاہیے مثلاً وہ سیکولرزم کی مخالف ہے اور اس کی بہ جائے وہ سیاست میں مذہب واخلاق کے اقدار شامل کرنے کی حامی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ یہ نعرے، جہاں تک عام اندازہ ہے، محض سیاسی چال کے طور پر عوام کو دھوکا دینے اور ان کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھانے کے لیے لگا رہی ہے اور واقعی اس کے دل میں ان اقدار کی کوئی قدروقعت نہیں ہے یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ وہ مذہب کے حقیقی تصور ہی سے اب تک ناآشنا ہے۔ ہمارے نزدیک دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہوسکتا جس میں اس جارحانہ قوم پرستی کی گنجائش نکل سکے جس میں ہندومہاسبھا مبتلا ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ایک طرف وہ مذہب واخلاق کے بلند بانگ دعوے بھی کرتی ہے اور دوسری طرف اس پر قوم پرستی کی یہ لعنت بھی مسلط ہے۔

ان مذکورہ بالا جماعتوں کے بعد کوئی اور بڑی جماعت ایسی باقی نہیں رہ جاتی جس کی طرف مسلمان امید کی نگاہ اٹھاسکیں، رہیں نئی جماعتیں جو اس وقت انتخاب کے قرب کی وجہ سے برساتی کیڑوں کی طرح ہر روز پیدا ہو رہی ہیں تو ان کے متعلق ہم کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ ان جماعتوں کے بانی اوران میں شریک ہونے والوں میں بہت سے لوگ بہت مخلص ہوں لیکن ان جماعتوں کے بارے میں یہ بات ضروری طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ یہ لوگ مذکورہ صدر جماعتوں ہی کے نظامِ شمسی کے ٹوٹے ہوئے تارے ہیں اس لیے یہ جماعتیں اپنے بنیادی خیالات وتصورات کے لحاظ سے اُن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوسکتیں اور اس لیے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ان کی حیثیت بھی وہی ہوسکتی ہے جو مذکورہ جماعتوں کی ہے۔

ان باتوں کے پیشِ نظر غور کرنا چاہیے کہ دینِ اسلام کے پیروجن کی حیثیت خود ایک نظام کے داعی کی ہے، کیا ان کو یہی بات زیب دے سکتی ہے کہ وہ اپنے دین کی پیروی اوراس کی دعوت کا کام چھوڑ کر کسی دوسرے دین کے داعی و مبلّغ بن جائیں؟ اگر وہ اپنے ضعفِ ہمت یا حالات کی واقعی ناسازگاریوں کی بنا پر اپنے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد سے اپنے کو عاجز و درماندہ پاتے ہیں، تو وہ شوق سے اپنے گھروں میں بیٹھ رہیں لیکن کیا اس کے لیے بھی وہ کوئی عذر پیش کرسکتے ہیں کہ دینِ حق کی بہ جائے وہ اس کے مخالف کسی دین کی گاڑی کے قلی بن جائیں اور اس کو کھینچنے میں اپنی محنت ومشقت صرف کریں؟ ہمارے نزدیک تو ایسا کرنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ مسلمان کچھ نہ کریں اور خاموش اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں۔ ہرچند یہ رویہ بھی جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے؟ گوناگوں وجوہ سے مسلمانوں کے لیے انتہائی تباہ کن اور غلط ہے لیکن اس سے کم ازکم یہ فائدہ تو ضرور ہوگا کہ وہ بہ راہِ راست کسی غیراسلامی حرکت وفعل کے ملزم نہیں بنیں گے، یہ بھی ایمان ہی کی ایک راہ ہے۔ گوادنیٰ اور ضعف ایمان کی کہ آدمی حق کے لیے کام نہ کر سکے تو کم ازکم باطل کا ساتھ نہ دے تو کیا مسلمانوں میں اب اس دنیٰ ضعف ایمان کو برقرار رکھنے کی بھی سکت نہیں ہے؟

ملک کی موجودہ پارٹیوں میں شرکت کا یہ دینی نقصان ہے جس کی طرف سرسری طور سے اشارہ کیا گیا ہے لیکن اگر آپ دنیاوی فائدہ ونقصان کے پہلو سے غور کریں گے تو اس پہلو سے بھی اس میں آپ کو اس کے سوا اور کوئی فائدہ نظر نہیں آئے گا کہ آپ کے کچھ لوگ اسمبلیوں میں پہنچ جائیں یا وزارتوں کی گدّی سنبھال لیں، لیکن یہ فائدے افراد کے لیے ہوں گے، امت مسلمہ کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ یہ بات اس تفصیل سے بھی واضح ہوسکتی ہے جو ہم نے اوپر قومی

تنظیم اور الیکشن کے ضمن میں پیش کی ہے اور اس وقت کے حالات بھی اس کا بین ثبوت ہیں اور اس پر مزید بحث انشاء اللہ آگے آئے گی۔

بہ ہر حال اس وقت مسلمانوں کے سوچنے اور کام کرنے کے یہی دو نقشے ہیں جن کے سلسلے میں ہم نے اپنا نقطۂ نظر کسی قدر تفصیل کے ساتھ عرض کر دیا ہے۔آپ بھی اس پر غور فرمائیں اور فیصلہ کریں کہ کیا واقعی ہندستان میں مسلمانوں کے لیے بس یہی دو راہیں کھلی ہوئی ہیں جو دونوں کی دونوں ہلاکت و بربادی کی راہیں ہیں یا ان کے علاوہ ان کے لیے کوئی اور راستہ بھی ہوسکتا ہے جس کو اختیار کرکے وہ دین و دنیا دونوں کے نقصانات سے بچ سکیں اور ساتھ ہی وہ اس ملک کی بھی خدمت بجالاسکیں جس میں وہ رہتے اور جس میں رہنے کی وجہ سے ان پر اس کی خدمت کی بھی بہت بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

مسلمان کیا کریں؟

پچھلی بحث کے آخر میں جو سوال درج کیا گیا ہے اس کا جواب بہ ظاہر بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کیوں کہ بہ حالات موجودہ مسلمانوں کا عام خیال یہی ہے کہ ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ یا تو سب کچھ چھوڑ کر خاموش بیٹھ رہیں اور انقلابات زمانہ کا تماشا دیکھیں یا اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اپنی جداگانہ تنظیم قائم کریں یا موجودہ پارٹیوں ہی میں سے کسی پارٹی کا ساتھ دیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا سمجھنا محض کوتاہ اندیشی ہے۔ان دونوں راستوں کے علاوہ ایک راستہ اور بھی ہے اور وہی مسلمانوں کے لیے حقیقی نجات وسعادت کا راستہ ہے اور وہ اس وقت ان کو نظر نہیں آرہا ہے، تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے حالات ہی ایک عرصہ سے ایسے رہے ہیں کہ ان میں ان دونوں راستوں کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نظر ہی نہ آسکے خواہ وہ اپنی جگہ کتنا ہی واضح اور روشن کیوں نہ ہو۔

آیئے آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس کوتاہ نظری کے اسباب کا بھی کچھ جائزہ لے لیں کیوں کہ اس کے بغیر ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اسلام کی حقیقت اور مسلمانوں کا عمومی حال

اسلام دنیا کا وہ مذہب ہے جو اپنے ماننے والوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے کو بالکل خدا کے حوالہ کردیں بلکہ لفظ اسلام کے لغوی معنی بھی کامل حوالگی ہی کے ہیں اور یہی اس کا شرعی مدلول بھی ہے۔

پھر اسلام وہ مذہب ہے جس نے وضو اور طہارت سے لے کر سیاست و حکومت اور بین الاقوامی معاملات و تعلقات تک غرض جملہ امور و معاملات زندگی کے بارے میں نہایت واضح ہدایات دی ہیں اور یہ اس کے آخری مذہب ہونے کا ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ چناں چہ فرمایا گیا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المآئدہ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل کر دی، تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بہ طور ایک دین کے پسند کر لیا۔''

اور یہ ہدایات دے کر وہ اپنے سامنے والوں کو اس بات کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس مجموعۂ ہدایات سے کچھ چیزیں از قسم عبادات وغیرہ الگ کر لیں اور ان کو ادا کر لینے کے بعد اپنی جگہ مطمئن ہو جائیں کہ انھوں نے اس کے ماننے کا حق ادا کر دیا بلکہ وہ اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی جملہ ہدایات کو نہ صرف خود پوری طرح اپنانے کی کوشش کریں بلکہ ان کو دوسروں تک پہنچانے کی بھی پوری سعی کریں کہ اس کے بغیر مومن ہونے کا تقاضا پورا نہیں ہوسکتا۔

لیکن یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہندستان میں مسلمان اسلام کی اس حقیقت کو زبانی طور سے تو ایک حد تک تسلیم کرتے رہے لیکن عملاً اس کو قائم کرنے کی انھوں نے کچھ زیادہ پروا نہیں کی۔ مجموعۂ دین کے کچھ اجزاء جن کو انھوں نے نسبتاً آسان یا مفید پایا ان کو تو انھوں نے مضبوطی سے پکڑے رکھا لیکن دوسرے اجزاء کو جو دین میں کافی اہمیت رکھتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ کچھ ایثار و قربانی اور مشقت کے بھی طالب ہیں ان کو وہ یکے بعد دیگرے چھوڑتے چلے گئے۔

مسلمان اس ملک میں زیادہ تر فاتح کی حیثیت سے آئے تھے اور جب تک ان کی حکومت قائم رہی، حکم رانی کے افکار و مشاغل ہی ان کی توجہات کا بڑا مرکز بنے رہے اور ان کے انہماک نے انھیں اس بات کا بہت کم موقع دیا کہ وہ اسلام کو بہ حیثیت ایک نظامِ زندگی خود اپنائیں اور دوسروں تک اس پیغام کو ٹھیک ٹھیک پہنچا دیں۔ تاریخ کے پچھلے ادوار میں بلاشبہ ہمیں ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جنھوں نے دین کی صحیح حیثیت کو خود اپنانے کی کوشش کی اور اس کو عملاً قائم کرنے کے لیے بھی انھوں نے جدوجہد کی لیکن جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے

بارے میں یہ کہنا بلا مبالغہ صحیح ہوگا کہ یہ چیز عمومی طور سے ان کے پیش نظر نہیں رہی ہے۔

اس غفلت وکوتاہی کا جہاں یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ مسلمانوں کی وہ اجتماعی قوت جو دین کی پیدا کردہ تھی وہ رفتہ رفتہ مضمحل ہوتی گئی۔ کیوں کہ دین کو جزئی طور سے اپنانے سے وہ مسلمان تو باقی رہ سکتے تھے لیکن ان میں وہ باتیں پیدا نہیں ہوسکتی تھیں جو کل دین کو بہ حیثیت نظامِ زندگی اختیار کرنے سے پیدا ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے وہ طرح طرح کی کم زوریوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے جو بالآخر انقلابِ حکومت کا باعث بنا اور دوسری طرف اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود دین کا تصور رفتہ رفتہ محدود سے محدود تر ہوتا چلا گیا۔ پھر چوں کہ دین کے تمام اجزاء باہم مربوط ہیں اور وہ اسی وقت تک اپنی اصل شکل میں زندہ قائم رہ سکتے ہیں جب تک کہ ان کا باہمی ارتباط قائم رہے اس لیے اس محدودیت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جن باتوں کو باقی و برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تھی وہ باتیں بھی اگر باقی رہیں تو اپنی بہت کچھ معنویت کھو کر۔

انقلابِ حکومت کے بعد

دین کو بہ حیثیت نظامِ زندگی اختیار نہ کرنے کے یہ دو زبردست نقصانات تھے جو مسلمانوں کو پیش آئے ـــــ اجتماعی اوصاف وخصوصیات سے محرومی اور دین کے تصور کا محدود ہوتا چلا جانا ـــــ چاہیے تو یہ تھا کہ جب یہ باتیں کھل کر سامنے آرہی تھیں تو ان کے تدارک کی بروقت کوشش کی جاتی لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کی قسمت میں ادبار لکھا جا چکا تھا۔ اس لیے یا تو اس کے لیے کوئی مؤثر کوشش عمل میں نہیں لائی گئی یا لائی گئی تو اس کو کوئی خاص کام یابی حاصل نہیں ہوئی اس وقت مسلمانوں میں اگر دینی حس بے دار رہا ہوتا تو انقلابِ حکومت کا واقعہ ان کے لیے تازیانۂ عبرت کا کام دے سکتا تھا اور حقیقتاً عالم کے انقلابات اسی لیے ہوا کرتے ہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٤١﴾ (الروم:۴۱)

”انسانوں کی اپنی کرتوتوں کی بدولت خشکی وتری میں فساد پھیل گیا تاکہ اللہ ان کے بعض اعمال کا نتیجہ انھیں چکھادے شاید وہ (اپنی روش سے) باز آجائیں۔“

لیکن چوں کہ دین کے ساتھ مسلمانوں کا رشتہ پہلے ہی بہت کچھ مضمحل ہو چکا تھا اور عبرت اور اثر پذیری کے لیے تعلق باللہ کی جو کیفیتیں مطلوب ہیں ان سے مسلمانوں کا دل پہلے ہی بہت کچھ خالی ہو چکا تھا اس لیے اس انقلاب عظیم کا بھی ان پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ تھوڑے دنوں تک ان پر کچھ حیرانی وسراسیمگی کی کیفیت تو ضرور طاری رہی کیوں کہ یہ جو کچھ پیش آیا وہ عام لوگوں کے لیے ایک بالکل غیر متوقع صورتِ حال تھی اور ان میں جو نرم دل تھے انھوں نے اس پر حسرت واندوہ کے آنسو بھی بہائے لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد یہ کیفیت جاتی رہی اور پھر سب کچھ بھلا کر عام طور سے مسلمان اسی راستے پر چل پڑے جس کو محکوم قومیں ہمیشہ سے اختیار کرتی چلی آ رہی ہیں یعنی غالب قوم کی پیروی۔ اس چیز نے دین کے ساتھ ان کے لگاؤ کو اور زیادہ مضمحل و کم زور کر دیا۔ انگریز توپ وتفنگ ہی کے ساتھ نہیں آئے تھے بلکہ وہ اپنے ساتھ جسموں سے زیادہ قلوب واذہان کو مسخر کرنے والی چیز ایک چمکتی ہوئی تہذیب بھی لے کر آئے تھے جو دیکھنے میں تو بڑی ہی خوش نما اور جاذبِ نظر تھی لیکن وہ اپنی روح ومزاج کے اعتبار سے اسلام اور اسلامی تہذیب کے لیے سمِ قاتل تھی کیوں کہ اس کی بنیاد، خدا کے انکار یا اس سے بے نیازی پر قائم تھی اور اگر اس میں مذہب کے لیے کوئی گنجائش تھی تو محض اس حد تک کہ وہ انسان کی پرائیویٹ زندگی کا ایک حقیر گوشہ ہے جس کو باقی رکھنا بھی چنداں ضروری نہیں ہے۔ یہ تہذیب چوں کہ حکم راں قوم کی تہذیب تھی اور مسلمان اپنی ملّی خصوصیات سے پہلے ہی خالی ہو چکے تھے اس لیے ان کی اکثریت نے لپک کر اس کا خیر مقدم کیا اور اس بارے میں علماء اور خاص طور سے بانیانِ دار العلوم دیوبند کی مخالفتوں کی بھی اُنھوں نے کوئی پروا نہیں کی اور پروا کر بھی کیسے سکتے تھے جب کہ اس وقت تک صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں ان کے دل دین اور علم بردارانِ دین کے حقیقی احترام سے خالی ہو چکے تھے اور اس کے مقابلے میں دنیا ان کی نگاہوں میں مرغوب ہو چکی تھی جس کا حصول انگریزی تہذیب وتعلیم کے ساتھ نہایت حکمت عملی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی کچھ ہی دنوں بعد مسلمان اندر اور باہر دونوں حیثیتوں سے بدلنا شروع ہو گئے یہاں تک کے بہت سے لوگ تو ظاہری طور سے انگریز بن گئے اور بہت سے اپنی ظاہری حیثیت میں تو مسلمان باقی رہے لیکن ''لارڈ میکالے'' کے بہ قول ان کا ذہن ودماغ بالکل انگریزی

تہذیب وتمدن کے سانچے میں ڈھل گیا یہاں تک کہ جب ان کو اسلام یا مسلمانوں کے سلسلہ میں یہاں کی اکثریت کے طرز عمل سے خطرہ محسوس ہوا اور اس کو روکنے کے لیے انھوں نے بند لگانا چاہا تو اس کے لیے اینٹیں اور گارا انھوں نے یورپ ہی کے کارخانوں کا تیار کیا ہوا فراہم کیا۔ مسلم یونیورسٹی کا قیام اسی طرح کے مسلمانوں کے نیک ارادوں کا مظہر ہے۔ ہندستان میں پچھلے دنوں قومی بنیاد پر جو تحریک اٹھی تھی اور جو بالآخر ہندستان کی تقسیم اور قیامِ پاکستان پر منتہیٰ ہوئی وہ اسی طرزِ فکر کا بہ راہ راست نتیجہ تھی۔

یہ تو عام مسلمانوں کا حال ہوا لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ شروع شروع میں تو علماء دین نے اس تہذیب سے کافی ناک بھوں چڑھائی اور اس کو روکنے کے لیے کافی کوششیں بھی کیں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ انگریزوں کا اقتدار روز بہ روز مستحکم ہی ہوتا چلا جارہا ہے اور ان کی مخالفتوں کے باوجود مسلمانوں کا رخ اس اقتدار کی طرف ہے جس کے زیر سایہ یہ مادی تہذیب پھل پھول رہی تھی تو ان میں سے بہتوں نے تو ہوا کے رخ پر چلنا شروع کردیا اور وہ خود اس اقتدار کے دعا گو بن گئے اور اپنے لخت ہائے جگر کو اسی تہذیب کے آغوش میں پلنے کے لیے راضی خوشی حوالہ کردیا اور کچھ نے مایوس ہوکر گوشۂ تنہائی اختیار کرلیا اور کچھ اگر مخالفت پر قائم بھی رہے تو یا تو ان کی مخالفت تمام تر انگریزوں کے اخراج کی سعی پر مرکوز رہی اور ان کی لائی ہوئی تہذیب کو روکنے کے لیے جو اَب خود اپنے بل بوتے پر پھیلتی جارہی تھی کوئی ٹھوس تدبیر اختیار نہیں کی بلکہ ایک حد تک خود اس کے ساتھ سازگاری کرنے لگے یہاں تک کہ انگریزوں اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں سے بچنے کے لیے سیاسی طریقے بھی وہی اختیار کیے گئے جو اسی تہذیب کے آوردہ تھے۔ یا کچھ لوگوں نے حالات کی ناموافقت سے دل شکستہ ہوکر صرف اس بات پر اکتفا کرلیا کہ وہ مدرسوں اور خانقاہوں کے ذریعہ کسی طرح اپنے کو اور اپنے زیر اثر مسلمانوں کو اس تہذیب وتمدن اور اس کے زہریلے اثرات سے بچالے جائیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ تدبیر کسی نہ کسی درجے میں کام یاب ضرور ہوئی لیکن چوں کہ یہ مدافعانہ طور پر اختیار کی گئی تھی اور اس کے ساتھ اس تہذیب کے اصل سرچشمہ کو بند کرنے کے لیے کوئی حقیقی مؤثر تدبیر عمل میں نہیں لائی گئی تھی اس لیے، مرور ایام کے ساتھ قوت مدافعت بھی کم زور ہوتی چلی گئی یہاں

تک کہ اس تہذیب کے اثرات ان محفوظ گوشوں تک میں جا پہنچے جہاں دین ایک پناہ گزین کی حیثیت سے حفاظت کے ساتھ ٹھہرایا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود ان حلقوں میں دین کی تفریق و تجزیے کے رجحانات نشو و نما پانے لگے اور جو کارخانے اس لیے قائم کیے گئے تھے کہ وہاں سے دین کے علم بردار اور مبلّغِ اسلام تیار ہو کر نکلیں گے وہاں سے اس طرح کے لوگوں کی بہ جائے ایسے لوگ ڈھل کر نکلنے لگے جس کی جذبات پر اسلام کی بہ جائے قومیت و وطنیت کا رنگ غالب تھا اور اس طرح جن لوگوں کا طرزِ عمل دین کا صحیح نمونہ بن سکتا تھا خود ان کا نمونہ عام مسلمانوں کے لیے اس بات کی حجت بن گیا کہ دین و دنیا کی تفریق جائز ہے بل کہ بہت سے حالات میں ضروری بھی ہے۔

تقسیم سے پہلے

غرض ہندستان میں انگریزی اقتدار و تہذیب کے قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کا عام رخ اس کی خوشہ چینوں ہی کی طرف منتقل ہو گیا یہاں تک کہ جو اس کے مخالف تھے وہ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی طرف جھک پڑے، اس دور کی اس خصوصیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے جو علماء گوشہ گیر نہیں ہوئے تھے بلکہ تگ و دو کے میدان میں سرگرم کار تھے ان کا عام رجحان دین سے زیادہ سیاست کی طرف بڑھ گیا اور سیاست بھی وہ جس کو کوشش کر کے دین سے علیٰحدہ رکھا گیا تھا حتیٰ کہ اس دور میں اگر دین کی تبلیغ و اشاعت کا کوئی کام بھی کیا جارہا تھا تو اس کے پسِ پشت سب سے بڑا مقصد یا تو یہ ہوتا تھا کہ مسلمانوں کی عددی اکثریت بڑھائی جائے یا یہ کہ مسلمانوں کو باطل سیاست میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جائے۔ جس دور میں دین کے ساتھ یہ معاملہ روا رکھا جارہا تھا اس میں اس بات کی کہاں گنجائش نکل سکتی تھی کہ مسلمان اپنے دنیاوی مسائل کو خالص دین کی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کریں، چناں چہ اسی بنا پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس دور میں ہمارے مسلم زعماء کا عام طرزِ عمل یہی تھا کہ ہندستان میں انگریزوں کی حکومت و اقتدار کے قیام کے بعد مسلمانوں کے لیے جو نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے تھے ان کو وہ انہی کے فراہم کیے ہوئے نسخہ کے مطابق حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مسلمانوں میں دو الگ الگ

جماعتیں قائم تھیں جن میں سے ایک قومیت کے سہارے پر چل رہی تھی اور دوسری نے وطنیت کی تحریک کو اس توقع پر اپنایا تھا کہ جب یہ اپنے مقصد یعنی انگریزوں کے اخراج پر منتہی ہوگی تو اس سے خود بہ خود ہمارے پیچیدہ مسائل حل ہو جائیں گے لیکن اس اختلاف کے باوجود ان دونوں کا مطمح نظر قریب قریب ایک ہی تھا، یہ دونوں اس بات پر متفق تھیں کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل صرف یہی ہے کہ ملک میں جمہوری طرز کی حکومت قائم ہو۔ ایک فریق اپنے نظریہ کے مطابق اس کے لیے بلا قید و شرط مساعی تھا اور دوسرا اس شرط کے ساتھ اس پر آمادہ تھا کہ پہلے مسلمانوں کے لیے کچھ تحفظات کا بندوبست کر دیا جائے۔ چناں چہ اسی فریق کے مطالبہ و اصرار سے اس دور میں یہاں کی وطنی جماعتوں کے ساتھ ان کے کچھ سمجھوتے اور معاہدے وغیرہ بھی ہوتے رہے جن سے اس دور کے حالات سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح واقف ہیں۔ بہ ہر حال ایک طویل عرصہ تک دونوں فریق اپنے اپنے طور پر اسی کے لیے کوشاں رہے لیکن جب ۱۹۳۵ کے آئین کے نفاذ کے بعد جمہوری طرز حکومت کا تھوڑا سا تجربہ سامنے آیا تو ایک فریق نے تو اس تجربہ کی ناخوش گواری کو فوراً محسوس کر لیا اور اس نے اپنی عافیت اسی میں جانی کہ وہ اس کے مزید تجربہ پر اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ اب بھی اس نے وہ صحیح راہ عمل اختیار نہیں کی جس کا دین متقاضی تھا بلکہ اس کی بہ جائے اس نے اپنا زور قوم پرستی کے جذبات کو زیادہ سے زیادہ ابھارنے پر صرف کیا اور انہی کے تحت اس نے تقسیم ہند کی تحریک شروع کر دی جس میں تھوڑے دنوں کے بعد اسے کام یابی بھی حاصل ہوئی۔

لیکن دوسرا فریق جمہوریت کے اس ناقص تجربہ سے بد دل اور مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے بہ خیالِ خویش یہ سمجھا کہ ناقص جمہوریت کا یہ پہلا تجربہ ہے اور تجربہ بھی ایسا کہ انگریز شرارت پھیلانے کے لیے ابھی بہ دستور موجود ہے اس لیے اس کے نتائج کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں صبر سے کام لیا جائے، جب جمہوریت اپنی کامل شکل میں نافذ ہوگی تو اس وقت اس سے اس کے صحیح متوقع نتائج برآمد ہوں گے اور وہ اللہ کے فضل سے اچھے ہی ہوں گے۔ چناں چہ یہ گروہ بہ دستور اپنی راہ پر گام زن رہا بلکہ پیچھے ہٹنے والوں کی ''بزدلی'' کو چھپانے یا اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں۔

تقسیم سے پہلے مسلمانوں کی عام سرگرمیاں کچھ اسی طرح کی تھیں، وہ یا تو قومی رنگ میں رنگے ہوئے تھے یا وطنی رنگ میں۔ رہی یہ بات کہ وہ اپنے دینی فرائض کو ٹھیک طور سے محسوس کرتے اور دین ہی کے مطابق اپنے دنیاوی مسائل کو بھی حل کرنے کی کوشش کرتے تو بلاشبہ ان میں ایسے افراد بھی رہے ہیں جو اس طرزِ فکر کے حامل اور اسی کے لیے عملاً کوشاں رہے ہیں لیکن جہاں تک عام مسلمانوں کے طرزِ فکر کا تعلق ہے وہ اس دینی طرز فکر سے ہم نوائی کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ عام طور سے ان کا حال یہ تھا کہ اگر کچھ لوگوں نے اس طرزِ فکر کی دعوت بھی دینی چاہی تو ان کے لیڈروں نے اس کو بے وقت کی شہنائی سے تعبیر کیا اور اس کے لیے حالات کی ناسازگاری کو عذر بنا کر اپنے کان اس کی طرف سے بند کر لیے جس کا نتیجہ بھی بہت جلد مسلمانوں کے سامنے آ گیا۔ ان دونوں جماعتوں کی مساعی بارآور ہو گئیں پاکستان بھی قائم ہو گیا اور ہندستان کو بھی آزادی نصیب ہوئی لیکن جہاں تک مسلمانوں کی قسمت کا تعلق ہے وہ صرف ناکامی سے آشنا ہوئی۔ ہندستان میں چار کروڑ مسلمانوں کا جو حال ہے وہ کسی تفصیل وتوضیح کا محتاج نہیں ہے، رہا پاکستان کا معاملہ تو اگر کام یابی وناکامی کے دینی تصور کو سامنے نہ بھی رکھا جائے جس کے لحاظ سے تنہا پاکستان کا قیام کوئی خوش آئند بات نہیں ہو سکتی جب تک کہ واقعی وہاں اسلامی نظام حکومت قائم نہ ہو کیوں کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے اصل کام یابی یہی ہے، خالص دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی ہم قیام پاکستان کو کسی طرح بھی کام یابی کا ہم معنی قرار نہیں دے سکتے جب کہ جن خطرات و مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا، وہ پہلے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ اب بھی پاکستان کے رہنے والوں کو جیسا کہ خود ان کے اعلانات و بیانات سے ظاہر ہے گھیرے ہوئے ہیں اور یہ تو ظاہر ہی بات ہے کہ ان کے جسم کا نصف کے قریب حصہ خود ان کے بہ قول انہی خطرات کے منہ میں ہے، اگر یہی کام یابی ہے تو پھر آخر ناکامی کس چیز کا نام ہے۔

تقسیم کے بعد

اب آیئے دیکھیے تقسیم کے بعد ہمارا کیا حال ہے۔ کیا واقعی ہم نے ان انقلابات سے جو اب تک پیش آ چکے ہیں کوئی سبق سیکھا ہے اور اس کے مطابق ہمارے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی

واقع ہوئی ہے؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ تقسیم کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کا جو طرزِ عمل ہے وہ اس طرزِ عمل سے کچھ مختلف نہیں ہے جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں نے اختیار کیا تھا بلکہ اس سے بھی کچھ بدتر ہے۔

انگریزوں کی آمد کے وقت مسلمانوں میں خواہ کتنی ہی عملی خرابیاں پیدا ہوگئی ہوں لیکن اس وقت ان کے دلوں میں دین کی محبت اور اس کی عظمت کا احساس بہت کافی حد تک باقی تھا اور قومی غیرت و خودداری بھی ان میں بہت کچھ موجود تھی اس لیے اگر وہ انگریزی تہذیب و تمدن کی طرف بڑھے بھی تھے تو بہت کچھ جھجھکتے ہوئے اور ساتھ ہی وہ چلتے چلتے بار بار مڑ مڑ کر اپنی ان دینی اور قومی روایات اور یادگاروں پر بھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ حسرت کے ساتھ ڈال لیا کرتے تھے جن کو وہ پیچھے چھوڑے جا رہے تھے اسی لیے ان کی قدم کی رفتار خود بہ خود دھیمی پڑ جایا کرتی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان میں جو لوگ زمانہ سازی میں بہت پیش پیش تھے ان کو بھی علانیہ اس کی جرأت نہیں ہوا کرتی تھی اور وہ دنیاداری کرنے کے لیے بھی اس بات پر مجبور تھے کہ پہلے اس پر دین داری کا خول چڑھائیں اور اس کے بعد اسے اختیار کریں۔

لیکن اب صورت حال اس سے بھی مختلف ہے۔ انگریزوں کے طویل دورِ غلامی میں قومی خصوصیات بہت کچھ مٹ گئیں یا مضمحل ہوگئیں اور اسی طرح دینی غیرت و حمیت کو بھی اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں پیہم صدمات پہنچتے رہے اس لیے وہ بھی بے روح اور بے جان ہو کر رہ گئی نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمان بے روک ٹوک پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ زمانہ سازی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ خود ہماری غلطیوں کی وجہ سے حالات بھی بہت مجبور کن ہو گئے ہیں جن میں واقعی زمانہ سازی سے اپنے کو محفوظ رکھنا بڑا ہی مشکل اور دشوار کام ہے۔

تقسیم سے چند لمحے پہلے تک مسلمان پھولے نہیں سماتے تھے کہ اللہ نے ان کو کام یابی سے ہم کنار کیا۔ جو لوگ آزادی کے دل دادہ تھے وہ اس بات پر خوش تھے کہ انگریز اپنی نحوستوں کے ساتھ اس ملک سے رخصت ہو رہا ہے جو ان کے بہ قول مسلمانوں کی ہر طرح کی خرابیوں کا تنہا ذمے دار تھا اور جو لوگ اپنے ہر دکھ کا علاج محض یہ سمجھتے تھے کہ ان کو کوئی قومی وطن نصیب ہو، وہ اس

بات پر مسرور ہو رہے تھے کہ کچھ زیادہ محنت و مشقت کے بغیر محض فضلِ رب سے انھیں ایک جنتِ ارضی حاصل ہوگئی ہے جہاں پہنچ کر وہ جیتے جی لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مزا لوٹیں گے یا اگر بخت کی نارسائی کی وجہ سے وہاں نہیں پہنچ سکیں گے تو کم از کم اس کی عطر بیز اور روح پرور ہوائیں ہی ان کے غم کدوں میں ان کی فرحت و مسرت کا سامان بہم پہونچاتی رہیں گی۔ اس وقت ان میں سے کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان کی یہ مسرتیں کتنی عارضی ہیں اور مستقبل کے پردے میں ان کے لیے کتنی بھیانک الم ناکیاں چھپی ہوئی ہیں لیکن عین اس وقت جب فضا فرحت و مسرت کے قہقہوں سے گونج رہی تھی بلکہ مسرت پوری طرح اپنے شباب پر بھی نہیں پہنچنے پائی تھی کہ فضا آہ و بکا کے شور سے معمور ہوگئی اور اب جو مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو یہ ان کی ہی آہ و بکا کا شور تھا جو ہر چہار طرف سے برپا ہو رہا تھا۔ یہ رنگ میں بھنگ کا پہلا تجربہ تھا جو ان کو پیش آیا اور جس نے ان کو پریشانی اور حیرانی کے ایک وسیع سمندر میں غوطہ لگاتے ہوئے چھوڑ دیا۔ لیکن یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوگیا، یہ جو کچھ پیش آیا بہ ہر حال وہ جنون کی عارضی حالت تھی جو ہندو پاکستان دونوں پر بیک وقت طاری ہوئی تھی اور دونوں جگہ اس نے کم و بیش ایک ہی طرح کا اثر دکھلایا تھا لیکن اس حالتِ جنون کے فرو ہونے پر بھی جو حالات ان کے سامنے آئے گو وہ واقعات کا قدرتی نتیجے تھے لیکن عام مسلمانوں کے لیے جو اَب تک خوش گمانیوں میں مبتلا تھے، بالکل غیر متوقع اور ساتھ ہی حد درجہ قلق افزا اور مایوس کن تھے۔ جو لوگ پاکستان کے داعی اور علم بردار تھے انھوں نے اپنے جوش و خروش کے زمانہ میں کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی کہ پاکستان کس کے لیے ہوگا اور ہندستان میں رہ کر اس کے قیام سے انھیں کیا فائدہ پہنچے گا لیکن اب جب ان کی آنکھیں کھلیں تو انھوں نے دیکھا کہ پاکستان جن کو ملنا تھا مل گیا لیکن ان کی قسمت میں اُسی سرزمین میں رہنا لکھا ہے جس میں رہنے کے تصور اور اس کے منطقی تقاضوں سے وہ بالکل خالی الذہن تھے اور انہی لوگوں کے ساتھ رہنا ہے جن سے کل تک ان کی لڑائی تھی، اور جو اب ان کے حاکم ہیں اور قدرتی طور پر تقسیم اور تقسیم کرانے والوں سے خفا اور برہم ہیں۔ یہ منظر ان کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور بھیانک تھا۔ چناں چہ وہ اس کی تاب نہ لا کر یا تو بدحواسی کے ساتھ پاکستان کی طرف بھاگنے لگے یا اگر مصلحتیں اور مجبوریاں ان کی زنجیرِ پا بن گئیں تو وہ عاجزی

اور بے کسی کے ساتھ انہی لوگوں کی دہائی دینے میں مصروف ہوگئے جن سے کل تک وہ خود مصروفِ پیکار تھے۔ اِن دوراستوں کے سوا ان کو کوئی اور راستہ ہی سجھائی نہیں دیا اور واقعہ یہ ہے کہ وہ جس راستہ پر چل رہے تھے اس کا انجام اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

یہ تو اس فریق کا حال ہوا جو قیامِ پاکستان سے اپنی تمام امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے لیکن دوسرا فریق جو اَب تک سب کچھ ہندستان ہی کے لیے کرتا رہا تھا یہاں تک کہ اس نے اس کے مقابلے میں دین اور اس کے صریح تقاضوں کی بھی بسا اوقات کوئی پروا نہیں کی تھی، اس کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوا۔ ہندستان کے آزاد ہوتے ہی یہاں جنون کی جو آندھیاں چلیں وہ اس کا کوئی امتیاز نہیں کرسکیں کہ ان کی لپیٹ میں کون آرہا ہے۔ مسلمان خواہ وہ لیگی رہے ہوں یا قوم ور سب کو کم وبیش ایک ہی انجام سے دوچار ہونا پڑا اور جب یہ طوفان اپنی حد کو پہنچ کر ختم ہوا تو اس وقت بھی اس فریق نے پایا تو یہ پایا کہ ان کے دوستوں کی نگاہیں خود ان سے بھی پھری ہوئی ہیں اور ان کی سابقہ قربانیوں یا وفاداریوں کا اگر کچھ صلہ ہے تو صرف یہ کہ ان کے شکوہ و شکایت پر نگاہیں کچھ شرم سے نیچی کرلی جائیں اور بس۔ یہ منظر اس فریق کے لیے انتہائی یاس وحزن کا موجب ثابت ہو رہا ہے اس لیے ان کے لیے بھی چارۂ کار یہی ہے کہ یا تو وہ مایوس ہو کر گھروں میں بیٹھ رہیں کیوں کہ ان میں سے کتنوں کی غیرت اسے گوارہ نہیں کرتی کہ جس پاکستان کے قیام کی انھوں نے مخالفت کی تھی وہ اسی کو اپنی جائے پناہ بنائیں یا پھر سب کچھ بھلا کر پہلے گروہ کی طرح اپنے کو جدید حالات اور ان کے تقاضوں کے لیے تیار کریں۔

مسلمانوں کی اکثریت انہی دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کا عام طرزِ عمل کچھ اسی قسم ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ ان کے حوصلے پست ہوگئے ہیں، مایوسی ان کے دلوں پر چھا گئی ہے اور اب وہ اس کے سوا اپنے لیے کوئی چارہ کار ہی نہیں پاتے کہ ہندستان میں رہنا ہے تو جس طرح بھی ہو وہ یہاں کے اکثریت کو خوش کریں چناں چہ دیکھتے دیکھتے ان کے لباس، معاشرت، نام اور طرزِ کلام وغیرہ میں تبدیلیاں واقع ہوتی جارہی ہیں اور ظاہر کے ساتھ ان کا باطن بھی تیزی کے ساتھ بدلتا جارہا ہے، بڑے بڑے سورما جو قوم پرستی پر ایمان رکھتے تھے آج ان میں اتنی بھی جرأت نہیں ہے کہ وہ قومیت کا بھی جو ایک جائز چیز ہے نام لے سکیں۔ بڑے بڑے مجاہد جنھوں

نے برطانیہ عظمیٰ کی شہنشاہیت کو چیلنج کیا تھا اب اپنے کو اس کے لیے مجبور پا رہے ہیں کہ یہاں جو کچھ بھی ہو اس پر آمنا و صدقنا کہیں اور خاموش ہو جائیں۔ ہم میں نئے نئے مفسر پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک تمام ادیان یکساں طور سے حق ہیں اس لیے یہ حماقت کا کام ہے کہ مسلمان کسی متعین دین یا اس کی امتیازی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے فکر مند ہوں، ہم میں نئے نئے مورخ پیدا ہو رہے ہیں جن کی تحقیق یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کوئی مخصوص چیز ہے ہی نہیں، ہندستان میں جو تہذیب رائج ہے یہی بعینہ اسلامی تہذیب ہے، ہم میں نئے نئے شارحِ دین پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک دین و سیاست الگ الگ چیزیں ہیں اور مسلمانوں کا کام محض اتنا ہے کہ وہ مسجدوں میں جا کر نماز ادا کر لیا کریں یا شادی و بیاہ کے کچھ مخصوص طریقے جن کو دینی کہا جاتا ہے اختیار کر لیا کریں اور اپنے بقیہ کام جس دنیاوی طریقہ سے چاہیں انجام دیں۔ اہم میں نئے نئے محقق پیدا ہو رہے ہیں جن کے نزدیک لادینی ہی اصل دین ہے اس لیے وہ یا تو لادینی جمہوریت کے داعی و مبلغ ہیں یا سوشلزم اور کمیونزم کے، غرض نئے نئے فتنے برپا ہو رہے ہیں اور مسلمان تیزی کے ساتھ ان میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ جن لوگوں پر اصلاحِ حال کی سب بڑی ذمے داری ہے وہ یا تو یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور خاموش ہیں یا پھر وہ خود اپنے طرزِ فکر و عمل سے ان فتنوں کی تقویت کا باعث بنتے جا رہے ہیں اور ان میں سے کتنوں کا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ اگر کسی گوشے سے اس صورتِ حال کے خلاف کوئی بے چینی ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے تو وہ اپنی پوری کوشش اس کے فرو کرنے میں صرف کر دیتے ہیں اور یہ سب کچھ مذہب اور مصلحت کے نام پر کیا جاتا ہے۔

حیف گر پس امروز بود فردائے

مسلمانوں کی یہ حالت کوئی مخفی چیز نہیں ہے یہ کم و بیش ہر شخص کی جس میں ہم بھی داخل ہیں، اپنی ہی داستان ہے اس لیے اس کی زیادہ تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے البتہ یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ ہماری یہ حالتِ زبوں اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اس پر غیروں کو بھی ترس آنے لگا ہے ذیل کے دو اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ مسٹر جے پرکاش نرائن نے مسلم قوم کی حالت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

''مسلم آبادی اتنی زیادہ بزدل اور بے ہمت ہوگئی ہے کہ وہ اپنے معتقدات کے مطابق عمل کرنے کی جرأت نہیں کرتی، ان کو یہ خوف ہے کہ اگر وہ اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کریں گے تو ان کی وفاداری مشکوک ہو جائے گی۔''

ماسٹر تارا سنگھ نے جیل سے رہائی کے بعد حسب ذیل الفاظ میں جیل کے مسلمان قیدیوں اور ملازموں کا حال بیان کیا تھا۔

''میں المورہ جیل میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سب مسلمان قیدی اور مسلمان سپرنٹنڈنٹ جیل میں ''رگھوپتی راگھو راجا رام'' کا گیت گاتے تھے اور ان میں کوئی بھی نماز نہیں پڑھتا تھا، میں نے ان سے سوال کیا آپ اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں لیکن ان کا حوصلہ اس قدر گر چکا تھا کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔''

اور یہ واضح رہے کہ یہ بیانات آج سے کچھ زمانہ پہلے کے ہیں جب کہ مسلمانوں کا حالِ زبوں دیکھ کر بہت سے دیکھنے والوں کو حیرت بھی ہوتی تھی اور ترس بھی آتا تھا لیکن چوں کہ اب یہ ایک روزمرہ کی بات ہوگئی ہے اور نگاہیں اس کے دیکھنے کی عادی بن چکی ہیں اس لیے اب اس طرح کے بیانات بھی شاذ و نادر ہی کہیں دیکھنے میں آسکتے ہیں البتہ مسلمانوں کی حالت کا مذکورہ نقشہ کچھ پہلے سے زیادہ وسعت و ہمہ گیری کے ساتھ ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں مسلمان شروع سے لے کر اب تک مبتلا رہے ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں تو آپ کو مسلمانوں کی موجودہ روش پر جو وہ الیکشن کے سلسلے میں اختیار کیے ہوئے ہیں مطلق حیرت نہ ہوگی۔ دنیا کی کوئی قوم بھی ہو جب وہ اپنے بنیادی معتقدات و تصورات کو ترک کر دیتی ہے تو وہ لامحالہ ذلت و خواری کا شکار ہو جاتی ہے۔ کوئی قوم اپنی خصوصیات کو چھوڑ کر زندہ نہیں رہ سکتی اور ذلت و خواری کا یہ خاصہ ہے کہ لوگ یا تو اضمحلال و پژمردگی کا شکار ہو جاتا ہے اور ان میں حالات کے مقابلہ کی ہمت و جرأت باقی نہیں رہ جاتی یا اگر وہ کچھ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تو اس طور سے کہ وہ اپنی قومی روایات و خصوصیات کے ساتھ اپنی غیرت و حمیت کو بھی بالائے طاق رکھ دیں اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی خوشامدیں کر کے اپنے زیست کا یا کچھ

زیادہ حوصلہ ہوتو اپنی انفرادی دنیاوی عزت وسربلندی کا سامان کریں یا بہت زیادہ حوصلہ سے کام لیں تو اپنی قومی تنظیم کے ذریعہ اپنی منتشر قوتوں کو حالات کے مقابلے کے لیے جمع کرنے کی فکر کریں خواہ اس کا نتیجہ اچھا ہو یا برا، چناں چہ یہی سب کچھ ہندستان میں مسلمانوں کے ضمن میں بھی رونما ہورہا ہے۔ زیادہ تر لوگ پژمردگی میں مبتلا ہوکر ہاتھ پاؤں چھوڑ چکے ہیں اور جولوگ کچھ متحرک ہیں ان کے سامنے دو ہی راہیں کھلی ہوئی ہیں یا تو وہ موجودہ پارٹیوں میں سے کسی کا ساتھ دیں اور اس بات کی مطلق پرواہ نہ کریں کہ ایسا کرنا دینی نقطۂ نظر سے یا مسلمانوں کے عمومی فائدہ ونقصان کے پہلو سے صحیح ہوگا یا غلط۔ یا پھر قومی بنیادوں پر اپنی تنظیم کی فکر کریں، رہی وہ روشن راہ جسے اختیار کر کے وہ اپنی موجودہ بدبختیوں کو دور کرسکتے ہیں اور جس کا اختیار کرنا ان کا اصلی اور حقیقی فریضہ بھی ہے تو اس کی نہ ان کو کوئی فکر ہے اور نہ ہمت۔

مسلمانوں کی بنیادی غلطی

ہمارے نزدیک جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ دین کو اپنے جملہ معاملات کا رہنما قرار دیں کیوں کہ اسلام (جس کے وہ ماننے کے مدعی ہیں) دنیا میں آیا ہی اس دعویٰ کے ساتھ ہے کہ وہ انسانی مسائل کا آخری حل ہے اور اس کے ماسوا انسان نے اپنے مسائل کے حل کے لیے جتنے طریقے بھی سوچے ہیں وہ سب فوز و کام یابی کی بہ جائے ہلاکت وخسران کا ذریعہ ہیں اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی پچھلی تاریخ بھی یہ بتلاتی ہے کہ ان کا اقبال وادبار ہمیشہ اس بات کے ساتھ بندھا ہوا رہا ہے کہ دین کے ساتھ ان کا رشتہ ترک واغماض کا رہا ہے یا محبت وشیفتگی اور عملی تعلق کا۔ لیکن بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان نہ صرف عملاً دین سے غافل ہوگئے ہیں بلکہ ان میں کثرت سے ایسے افراد پیدا ہوگئے ہیں جن کا دین کا تصور ہی بہت ناقص ومحدود ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دین محض چند مخصوص قسم کی عبادات ورسم ورواج کا نام ہے اور اس کا کوئی تعلق انسان کے عمومی مسائل سے نہیں ہے، ایسا سمجھنے والے کچھ تو جاہل عوام ہیں جن کو اول تو بتایا ہی یہ گیا ہے کہ رسم ورواج کے تحت جو کچھ وہ کرتے ہیں دین اس کے سوا ور کچھ نہیں ہے اور دوسرے وہ جن لوگوں کی طرف عقیدت کی

نظریں اٹھاتے ہیں، بدقسمتی سے ان کا عملی نمونہ بھی انھیں دین و دنیا کی تفریق ہی کا سبق پڑھاتا ہے اس لیے یہ بے چارے دین کے بارے میں یہ تصور رکھنے پر مجبور ہیں اور کچھ جدید تعلیم یافتہ ہیں جنھوں نے اپنا تمام تر وقت مغربی علوم وفنون کی تحصیل میں صرف کیا ہے اور اسلام کے بارے میں ان کی معلومات محض سنی سنائی باتوں تک محدود ہے اس لیے ان کا تصور، دین کے بارے میں اہلِ مغرب کے تصور سے کچھ مختلف نہیں ہے یعنی مذہب ان کی پرائیویٹ زندگی کا ایک شعبہ ہے حالاں کہ اسلام کی تعلیمات کو سرسری طور سے دیکھنے کے بعد یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے متعلق یہ تصور کتنا غلط ہے۔ اس وقت کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے لیکن اس تصور کی غلطی کسی لمبی چوڑی بحث کی بہ جائے صرف اتنی بات سے اچھی طرح واضح ہوسکتی ہے کہ جس کلمہ کا اقرار کر کے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے مجرد وہ کلمہ اس کی زندگی کو اجتماعی مسائل سے مربوط کر دیتا ہے بہ شرطے کہ اس نے شعور کے ساتھ اس کا اقرار کیا ہو۔ اس کلمہ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کو ماننے والا اللہ تعالیٰ کو اپنا حقیقی معبود اور فرماں روا تسلیم کرے، پس جب ایک شخص اس کلمہ کو ایک بار صدقِ دل سے تسلیم کر لے تو اس سے خود بہ خود چند اصولی باتیں متعین ہوگئیں۔ مثلاً اب اس کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا کہ وہ

(۱) اپنے کو حاکمِ مطلق سمجھے اور خدا کے احکام سے بے نیاز ہو کر حکومت و فرماں روائی کرے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو وہ اپنے عقیدہ کی علی الاعلان تردید کرتا ہے:

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ط (الفرقان: ۴۳)

”کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنالیا ہے۔“

(۲) وہ خدا کے سوا کسی فرد یا مجموعۂ افراد کے لیے خواہ وہ علماء و فضلاء ہوں یا جمہور یعنی عوام الناس، یہ حق تسلیم نہیں کرسکتا کہ وہ خدا کی کسی سند کے بغیر محض اپنی عقل کی روشنی میں یا رایوں کی کثرت کی بنیاد پر کوئی قانون بنائیں اور اسے نافذ کریں کیوں کہ اس کے معنی بھی یہی ہوسکتے ہیں کہ خدا کی جو حیثیت اس نے تسلیم کی ہے اسے وہ دوسروں کو دے رہا ہے۔ چناں چہ اسی بنا پر اہل کتاب کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ: ۳۱)

''انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور اپنے راہبوں کو رب بنالیا ہے۔''

اور اس کی تشریح حدیثوں میں یہی کی گئی ہے کہ یہ لوگ اپنے علماء وفقہاء کی باتیں بغیر کسی سندِ الٰہی کے مان لیا کرتے تھے اور یہی ان کو رب بنانا ہے جو خالص خدا پرستی کے منافی چیز ہے۔

غرض یہ مختصر کلمہ اپنے اندر بہت سی اصولی ہدایات رکھتا ہے جن کا موجودہ مسائل اجتماعی سے بہت گہرا ربط ہے اس لیے آپ خود غور کریں کہ یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اور اس کا عمومی واجتماعی مسائل وامور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ تو تفریق دین ودنیا کے بارے میں دینی نقطۂ نظر کا حال ہے اور اگر آپ عقلی طور سے غور کریں تو اس سے بھی اس تصور کی غلطی واضح ہوسکتی ہے۔ اس سے بڑھ کر مہمل بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور پرائیویٹ معاملات میں تو خدا کی ہدایت ورہنمائی کی ضرورت محسوس کریں لیکن اجتماعی زندگی کے وہ معاملات جو ان سے کہیں زیادہ وسیع، مشکل اور پیچیدہ ہیں ان میں ہم اس کی ہدایت ورہنمائی سے بے نیاز ہوجائیں یا اللہ تعالیٰ چھوٹے چھوٹے مسائل میں تو ہماری رہنمائی فرمائے لیکن اس کا جودوکرم عین مشکل میں ہمارا ساتھ چھوڑ دے؟ صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ یا تو خدا کے وجود اور اس کی ضرورت کا سرے سے انکار کردینا چاہیے، ایسا خدا کس کام کا ہوسکتا ہے جس سے ہماری اصلی ضرورت ہی پوری نہ ہوسکے اور اگر اس کی کچھ ضرورت ہے تو پھر اس کو اس حیثیت سے تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ ہر آن ہمارا خدا ہے اور ہم اپنے جملہ معاملات میں اس کی ہدایت ورہنمائی کے محتاج ہیں۔

اور یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جہاں ایک بار آپ نے خدا کو اس کے وسیع تر دائرۂ حدود سے خارج کیا آپ کے لیے کسی تنگ تر دائرہ میں بھی اس کے ساتھ رشتہ قائم کرنا کوئی آسان بات نہ ہوگی، اول تو نجی اور غیر نجی زندگی کی تقسیم ایک مفروضہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ انسان اگر کسی جنگل میں تنہا زندگی گزارنا چاہے تو ممکن ہے اس کی زندگی اس تقسیم کی پابند ہوسکے، لیکن اگر وہ انسانوں کی طرح انسانوں کے ساتھ رہتا ہے تو اس کا کوئی فعل ایسا نہیں ہوسکتا جس کا تعلق کسی دوسرے انسان سے نہ ہو یا اس سے کسی دوسرے پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو یہاں تک کہ وہ کوئی ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا جس میں کہیں نہ کہیں کوئی دوسرا انسانی وجود

اس کے فکر و خیال سے متاثر نہ ہو رہا ہو۔ پس خدا کو نجی زندگی تک محدود کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ حقیقتاً اس کو اپنی زندگی سے خارج کر رہے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی درجہ میں یہ تقسیم ممکن بھی ہو تو انسان کے جن معاملات کو پرائیویٹ یا مذہبی کہا جاتا ہے وہ اس کے دوسرے عمومی اجتماعی مسائل سے جن کو دائرۂ مذہب سے خارج کر دیا گیا ہے اس طرح پیوست اور مربوط ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے غیر متعلق کر دینا قطعاً ناممکن ہے۔ اس لیے اجتماعی معاملات کو خدائی احکام و ہدایات سے الگ کر دینے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ انسان اپنی انفرادی یا عرفِ عام کی مذہبی زندگی میں بھی زیادہ دنوں تک مذہبی باقی رہ سکے چناں چہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ تفریقِ دین و سیاست کی پالیسی جہاں جہاں بھی کارفرما ہے وہاں روز بہ روز مذہب زوال پذیر ہے اور یہ پہلو ان لوگوں کے لیے خاص طور سے قابل توجہ ہے جو لادینیت (سیکولرزم) کو رحمتِ خداوندی سمجھتے ہیں یا تفریقِ مذہب و سیاست پر اس حیثیت سے مطمئن ہیں کہ اس طرح مذہب سیاست کی دست درازیوں سے محفوظ رہ کر خوب پھل پھول لا سکے گا۔ بہ ہر حال یہ تفریقِ دین و دنیا کا تصور ایک نہایت غلط اور مہمل تصور ہے اس لیے مسلمانوں کو صاف صاف فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ کلّی طور سے احکامِ دین کی پیروی کرنا چاہتے ہیں یا نہیں یعنی وہ اپنے انفرادی معاملات کے ساتھ اپنے اجتماعی معاملات کو بھی دین کی روشنی میں حل کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر اس پر ان کا دل راضی نہیں ہے تو ان کے لیے کوئی مجبوری نہیں ہے وہ شوق سے اپنے لیے بے دینی کا جو راستہ بھی پسند کریں اختیار کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ دین کو چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں تو پھر ان کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس وقت انھوں نے اپنے عمومی مسائل اور بالخصوص الیکشن کے ضمن میں جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ کہاں تک دین کے مطابق ہے اور ان مسائل کے بارے میں دین کی صحیح رہنمائی کیا ہے اور اس کے بعد جہاں تک ممکن ہو اس کو اختیار کرنے کی فکر کرنی چاہیے اس کے بغیر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنا ایک فضول سی بات ہے جس کی توقع کم از کم ان لوگوں سے نہیں کی جاسکتی جو مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اسلام ہی پر مرنا چاہتے ہیں خواہ مخواہ دانستہ طور پر اس وقت کسی معاملہ میں غیر اسلامی روش ہی پر کیوں نہ چل رہے ہوں۔

موجودہ الیکشن اور اسلام

اس اصولی گفتگو کے بعد کہ الیکشن وغیرہ جیسے مسائل دائرۂ دین سے خارج نہیں ہوسکتے، اب مختصراً یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ فی الواقع اسلام نے ان مسائل کے بارے میں ہدایات دی ہیں، یہ ہدایات قرآن شریف کی اصولی تعلیمات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریحی اقوال اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عملی نمونوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہیں، بلاشبہ اس دور اور اُس دور کے حالات ومسائل میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہوگیا ہے لیکن اگر یہ بات سچ ہے کہ معاملات کی نوعیت ہمیشہ یکساں رہتی ہے اور فرق جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کے ظاہری مظاہر واشکال میں ہوا کرتا ہے، تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُس دور کو سامنے رکھتے ہوئے جو ہدایات دی گئی تھیں وہ اس دور میں بھی ہمارے لیے ویسی ہی کارآمد ہوسکتی ہیں جیسی کہ اس وقت تھیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ مرورِ ایام سے ہر پچھلی بات پرانی نہیں ہوجایا کرتی ہے، انسانی زندگی کے کتنے معاملات ومسائل ہیں جو آج صدیوں کے بعد بھی ویسے ہی تروتازہ ہیں جیسے اس وقت تھے اس لیے ان کے بارے میں جو بات اُس وقت صحیح ہوسکتی تھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ ازخود اس زمانہ میں غلط ہوجائے بالخصوص وہ باتیں جو وقتی حالات کے بہ جائے انسانی فطرت سے بہ راہِ راست تعلق رکھتی ہوں ان کے خواہ مخواہ بدل جانے کے کوئی معنی نہیں ہوسکتے، فطرتِ انسانی اب بھی ویسی ہی ہے جیسی اب سے ہزاروں سال پہلے رہی ہے اور اس کے متعلق احکام دینے والی ہستی وہ ہستی ہے جو فطرت کی باریکیوں سے واقف ہی نہیں بلکہ اس کا خالق بھی ہے اس لیے یہ احکام بدل نہیں سکتے ہیں۔

بہ ہر حال اگر آپ قرآن وحدیث کا مطالعہ اس غرض سے کریں گے کہ ان سے آپ اپنے موجودہ معاملات ومسائل کے بارے میں ہدایت وروشنی حاصل کریں تو آپ کو ان میں ہر طرح کی ہدایات نمایاں نظر آئیں گی۔ اگر ایسا نہ ہوتو اسلام کے بارے میں یہ دعویٰ ہی سرے سے غلط ہوجائے گا کہ وہ خدا کا آخری ضابطۂ حیات ہے جو ہر زمانہ میں ہر طرح کی ضروریات کے لیے کافی ہوسکتا ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک طرف عرصہ دراز سے ان ہدایات کا کوئی عملی ظہور یا نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے نہیں ہے جس کو دیکھ کر ہم ان کو متعین و متشخص کرسکیں اور دوسری طرف ہم صدیوں سے تفریقِ دین و دنیا کے سایہ میں زندگی گزار رہے ہیں اس لیے قدرتی طور پر ان ہدایات پر ہماری نگاہیں ٹکتی ہی نہیں ہیں یا اگر ٹکتی ہیں تو ہم ان کو زبردستی توڑ مروڑ کر اپنی ذہنی ساخت اور ماحول کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اسی حالت میں یہ ہدایتیں ہمارے کس کام آ سکتی ہیں!

ابتداء کار

بہ ہر حال دین نے ہمیں الیکشن وغیرہ جیسے معاملات کے بارے میں بھی ہدایات دی ہیں اور انہی ہدایات پر عمل پیرا ہونا مسلمانوں کا اصلی فریضہ ہے اور ان کی ہی پیروی سے ان کے موجودہ مشکلات و آلام کا ازالہ ہوسکتا ہے۔ آیئے ہم غور کریں یہ ہدایات کیا ہیں؟

ہمارے نزدیک دینی حیثیت سے مسلمانوں کے کرنے کا جو کام ہوسکتا ہے اس کی ابتداء اس بات سے ہوتی ہے کہ آئندہ انتخاب سے مسلمانوں کو کلیتہً الگ رہنا چاہیے۔ یہ صحیح راستے پر چلنے کے لیے پہلا قدم ہے۔

یہ طریقہ ہمیں کیوں اختیار کرنا چاہیے اور اس سے کیا فائدہ یا نقصان پہنچ سکتا ہے اس پر ہم آئندہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے لیکن اس سے پہلے میں یہاں ایک شبہ کا ازالہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت الیکشن سے علیحدگی کا جو مشورہ دیا جارہا ہے یہ اُس طرح کی علیحدگی نہیں ہے جس کو مسلمانوں کی اکثریت پہلے ہی سے اختیار کیے ہوئے ہے اور جس کی ہم اس سے پہلے مذمت بھی کرچکے ہیں۔ یہ دونوں علیحدگیاں بہ ظاہر ایک سی معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

پہلی علیٰحدگی کسی فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ غفلت و بے پروائی یا دل شکستگی کا نتیجہ ہے، حالات کے دباؤ نے مسلمانوں کو اس درجہ مایوس اور دل شکستہ کردیا ہے کہ وہ زندگی کے اہم ترین مسائل میں بھی کوئی حصہ لینے کے لیے آمادہ نہیں ہیں اور نہ وہ اس کے لیے حالات ہی کو کچھ سازگار پا رہے ہیں اس لیے وہ مجبوراً انتخابات سے بھی علیحدہ رہنا چاہتے ہیں لیکن اگر حالات میں

آئندہ تبدیلی واقع ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ کس ذوق وشوق کے ساتھ ان میں حصہ لیتے ہیں اور اس کے برعکس ہم جس علیٰحدگی کا مشورہ دے رہے ہیں وہ ایک مستقل فکر ہے جس کو غفلت وبے پروائی سے کوئی دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے اور یہ علیٰحدگی بے اختیاری نہیں بلکہ اختیاری ہے اور یہ ہر حیثیت سے بے تعلقی کے مترادف بھی نہیں ہے بلکہ یہ تعلق ہی کی ایک قسم ہے۔ ع

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ

اس لیے محض ظاہری مشابہت کی بنا پر دونوں کو ایک قرار نہیں دیا جا سکتا۔

الیکشن کے دینی نقصانات

دینی نقطۂ نظر سے ہمیں الیکشن میں کیوں نہیں حصہ لینا چاہیے اس کے وجوہ ہمارے نزدیک بہت واضح ہیں۔ سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ جب اسلام خود ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور اس کی پیروی اور اس کی قولی وعملی تبلیغ، ایک مسلمان کا سب سے اہم اور اصلی فریضہ ہے تو یہ اس کے لیے کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اس فریضہ کو بالائے طاق رکھ کر الیکشن میں حصہ لے؟ اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ ایسا کیے بغیر الیکشن میں حصہ لینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

ایک مسلمان جیسا کہ اوپر ضمناً گزر چکا ہے خدا کی حاکمیت پر ایمان رکھتا ہے جو اور باتوں کے ماسوا اس کے بنیادی کلمہ کا براہِ راست اور اولین تقاضا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ الیکشن کا پورا ہنگامہ حاکمیتِ جمہور کا تماشہ ہے جس کا رشتہ کسی طرح کھینچ تان کر بھی حاکمیتِ خدا سے جوڑا نہیں جا سکتا، ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ حکومت وفرماں روائی کے جملہ اختیارات اصلاً خدا کے لیے مخصوص مانے اور بجز نائب ہونے کی حیثیت کے ان کا استعمال کسی حال میں کسی انسان کے لیے صحیح نہ سمجھے لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ مجالسِ قانون ساز کے ممبران کامل خود مختار اور احکام الٰہی سے مطلق بے نیاز ہو کر قانون بناتے ہیں اور پھر اپنی پوری مختارانہ حیثیت میں ان کا نفاذ کرتے ہیں۔ خدا کا نام کہیں درمیان میں بھولے سے نہیں آتا اور اگر اتفاق سے آجاتا ہے تو اس کا علانیہ مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ دستور ساز اسمبلی میں کچھ سادہ لوح ممبران نے تجویز پیش کی تھی کہ آئین میں خدا کے نام پر حلف کا اقرار درج کیا جائے جو یقیناً ایک مہمل

تجویز تھی کیوں کہ جب سب کچھ اس سے بے نیاز ہو کر ہی کرنا ہے تو خواہ مخواہ اس کا نام لینے سے بجز اس کے اور فائدہ ہی کیا ہے کہ اس کو اپنی بغاوت پر گواہ ٹھہرایا جائے لیکن اس تجویز پر جو تقریریں کی گئیں ان سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ اسمبلیوں کو اللہ اور اس کے قانون سے کیا نسبت ہے۔ بعض ممبروں نے برجستہ کہا اور صحیح ہی کہا کہ جب خدا پارلیمنٹ کا ممبر نہیں ہے تو اسے ہمارے معاملات میں دخل انداز ہونے کا کیا حق ہے اور کچھ ممبران نے تو اس موقع پر ایسے کلمات بھی استعمال کیے جن کو قلم پر لاتے ہوئے ہمارا دل ڈرتا ہے۔

یہ تو ایک بنیادی بات ہوئی لیکن اس کے ساتھ اگر آپ تفصیلات میں گھس کر غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ الیکشن میں آپ جس نوعیت سے بھی حصہ لیں قدم قدم پر آپ احکام و ہدایات شریعت کو پامال کر رہے ہیں۔ طریقۂ انتخاب، طریقۂ امیدواری، الیکشن کا پروپیگنڈا، وزارت یا پارٹیوں کی تشکیل، بحث و مباحثہ کا عام انداز اور اس طرح کی جملہ باتیں وہ ہیں جو یورپ کے موجودہ غیر خدا پرستانہ نظام زندگی سے حاصل کی گئی ہیں اور ان میں سے بیش تر چیزیں وہ ہیں جو کلیتاً یا جزءًا اسلامی طرز فکر و عمل کے خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر طریقِ امیدواری ہی کو لیجیے جو الیکشن کا سنگِ بنیاد ہے۔ یہ چیز اس زمانہ میں اتنی مقبول ہو چکی ہے کہ اس کے خلاف کچھ کہہ کر کوئی شخص قدامت پسندی، رجعت پرستی اور پستیِ فکر و خیال وغیرہ کے طعنوں سے بچ نہیں سکتا لیکن جب آپ اس پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اسلام نے الیکشن کی اس بنیاد ہی کو ڈھا دینا چاہا ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت ہے کہ کسی ایسے عہدہ یا خدمت کی خواہش نہ کی جائے، جس میں عزت و حکومت بھی ملی ہوئی ہو۔ آپ نے فرمایا:

لَا تَسْاَلِ الْاِمَارَةَ فَاِنَّکَ اِنْ اُعْطِیْتَهَا عَنْ غَیْرِ مَسْئَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَیْهَا وَاِنْ اُعْطِیْتَهَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُکِّلْتَ اِلَیْهَا۔ (بخاری و مسلم)

”حکومت طلب نہ کرو کیوں کہ اگر وہ تمھیں بے طلب مل گئی تو اس کے سلسلہ میں تھیں اللہ کی طرف سے مدد ملے گی لیکن اگر تم کو طلب کے بعد ملی تو تم اس کے حوالہ کر دیے جاؤ گے۔“

آپؐ کا یہ بھی ارشاد ہے:

اِنَّا وَاللّٰہِ لَا نُوَلِّیْ عَلٰی ھٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا سَأَلَہٗ وَلَا اَحَدًا حَرَصَ عَلَیْہِ۔

''خدا کی قسم ہر حکومت کے منصب پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کریں گے جو اس کا خواست گار ہو اور نہ ایسے شخص کو جو اس کی حرص کرے۔''

یہ ہدایات ظاہر ہے ایک اسلامی نظامِ حکومت سے متعلق ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر طلب و امیدواری کسی غیر اسلامی نظام حکومت کے کسی اعزازی منصب کے لیے ہو تو اس کی قباحت اور کتنی زیادہ بڑھ جائے گی اور اسی سے اس بات کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسے امیدواروں کی تائید و حمایت کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے کیسا ہوگا۔

اگر یہ ہدایات صحیح معنوں میں بہ روئے کار لائی جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کا ہنگامۂ انتخاب خود بہ خود بہت کچھ سرد پڑ جائے گا کیوں کہ انتخاب کا ہنگامہ زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کے دم قدم سے زندہ ہے جو عہدوں کے حریص اور بھوکے ہیں۔ یہ لوگ خود اپنے کو پیش کرتے ہیں اور پیش ہی نہیں کرتے بلکہ اپنی کام یابی کے لیے معلوم نہیں کیا کیا انسانیت و شرافت سے گری ہوئی حرکتیں کرتے ہیں، رہے وہ لوگ جو ان کے مقابلے میں زیادہ اہل ہوسکتے ہیں تو وہ خود ہی اپنے کو اس ہنگامے سے الگ رکھتے ہیں اور اگر وہ آگے بڑھنا بھی چاہیں تو ان کو پوچھتا کون ہے۔

اور یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ شریعت نے اگر کسی منصب و اعزاز کی امیدواری کو اس طرح ممنوع و مذموم قرار دیا ہے تو یہ اس کی طرف سے کوئی متشددانہ بات نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ امیدواری طرح طرح کے فتنوں کی جڑ ہے۔ جو لوگ اس طرح کی خدمتوں کے لیے خود امیدوار بنتے ہیں وہ اپنے خلوص اور ہم دردیٔ خلق کا کتنا ہی ڈھنڈھورا کیوں نہ پیٹیں ان میں نہایت کم تر ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے پیش نظر واقعی خدمت ہو، عام طور سے وہی لوگ امیدوار بنتے ہیں جو اقتدار کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اور اس اقتدار کو وہ تمام تر اپنی ذاتی نفع اندوزیوں ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں اس لیے اس کا دروازہ کھول دینے کے معنی یہی ہیں کہ اچھے لوگ کبھی ابھر کر سامنے نہ آسکیں اور اسمبلیوں کی کرسیوں پر خود غرض اور نااہلوں کا قبضہ ہو جائے۔

اور یہ بات بھی یاد رکھیے کہ امیدواری کے سلسلہ میں یہ جو کچھ کہا جارہا ہے اس پر اس بات کا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ امیدوار بہ طور خود کھڑے نہ ہوں بلکہ پارٹیوں کی طرف سے وہ متعین کیے جائیں، بلاشبہ ایسے کسی امیدوار کے بارے میں مقابلتہً کچھ زیادہ حسنِ ظن سے کام لیا جاسکتا ہے بہ شرطے کہ جو پارٹی اسے امیدوار کھڑا کررہی ہے اس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ کوئی اصولی پارٹی ہے اور وہ اگر خدا سے خوف ومحبت کا تعلق نہیں رکھتی تو کم از کم اپنے اصولوں کی وفاداری میں پختہ ہے اور ان کے مقابلے میں وہ کسی شخصیت وغیرہ کی کوئی پروا نہیں کرتی ہے لیکن اس زمانہ میں عام طور سے پارٹیوں کا جو حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس بات کی توقع رکھنا کہ وہ ہمیشہ اہل تر اشخاص کو نام زد کریں گی بالکل عبث ہے۔ پارٹیوں میں ایسی پارٹیاں بھی ہوسکتی ہیں جو ویسے ہی اغراض دنیہ کے ساتھ قائم ہوئی ہوں جو خود غرض امیدواروں کے سامنے ہوتی ہیں اس لیے ان کے کھڑے کیے ہوئے امیدوار ظاہر ہے انفرادی امیدواروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ خطرناک تو ہوسکتے ہیں کیوں کہ پارٹی کی پوری قوت ان کی پشت پر ہوگی۔ لیکن ان سے بہتر کسی طرح نہیں ہوسکتے۔ اور جو پارٹیاں ایسی ہوں گی جن کے مقاصد کچھ بلند ہوں اور ان میں کچھ نسبتاً بہتر لوگ بھی شریک ہوں تو عام طور سے پارٹیوں کی تشکیل جس طرح عمل میں آتی ہے اور امیدواروں کے انتخاب میں جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس پارٹی کے اچھے لوگ ہی امیدواری کے اہل سمجھے جائیں گے اور بُرے لوگ ان کے مقابلے میں کام یاب نہیں ہوسکیں گے جب کہ اس وقت تک عام تجربہ بھی اس کی تردید کررہا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی پارٹی عرف عام میں پارٹی کہلانے کی مستحق ہے تو اس میں کسی مخلص اور ایمان دار آدمی کے رہنے کی گنجائش ہی بہت تھوڑی ہے بلکہ نہیں ہے۔ ہر ایسی پارٹی کا اولین مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ہر حال میں اپنی پارٹی کا ساتھ دے خواہ ایسا کرنے میں اسے حق اور اپنے ضمیر کا خون ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور ظاہر ہے اس شرط کو پورا کرنے والے سب کچھ ہوسکتے ہیں لیکن ایمان دار نہیں ہوسکتے اور اسی شرط کی تکمیل کی نسبت سے اس پارٹی میں آدمی کے درجات متعین ہوتے ہیں اس لیے ایمان دار لوگ اس کا رخ بھی نہیں کرسکتے۔

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اور اگر کوئی کسی ''مجبوری'' سے شریک بھی ہو جائے تو اسے ہمیشہ پچھلی ہی صفوں میں رہنا پڑے گا الّا یہ کہ پارٹی کی کوئی مصلحت اسے آگے لانے پر مجبور کرے۔

الیکشن کے دینی مضرات پر اس وقت کسی مفصل بحث کا موقع نہیں ہے یہ ایک مستقل عنوان ہے جو کسی قدر فرصت کا طالب ہے ان شاء اللہ اس پر تفصیلی گفتگو اور کسی موقع پر ہوگی فی الحال امیدواری کی اسی ایک مثال کو سامنے رکھتے ہوئے آپ اندازہ کریں کہ انتخاب کی وادی ایک مسلمان کے لیے کتنی پُرخار ہے جس میں قدم قدم پر اس کا دامن خارِ معصیت سے الجھتا ہے۔ اگر اس حالت کے بعد بھی آپ کا شوق مجبور کر رہا ہو تو یہ آپ کی ہمت ہے، ہم اس سے روکنے کا حوصلہ کیسے کر سکتے ہیں البتہ اتنی درخواست کرنے کو جی ضرور چاہتا ہے کہ اگر ہو سکے تو کبھی کبھی اسے ضرور یاد کر لیا کریں کہ آپ کون ہیں اور آپ دنیا میں کیا کرنے کے لیے آئے ہیں۔

تعامل کا عذر

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں لوگ دین کے صحیح تقاضوں سے بچنے کے لیے موجودہ تعامل کا جو عذر پیش کیا کرتے ہیں کچھ مختصراً اس سے بھی بحث کر لی جائے۔

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندستان میں ایک عرصے سے انتخابات ہوتے آ رہے ہیں اور ان میں عام مسلمان تو درکنار بڑے بڑے علماء و فضلاء نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ ہمیشہ حصہ لیا ہے اور اب بھی ان کی ایک بڑی تعداد صوبہ جاتی و مرکزی اسمبلیوں میں شریک ہے اس لیے اس تعامل کو دیکھتے ہوئے یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا کہ الیکشن میں حصہ لینا دینی نقطۂ نظر سے کیسا ہے؟ یہ تعامل اس کے جواز و استحسان کی بڑی روشن دلیل ہے۔

یہ اعتراض زیادہ تر کم پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے لیکن اس کے پیش کرنے والوں کی تعداد بڑی کافی ہے اس لیے ہمیں اس پہلو سے اس پر بہت زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علماء کے طرز عمل نے اس مسئلے کے ضمن میں عوام کو کتنی شدید غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے اور اس لیے ہم نہایت شدت کے ساتھ یہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنی حد تک اس

مسئلہ کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر واضح کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہ کریں تاکہ ہم عنداللہ اور عندالناس اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش قرار پائیں۔

ہم اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ عام مسلمان اور ان کے ساتھ علماء نے بھی انتخابات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور اب بھی ان کی ایک بڑی تعداد کا دل چسپ مشغلہ یہی ہے لیکن اس کے باوجود ہماری رائے وہی ہے جو اس سے پہلے عرض کی گئی ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ چوں کہ ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے اس لیے اب یہ مسئلہ خارج از بحث ہو چکا ہے اور محض یہ بات کہ ایسا ہوتا رہا ہے اس کے جواز کی کوئی دلیل بن سکتی ہے۔ دین میں بلا شبہ تعامل کے اعتبار کا ایک درجہ ہے لیکن اس کے لیے اولین شرط دین کی مطابقت ہے اگر ایسا نہ ہو تو یہ کوئی چیز نہیں ہے خواہ اس میں مبتلا ہونے والے کیسے ہی لوگ کیوں نہ ہوں۔ مومن صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند ہے، دوسروں کی اطاعت اور پیروی اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس وقت جب وہ اس سے متصادم نہ ہو رہی ہو اور صرف اس شرط کے ساتھ شریعت نے دوسروں کی اطاعت و اتباع کی اجازت دی ہے، چناں چہ اسی بنا پر قرآن مجید میں منکرین حق کے اس مقولہ کی جا بجا مذمت کی گئی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (المآئدہ:۱۰۴)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ ان احکام کی طرف جو اللہ نے نازل کیے ہیں اور آؤ رسول کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ جس روش پر ہم نے اپنے آباء کو پایا ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے۔''

ایک مومن کی حقیقی شان ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ (الاحزاب:۳۶)

''کسی مومن مرد یا عورت کو یہ گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں تو انھیں اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے۔''

پھر اس ضمن میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے کا معاملہ تعامل کی صحیح تعریف میں آتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ اعتراض کرنے والے غالباً اس بات کو بھول گئے ہیں کہ اسی ہندستان میں ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جس میں علماء ہند کا عمل اس ''تعامل'' کے خلاف رہا ہے۔ ترک موالات کے زمانہ کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے ہیں غالباً ۲۰ء کا واقعہ ہے کہ ہندستان کے تمام مشاہیر علماء کے دستخطوں سے ایک ''متفقہ فتویٰ'' شائع ہوا تھا، جس میں متعدد شرعی دلائل کی بنا پر کونسلوں میں مسلمانوں کی شرکت کو ناجائز اور حرام قرار دیا گیا تھا اور یہ واضح رہے کہ یہ دلائل سب کے سب وقتی ہی نہیں تھے جو زمانہ کے بدلنے کے ساتھ بدل سکتے ہوں بل کہ ان میں سے متعدد دلائل بنیادی حیثیت رکھتے تھے اور اس زمانہ میں کم از کم ان کے غلط ہو جانے کی نہ کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور نہ ہمارے علم میں کوئی ایسی بات ہی آسکی ہے جس میں ان کے غلط ہو جانے کی کوئی توجیہ کی گئی ہو درآں حالیکہ اس فتویٰ پر دستخط کرنے والوں میں سے متعدد علماء بحمد اللہ اب بھی بقیدِ حیات ہیں۔ مثلاً اسی فتویٰ کی ایک دفعہ یہ تھی۔

> ''کونسل میں اکثر غیر شرعی قانون وضع کیے جاتے ہیں جس کی تحریک یا تائید یا اس پر سکوت باوجود قدرتِ مخالفت کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے قال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ رَائَی مِنکُمْ مُنکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ وَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ ... مسلم ممبران کونسل یہ سب کچھ کرتے ہیں جس کے شواہد واقعاتِ ماضیہ اور خود موجودہ قوانین کا نفاذ ہے۔''

مسلمانوں کا موجودہ طرزِ عمل یقیناً اس فتویٰ اور اس کے مطابق ایک عرصہ تک جو عمل درآمد رہا ہے اس کے خلاف ہے اس لیے بلا شبہ یہ ایک قابل غور مسئلہ ہے کہ اس وقت کا یہ فتویٰ اور اس کے مطابق طرزِ عمل صحیح تھا یا ان کا اس وقت کا عمل جس کی تائید میں اب تک کوئی شرعی دلیل سوا اس ''تعامل'' کے ہماری نظر سے نہیں گزری ہے۔

الیکشن عقلی نقطۂ نظر سے

گزشتہ فصل میں ہم نے الیکشن کے بارے میں دینی نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی تھی، اب ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر خالص عقلی بنیادوں پر غور کیا جائے کہ الیکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا دینی یا دنیاوی اعتبار سے کہاں تک مفید یا مضر ہو سکتا ہے۔

ہر چند دینی حیثیت سے اس مسئلہ کی وضاحت ہو چکنے کے بعد کسی اور نقطۂ نظر سے بحث کی کوئی ضرورت یا گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے کیوں کہ ایک مسلمان کے لیے اصلی اور حقیقی نقطۂ نظر صرف دینی نقطۂ نظر ہی ہو سکتا ہے کیوں کہ کسی امر کے بارے میں جب یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا اختیار کرنا اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف ہے تو ایک مسلمان کے لیے اس سے علاحدہ رہنا ضروری ہو جاتا ہے خواہ اس کے اختیار کرنے سے کتنے ہی فائدے کیوں نہ پہنچنے والے ہوں اور اس کا ترک کرنا کتنے ہی نقصانات کا موجب کیوں نہ ہو۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ (الاحزاب:۳۶)

''کسی مومن مرد یا عورت کو یہ گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں تو انھیں اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے۔''

ایمان کا نام ہے بے چون و چرا اطاعت کا اور یہ خود قرآن مجید نے صراحت کی ہے:

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵ (النسآء:۶۵)

''پس قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ مومن نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں پھر آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورے طور پر تسلیم کرلیں۔''

لیکن چوں کہ بدقسمتی سے مسلمانوں کے نزدیک دینی نقطۂ نظر کی کچھ زیادہ اہمیت باقی نہیں رہ گئی ہے ان کے نزدیک ہر مسئلہ میں فیصلہ کن چیز صرف عقل ہوسکتی ہے حتی کہ جن لوگوں کی بحث و گفتگو دین سے شروع ہوکر دین ہی پر ختم ہوجانی چاہیے وہ بھی جب اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کی گفتگو تمام تر عقلی ہی ہوا کرتی ہے اور وہ بھولے سے بھی دین کا نام درمیان میں نہیں آنے دیتے اس لیے ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اس مسئلہ پر اس حیثیت سے بھی نگاہ ڈال لی جائے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ دین جو کچھ چاہتا عقل کا فیصلہ بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔

(۱) ہندستان میں کسی قومی کش مکش کا پیدا ہونا مسلمانوں کے دینی و دنیاوی دونوں طرح کے مصالح و مفاد کے خلاف ہے بل کہ نفسِ اسلام کے خلاف ہے کیوں کہ اسلام کسی قوم کا نام نہیں ہے اور نہ اس کے نزدیک ایسے قومی مفادات جن سے قومی کش مکش پیدا ہوتی ہے قابلِ اعتبار ہیں۔ ایک مسلمان کا اصلی تعلق صرف ان اصولوں سے ہوتا ہے جو اسلام نے پیش کیے ہیں اور ان کے لیے جدوجہد کرنا اس کا اصل مقصودِ زندگی ہے باقی رہا وہ ملک یا قوم جس سے اس کا پیدائشی تعلق ہوتا ہے تو وہ ان سے تعلق خاطر تو رکھ سکتا ہے لیکن وہ ان میں سے کسی کے لیے اپنے اصلی مقصودِ زندگی کو چھوڑ نہیں سکتا اور نہ کسی درجے میں نظر انداز کرسکتا ہے، پس قومی نقطۂ نظر کو اصل بنا کر قومی حقوق کے لیے جدوجہد کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی صحیح بات نہیں ہوسکتی اور نہ اس سے اسلام کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے بل کہ اس سے بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے جیسا کہ اس سے پہلے مسلمانوں کے قوم پرستانہ نقطۂ نظر کے تحت بہت کچھ پہنچ چکا ہے۔ آج ہندستان میں اسلام غیر مسلموں کی نگاہوں میں حد درجہ مبغوض اسی لیے ہورہا ہے وہ اسلام کو مسلمانوں سے الگ کرکے نہیں دیکھ سکتے اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کا تعلق ایک عرصہ سے جنگ و جدال کا رہا ہے اس لیے قدرتی طور پر وہ مسلمانوں کے ساتھ اسلام کو کسی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

اسی طرح قومی حقوق کے لیے یہاں کی غیر مسلم اکثریت کے ساتھ کش مکش کرنا دنیوی

حیثیت سے بھی مسلمانوں کے لیے مفید ثابت نہیں ہوسکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ان کو جو حقوق اس وقت تک حاصل ہیں وہ بھی اس کش مکش کی نذر نہ ہو جائیں۔ ہندستان میں مسلمان تقسیم کے بعد ایک نہایت قابل رحم اقلیت بن چکے ہیں جن پر ایک زبردست اکثریت کا زبردست تسلط قائم ہے۔اس اکثریت کا رویہ بلاشبہ بدلا جاسکتا ہے بہ شرطے کہ مسلمان جامد قومیت کو چھوڑ کر قولاً وعملاً ان اسلامی اصولوں کے داعی بن جائیں جو اپنے اندر دوسروں کو کھینچنے کی طاقت رکھتے ہیں لیکن قوم پرستی کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی اس وقت ان کی مزید کشیدگی کا باعث ہوگا اور یہ چیز ان کے حقوق کے لیے نقصان پہنچانے کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی جیسا کہ واضح ہے اور یہ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ الیکشن میں اپنے قومی حقوق کی خاطر حصہ لینا چاہتے ہیں تو اس کا انجام یہی ہوسکتا ہے جس کے وجوہ حسب ذیل اقتباسات سے بہ خوبی سمجھے جاسکتے ہیں۔

مولانا نورالدین صاحب بہاری ناظم جمعیۃ العلماء اپنے ایک مضمون ''ہندستان کے مسلمان کیا کریں'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ درست ہے کہ ان بزرگوں (گاندھی جی اور کانگریس ہائی کمانڈ کے چند برگزیدہ وسیع الدماغ بزرگ) نے نیک نیتی سے اس ملک کو جمہوری سیکولر قرار دیا، مگر اس سے زیادہ یقینی یہ ہے کہ ملک کے باشندوں کا دماغ نہ سیکولر ہے نہ جمہوری اور شاید اس ذہنیت کے پیدا ہونے میں عرصہ لگے۔ اگر اس مسئلہ کو اس طرح الجھاؤ میں رکھا گیا تو میرا یقین ہے کہ الیکشن کے زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی اتنی بھیانک ہوگی جس کا تصور بھی آج نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی حکومت اپنے لا اینڈ آرڈر کو اس وقت برسرکار لاسکتی ہے جب کہ اس کے نیچے کا عملہ حکومت کی پالیسی سے دیانت دارانہ تعاون کرے، مگر ہمیں اس کا اقرار کرنا چاہیے کہ آج نیچے کے عملہ کی اکثریت حکومت کی پالیسی کی وفادار نہیں اور خصوصاً اس مسئلہ میں ...پس اس تباہ کن پوزیشن میں نہایت سنجیدگی سے ہندستان کے مسلمانوں کو غور کرنا ہے کہ آیا اس حق کو جو ملک کی برسر اقتدار پارٹی نے مسلمانوں کو دیا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے یا موجودہ ماحول و ذہنیت کے پیش نظر اس وقت تک کے لیے جب تک ملک کی اکثریت کی ذہنیت جمہوری اور سیکولر کے

ڈھانچے میں نہ ڈھل جائے اس وقت تک اس حق سے دست بردار ہو جایا جائے...
میری دیانت دارانہ سیاسی رائے ہے کہ تمام ملک کے مسلمانوں کو قطعاً اس حق سے دست بردار ہو جانا چاہیے اور آئندہ الیکشن میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا مقصدِ زندگی سیٹ اور عہدوں کا حصول ہے شاید وہ اس رائے سے متفق نہ ہوں گے حالاں کہ موجودہ فضا میں اس کی کام یابی کی کوئی راہ نظر نہیں آتی، پھر بھی وہ دست بردار نہ ہوں گے اس لیے میں تمام مسلم عوام سے جو ووٹر ہیں درخواست کروں گا کہ وہ اعلان کر دیں کہ جب تک ملک کی ذہنیت جمہوری سیکولر نہ بنے گی ہم اس حق کو جو مسلمانوں کو دیا گیا ہے استعمال نہ کریں گے۔ میرے نزدیک موجودہ فضا میں اس سے بہتر تباہی سے بچنے کی اور کوئی راہ نہیں ہے۔'' (تیج ۱۹/اپریل ۱۹۵۰)

مولانا حامد الانصاری صاحب غازی نے جمعیۃ العلماء جون پور کے اجلاس میں اپنا خطبۂ صدارت پڑھتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''ہندو رہنما ۲۸ کروڑ ہندوؤں کی نئی تخلیق کا کام اپنے ویدوں اور دھرم شاستروں کے مطابق کرنا چاہتے ہیں، ہر نئی قوم کو نئی مہم کے لیے ایک نشانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے فیصلہ کے مطابق یہ نیا نشانہ ہند یونین کے ۴½ کروڑ مسلمان ہیں اور اس نشانہ پر ہندو قوم کو جمع کرنا ان کا نصب العین ہے۔
(گئورکشا، جبریہ ہندی، کلیدی ملازمتوں سے مسلمانوں کی علیٰحدگی وغیرہ نعروں کو بہ طور مثال میں پیش کرنے کے بعد) یہ تمام باتیں صرف اس لیے آناً فاناً کی گئیں تاکہ مسلمان نشانہ بن سکیں اور تمام ہندوؤں کو اس نشانہ پر جمع ہونے کا موقع مل سکے...
سوال یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی عقل کا فیصلہ کیا ہونا چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہمارے دماغ کا فیصلہ یہی ہو سکتا ہے اور یہی ہونا چاہیے کہ ہم نشانہ سے ہٹ جائیں اور نشانہ کو خطا ہونے کا موقعہ دیں اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم کم سے کم عبوری دور کے لیے سیاست سے مکمل دست برداری کی دستاویز پر دستخط کریں اور اپنی تعمیر و ترقی کے کام میں اس طرح گم ہو جائیں کہ اگر کوئی ہم کو اپنا نشانہ بنانے کے لیے

تلاش بھی کرنا چاہے تو ہم اُسے دستیاب نہ ہوسکیں۔'' (مدینہ ۹/مارچ ۱۹۵۰)

(۲) ہمارے نزدیک مسلمانوں کو اس وقت ہندستان میں جو مصیبتیں درپیش ہیں ان کا ایک بڑا اور بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ اب بھی ہندستان میں اس حیثیت کے مالک ہیں کہ ان کے ووٹ الیکشن پر بہت کچھ اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ ان کی اس حیثیت کو بہت سے لوگ ان کے لیے فالِ نیک سمجھتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے حالات میں ایسا ہی ہوسکتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک ملک کے موجودہ حالات میں ان کی یہ حیثیت ان کے لیے بلائے جان ثابت ہورہی ہے۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے رہے ہیں جن کے تحت یہ سمجھا جارہا ہے۔ اور یہ حقیقت سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت، ہندستان کی موجودہ پارٹیوں میں سے بعض سے زیادہ قریب اور بعض سے بہت زیادہ دور ہے اور اسی اعتبار سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کی تائید یا مخالفت کا کیا انداز ہوگا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو پارٹیاں اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کو مسلمانوں کی تائید وحمایت کسی حال میں حاصل نہیں ہوسکے گی وہ اس بات کے لیے رات دن کوشاں ہیں کہ مسلمانوں کو ہر ممکن ذریعہ سے تنگ اور پریشان کریں اور اس سے گوناگوں فوائد ان کے پیش نظر ہیں۔

پہلا فائدہ اس کا یہ ہوگا کہ مسلمان پریشان ہوہوکر ترکِ وطن کریں گے اور اس طرح ان کے مخالفین کے ووٹ کم ہوتے رہیں گے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جو مسلمان یہاں رہنا ہی چاہیں گے وہ ان سے خوف زدہ ہوکر یا تو ان کا ساتھ دیں گے یا کم از کم ان کے مخالفین کی حمایت نہیں کریں گے اور یہ دونوں صورتیں الیکشن میں ان کے لیے مفید ہوسکتی ہیں۔

اور تیسرا زبردست فائدہ اس سے ان کو یہ پہنچے گا کہ وہ اس کی وجہ سے عام پبلک میں جو بدقسمتی سے سخت فرقہ وارانہ ذہنیت کا شکار ہے ''نیک نام'' ہوں گے اور اس سے ان کی آئندہ کامیابی کی راہیں ہموار ہوں گی۔

اور چوتھا فائدہ یہ ہے کہ فسادات کی وجہ سے کانگریس کی طرف سے مسلمانوں کا اعتماد متزلزل ہوگا اور یہ چیز بالواسطہ طور سے ان کے لیے مفید ہوگی۔

چناں چہ ملک کی یہ جماعتیں ان ہی فوائد کے لیے تقسیم سے لے کر اس وقت تک برابر اپنی فتنہ انگیزیوں میں مصروف ہیں اور اس وقت تک جتنے فسادات بھی ہوئے ہیں ان سب میں ان کا زبردست ہاتھ رہا ہے اور یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ جو لوگ حالات سے ذرا بھی لگاؤ رکھتے ہیں وہ اس سے بہ خوبی آگاہ ہیں، تاہم ہم ذیل میں ایک غیر مسلم صاحب قلم کے ایک مضمون کا اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ ہم نے فسادات اور ان کے اسباب کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس سے غیر متعصب ''صاحب البیت'' بھی متفق ہیں۔

اونکار ناتھ شاستری نے گزشتہ سال کے فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں جو 'نیا ہند' (الہٰ آباد) میں شائع ہوا تھا لکھا تھا۔

> ''ہندستان میں سامپر دایک (فرقہ وارانہ) دنگے کرانے میں ان جماعتوں (فرقہ پرست جماعتوں) کو کئی فائدے دکھائی دیتے ہیں، ہندستان میں مسلمانوں کی اب بھی کافی تعداد ہے اور ان کے ووٹ چناؤ پر کافی اثر ڈال سکتے ہیں، مہا سبھا جانتی ہے کہ وہ ان کے ووٹ نہ حاصل کر سکے گی، اس لیے اگر مسلمان یہاں سے چلے جائیں تو اس کا کام بن سکتا ہے، مسلمانوں کو نکالنے کے لیے اس نے پہلے تو یہ نعرہ لگایا کہ آبادی کی ادلا بدلی کرلی جائے پھر اس نے جنگ کا نعرہ لگایا اور جب یہ دیکھا کہ ہندستان اور پاکستان ایسی مورکھتا نہیں کریں گے تو اپنی ساری کوشش اس بات میں لگادی کہ ہندستان بھر میں ہندو مسلم دنگے ہوجائیں۔
>
> آبادی کا تبادلہ ہونے پر کروڑوں آدمیوں کو کن کشٹوں کا سامنا کرنا پڑتا اس سے اسے کوئی غرض نہیں اور جنگ میں ہندستان و پاکستان میں کتنی تباہی و بربادی ہوتی اس سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اس کا مقصد تو کسی طرح مسلمانوں کو یہاں سے نکال کر ان کے بدلے میں آنے والے ہندوؤں سے یہ کہہ کر ان کے ووٹ حاصل کرنا تھا کہ دیکھو کانگریس تمھارا خیال نہیں کرتی تھی ہم نے تمھیں مسلمانوں کی غلامی سے چھٹکارا دلایا، اس کا آخری حربہ ہندو مسلم دنگے تھے، کیوں کہ یہاں دنگوں میں جو ہندو حصہ لیں گے وہ نہ صرف مسلمانوں کی جان لیتے بلکہ ان کا مال بھی لوٹتے اگر اس لوٹ میں

ان کے ہاتھ کچھ ال آجاتا اور وہ پکڑے نہ جاتے تو مہاسبھا یہ کہتی کہ میرے کارن تمھیں یہ لابھ پہنچا اور اگر سرکار اُنھیں روکتی یا پکڑتی تو مہاسبھا ہندوؤں کو یہ سمجھاتی کہ کانگریس تمھاری دشمن اور مسلمانوں کی دوست ہے اسی طرح جن ہندوؤں کو سرکار گرفتار کرتی مقدمہ چلاتی اور سزا دیتی ان کے سمبندھوں (متعلقین) کے دل میں آپ ہی آپ سرکار اور کانگریس کے خلاف نفرت پیدا ہوتی۔ غرض ہر حالت میں مہاسبھا اپنا فائدہ ہی فائدہ سوچتی تھی۔''

اقتباسِ بالا کو پیشِ نظر رکھنے سے اس بات میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ ہمیں آئینِ ہند میں شہریت کا جو یہ حق دیا گیا ہے کہ ہم الیکشن میں مساویانہ حصہ لے سکیں وہ ہمارے خوش ہونے کے لیے تو بہت اچھا ہے لیکن اس کا استعمال ہمارے لیے بہت سے خطرات کا سرچشمہ ہے۔ اور اس کے بعد غالباً یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کو اگر ہندستان میں اپنی عافیت مطلوب ہے تو ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اپنے اس حق سے خود اپنے ارادہ سے دست بردار ہو جائیں اس سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو کم از کم فرقہ پرستوں کی ان چیرہ دستیوں سے جن کا آئے دن ان کو شکار ہونا پڑتا ہے اُن کو نجات مل سکتی ہے، اور میں یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جو تھوڑا بہت سکون آپ کو نظر آرہا ہے اس کی وجہ سے آپ کچھ یہ نہ سمجھیں کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان فرقہ پرستوں کی ذہنیتوں میں کوئی فرق واقع ہو گیا ہے، اوّل تو اس وقت ملک میں روٹی اور کپڑے کے مسائل نے وقتی طور سے اہل ملک کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیا ہے، جس میں فتنہ و فساد کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی فرصت نہ بانیان فساد کو ہے اور نہ عام پبلک کو۔ دوسرے ابھی الیکشن غیر یقینی ہونے کے ساتھ، کچھ دور بھی ہے، اس لیے اس وقت صرف تیاریوں کا زمانہ ہے، مناسب وقت آنے پر جدوجہد تیز کرنے کی ضرورت پیش آئے گی اور تیسری بات یہ ہے کہ اس وقت بھی ان کا سلسلہ کچھ بند نہیں ہے کچھ نہ ہونے پر بھی ۱۸؍دسمبر ۱۹۵۰ سے ۳۱؍جنوری ۱۹۵۱[1] تک یعنی صرف ڈیڑھ ماہ میں، یوپی، سی پی، اور بہار وغیرہ میں سات جگہ فسادات برپا ہو چکے ہیں جن کا سبب آئندہ الیکشن کی تیاریاں ہیں اور یہ بات وزیراعظم

---

(۱) یہ سطریں فروری ۱۹۵۱ میں لکھی گئی تھیں اس کے بعد جو واقعات پیش آرہے ہیں ان سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔

ہند تک کو تسلیم ہے۔ شعیب (حیدر آباد) نے ابھی حال میں لکھا ہے۔

"وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کے پورے احساس کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ حال ہی میں ہندو مہا سبھا نے فرقہ وارانہ فسادات کرانے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ افواہیں پھیلا کر فسادات کا ایک نیا دور شروع کرانے کی سازش اس لیے کر رہی ہے کہ اصول، نظریہ اور عمل کے میدان میں تو وہ کانگریس کا مقابلہ نہیں کر سکی، مگر فرقہ وارانہ فضا بگاڑ کر اگلے انتخاب میں ووٹ ملنے کی امید کر سکتی ہے اور غالباً یہ توقع بھی کر سکتی ہے کہ اگر فسادات پھیلائے جائیں تو مسلم اقلیت بھی کانگریس پر بھروسہ ترک کر کے مہا سبھا کو نہ سہی دوسرے حریف عناصر کو ووٹ دے گی اور اس طرح مہا سبھائی امیدوار بالواسطہ فائدہ اٹھائیں گے۔"

پھر ان فتنہ پرور جماعتوں کی ان فتنہ پروریوں کے ساتھ یہ بات بھی آپ کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ تقسیم ملک کے بعد ان کے لیے یہاں کی فضا کتنی سازگار ہوگئی ہے اور اب ان کے اثر واقتدار کا کیا حال ہے۔ عوام میں ان کو جو مقبولیت ہو سکتی ہے، اس کے تو خیر اسباب موجود ہیں لیکن خود حکومت میں ان کے اثر واقتدار کا حال یہ ہے کہ اوپر وزیر اعظم ہند کی جس تقریر کا حوالہ دیا گیا ہے اس طرح کی تقریریں خود حکومتی محکمہ یعنی ریڈیو کے ذریعہ ملک میں نشر نہیں ہو پاتی ہیں جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود حکومت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو نہیں چاہتے کہ ان جماعتوں کے خلاف ملک میں کوئی جذبہ مخالفت کا پیدا ہو اور وہ اس کے لیے وزیر اعظم کی تقریروں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، ان جماعتوں کی اس حیثیت کو ذہن میں رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ محض مسلمانوں کا ووٹ اس وقت ان کی کتنی مصیبتوں کا باعث بنا ہوا ہے اور اس پر اس وقت کی حالت کو بھی قیاس کر لیجیے جب انتخابات کی ہماہمی عملاً شروع ہو جائے گی اور مسلمانوں کی حمایت یا مخالفت جو ابھی درجۂ احتمال وامکان میں ہے، الیکشن میں حصہ لینے کی صورت میں کھل کر سامنے آ جائے گی اس وقت اس کا مخالفین پر جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے بلکہ واقعہ تو یہ ہے اگر یہی لیل ونہار رہے تو شاید اِس وقت اس وقت کی تباہیوں کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے، خدا کرے، ہم جن باتوں کا اندیشہ کرتے ہیں ان میں سے کوئی بات بھی پیش نہ آئے، ہماری خوشی یقیناً اس میں

ہے کہ اس بارے میں تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوں اور ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ غیب کا حال کسی کو معلوم نہیں ہے اور کارسازِ حقیقی کی کارسازیاں ہر قسم کے ظن وتخمین سے بالاتر ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ از غیب ایسے اسباب فراہم کردے جن کی وجہ سے یہ حالات چشم زدن میں یکسر بدل جائیں، لیکن اگر خدانخواستہ مسلمانوں کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی جس کا ایک اہم جزء یہ ہے کہ مسلمان اپنی صحیح حیثیت کو پہچانیں اور اس کے تحت الیکشن سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کریں تو اس وقت حالات کے پیش نظر انتہائی پر امید نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود ہمارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور مولانا نورالدین صاحب بہاری کے یہ الفاظ ہمارے ذہن ودماغ میں گونجنے لگتے ہیں:

"اگر اس مسئلہ کو اسی طرح الجھاؤ میں رکھا گیا تو میرا یقین ہے کہ الیکشن کے زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی اتنی بھیانک ہوگی جس کا تصور بھی آج نہیں کیا جاسکتا (لَا سامح اللّٰہ)۔"

(۳) الیکشن میں حصہ لینے کی تین ہی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی شکل یہ ہے کہ مسلمان بہ حیثیت جماعت الیکشن میں حصہ لیں اور اپنے طور سے امیدوار کھڑے کریں۔ دوسری شکل یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے امیدوار علیحدہ کھڑے نہ کریں بلکہ موجودہ پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی سے کوئی سمجھوتہ کرلیں اور پھر اس کے ساتھ مل کر الیکشن جیتنے کی جدوجہد کریں۔ اور تیسری شکل یہ ہے کہ مسلمان متحد ہونے کے بعد اگر بہ حیثیت قوم کسی پارٹی سے کوئی سمجھوتہ نہ کرسکیں تو کسی منظّم طریق کے مطابق الگ الگ ٹولیوں میں مختلف پارٹیوں میں شریک ہوں۔ لیکن یہ تینوں شکلیں مسلمانوں کے لیے غیر مفید بلکہ مضر ہیں جیسا کہ اس سے پہلے ہم تفصیل سے قومی تنظیم کے ضمن میں واضح کرچکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ووٹ کا استعمال

گزشتہ بحث سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ الیکشن میں حصہ لینے کی جتنی ممکن شکلیں ہیں ان میں کوئی شکل بھی ایسی نہیں ہے جسے اختیار کرکے مسلمان دینی یا دنیاوی حیثیتوں سے کوئی فائدہ اٹھاسکیں، اب اس بحث کے بعد صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ مسلمان اگر آئندہ الیکشن

میں کسی طرح خود امیدوار کی حیثیت سے کھڑے نہ ہوں تو وہ اپنے ووٹ دوسرے امیدواروں کے لیے استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں اور ایسا کرنا ان کے لیے کہاں تک مفید یا مضر ہو سکتا ہے۔

اس بارے میں بھی ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے کی یہ شکل بھی صحیح نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے بلکہ بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

پہلا نقصان تو یہی ہے کہ اس شکل میں مختلف پارٹیوں کی آماج گاہ بن جائیں گے اور اس کش مکش میں ان کو نقصان کے سوا فائدہ کچھ نہیں پہنچ سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی طرح کی تنظیم نہ ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے ووٹ مختلف پارٹیوں کے لیے تقسیم ہو جائیں گے اس لیے وہ کسی پارٹی کو خوش نہ کر سکیں گے اور نہ اس سے کوئی دنیاوی منفعت حاصل کر سکیں گے بلکہ ان کے خلاف یہ بات بہت سی — پارٹیوں کی ناخوشی کا موجب ہوگی اور اس سے بہ حیثیت قوم ان کو نقصان پہنچے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اوپر جو وجوہ امیدوار نہ بننے کے سلسلے میں مذکور ہوئے ہیں وہ اس بات کے بھی متقاضی ہیں کہ مسلمان ووٹر کی حیثیت سے بھی الیکشن میں حصہ نہ لیں، مثلاً اگر مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ کسی باطل نظام کے تحت قائم شدہ اسمبلی کی ممبری کے لیے امیدوار بنیں تو ان کے لیے یہ بھی ناجائز ہوگا کہ وہ اس کے لیے کسی امیدوار کی تائید بھی کریں، اور اسی پر دوسرے وجوہ کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

ان اسباب کے تحت ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کو ووٹر کی حیثیت سے بھی آئندہ انتخاب سے علیحدہ ہی رہنا چاہیے، باقی رہی یہ بات کہ مولانا نورالدین صاحب بہاری کے بہ قول جن لوگوں کا مقصدِ زندگی سیٹ اور عہدوں کا حصول ہے، وہ بہ ہر حال انتخاب میں کود یں گے اور اپنے ذاتی اغراض کے لیے وہ مسلمانوں کو بھی اس آگ میں جھونکنے کی کوشش کریں گے، تو یقیناً ایسا ہوگا اور ہم اور آپ ایسے لوگوں کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے، اس لیے ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے اور اگر آپ ہمارے نقطۂ نظر سے متفق ہیں تو آپ کو چاہیے کہ اپنی حد تک اس سے الگ رہنے کی کوشش کریں۔

الیکشن سے علیٰحدگی کے متوقع نقصانات

گزشتہ مباحث میں ہم نے شرعی اور عقلی دونوں طرح کی دلیلوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ الیکشن میں مسلمانوں کا حصہ لینا دینی حیثیت سے غلط اور دنیاوی اعتبار سے ہر طرح کے نقصانات کا موجب ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان مباحث کے بعد اب اس بات کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ گئی ہے کہ ہم الیکشن کی علیٰحدگی کے نقصانات کا الگ الگ جائزہ لیں اور ان پر گفتگو کریں لیکن چوں کہ الیکشن سے علیحدگی کا تصور کرتے ہی طرح طرح کے نقصانات کا ایک بھیانک منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ اچھے اچھوں کے قدموں میں بھی لغزش پیدا کردیتا ہے اس لیے نامناسب نہ ہوگا کہ ہم خاص خاص نقصانات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ کہاں تک اہم ہیں اور الیکشن میں حصہ لینے کے جو نقصانات ہم بیان کر چکے ہیں، ان کے مقابلے میں ان کی کیا حیثیت ہے۔

انفرادی نقصان

کچھ نقصانات تو ایسے ہیں جن کو آپ زیادہ سے زیادہ افراد کا انفرادی نقصان قرار دے سکتے ہیں، مسلمانوں کے عمومی نفع ونقصان سے، جس سے اس وقت ہم بحث کرنا چاہتے ہیں، ان کا کوئی لگاؤ نہیں ہے، مثلاً اسمبلیوں کی ممبری بہت سے لوگوں کے لیے عزت وشہرت کا ذریعہ ہے، ان کو ممبر بننے کے بعد کچھ مستقل یا غیر مستقل وظیفے اور الاؤنس وغیرہ بھی ملنے لگتے ہیں جو بہتوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور کچھ خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسمبلی کے ممبر ہونے کے بعد پارلیمنٹری سکریٹری یا وزیر وغیرہ بنا لیے جاتے ہیں، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ان فوائد میں سے کوئی فائدہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے لیے وہ دینی اور دنیاوی فوائد قربان کردیے جائیں، جو علیٰحدگی سے پہنچ سکتے ہیں اور جن کی مختصر توضیح اوپر کی جا چکی ہے اور نہ یہ فوائد ان نقصانات کی کسی درجہ میں تلافی کر سکتے ہیں، جو الیکشن میں حصہ لینے سے لازمی طور پر پہنچیں گے اور ان کا دائرہ صرف افراد تک محدود نہیں ہوگا بلکہ وہ پوری امتِ مسلمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے ایسی حالت

میں کیا یہ انتہائی حماقت نہیں ہوگی کہ ہم محدود افراد کے انفرادی فائدوں کی خاطر پوری ملت کے نفع ونقصان سے بے پروا ہو جائیں اور فائدے بھی ایسے کہ کسی باوقار اور غیور قوم کے لیے ان فوائد کو معرضِ بحث میں لانا بھی درحقیقت اس کی انتہائی ذلت کے مترادف ہے۔

نمائندگی کا عذر

کچھ لوگ الیکشن کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم مسلمان ممبروں کے ذریعے اپنی آواز اربابِ اختیار کے کانوں تک پہنچا سکتے ہیں اور اس طرح ان کو اپنے حقوق ومطالبات کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں، یا اگر کچھ مسلمان وزارت کے عہدوں پر پہنچ جائیں تو وہ اپنے ذاتی اختیارات یا اثر واقتدار کے ذریعے اور کچھ نہیں تو کم از کم ہمارے واجبی حقوق اپنے دائرۂ اختیار کے اندر دلوا سکتے ہیں۔

لیکن ہمارے نزدیک یہ دلیل بھی بے وزن ہے۔

اوّل تو ہندوستان کا آئندہ الیکشن مخلوط بنیاد پر ہوگا، اس لیے جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے، کسی ایسے مسلمان نمائندے کی کام یابی بہت مشتبہ ہے جو اسمبلی میں جا کر واقعی مسلمانوں کی نمائندگی کر سکے، مخلوط انتخاب کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہوگا بلکہ عام رائے دہندگان کا نمائندہ ہوگا، جس میں اکثریت بہ ہر حال غیر مسلموں کی ہوگی اور اس عمومی نمائندگی کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی شروع امیدواری سے لے کر اسمبلی کی ممبری اور اس کے بحث ومباحثہ اور کسی مسئلہ پر رائے دینے کے ہر مرحلہ پر نہایت شدّت کے ساتھ اپنی اس عمومی حیثیت کو برقرار رکھنا پڑے گا ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ اول تو الیکشن میں کام یاب نہ ہو سکے، یا اگر کام یاب ہو جائے تو اسے اپنی ''نالائقی'' کا احساس یا تو اسمبلی کو قبل از وقت چھوڑ دینے پر مجبور کر دے یا پھر اس کو مجسمۂ سکوت بنا دے کہ وہ سب کچھ دیکھتا رہے لیکن کبھی زبان ہلانے کی جرأت نہ کرے اور یہی بات مسلم وزیروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ مسلمان ہونے کی بنا پر وزیر نہیں بنائے جاتے بلکہ پارٹی کے ممبر ہونے کی بنا پر منتخب کیے جاتے ہیں اور ان کے انتخاب میں اس عام اصول کے علاوہ کہ پارٹی کے ساتھ ان کے اخلاص ووفاداری کا کیا درجہ ہے

ان کے مسلمان ہونے کی بناپر ان کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اس بات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ وہ ہندستان کی سیکولر جمہوری اسٹیٹ میں پوری طرح موزوں ثابت ہو سکتے ہیں یا نہیں اور تجربہ بتلاتا ہے کہ مسلمان وزراء ــــ الّا ماشاء الله ــــ اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس معیارِ انتخاب پر پورے اتریں اور انتخاب کنندگان کو ان کی وجہ سے قوم اور ملک کے سامنے رسوا ہونا نہ پڑے اور وہ اپنی اس کوشش میں ''اللہ کے فضل'' سے پوری طرح کام یاب بھی ہیں، یہ لوگ اپنے عام حالات میں سیکولر جمہوری اسٹیٹ کے اسی مفہوم کو سامنے نہیں رکھتے ہیں، جو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے بلکہ جمہور کے ذہن میں ان الفاظ کا جو مطلب ہے اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کام کرتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک اگر مسلمانوں کی کوئی حق تلفی بھی گوارا کرنا پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس بات کے لیے تو وہ پوری طرح کوشاں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی لگاؤ کسی طرح ظاہر نہ ہو سکے ورنہ انتخاب کنندگان کی نظر انتخاب کی توہین ہوگی اور کیا عجب اس کی وجہ سے وہ ان کی نظر التفات سے بھی محروم ہو جائیں اور اس طرح مسلمانوں کی ''خدمت'' کا یہ ذریعہ بھی جاتا رہے۔ ہندستان میں اس وقت بھی مسلم وزیروں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی شکایات روز بہ روز بڑھتی جارہی ہیں اور یہ وزراء ان پر اس طرح خاموش ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں ہے، آپ ان ہی وزراء پر اپنے مستقبل کے وزراء کو بھی قیاس کر سکتے ہیں، بلکہ اس وقت جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے وہ شاید ویسے بھی ثابت نہ ہو سکیں جیسے اس وقت کے وزراء ہیں اور اس کے وجوہ ظاہر ہیں۔

دوسری بات جو اس ضمن میں اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ یہ خیال سراسر احمقانہ ہے کہ کسی قوم کے حقوق و مطالبات کا تحفظ اس پر موقوف ہے کہ اس کے کچھ لسان القوم ہوں جو اس کی باتیں اربابِ اختیار تک پہنچا سکیں۔ اگر ارباب اختیار ایسے ہوتے کہ وہ عرض و معروض کے بغیر ہماری مشکلات و مصائب سے آگاہ نہ ہو سکتے اور ان کا تغافل یا حق تلفی محض اس ناواقفیت کا نتیجہ ہوتی جیسا کہ پچھلے زمانوں میں ہوا کرتا تھا تو یقیناً اس کی ضرورت ہوتی کہ ہم اپنی باتیں ان تک پہنچانے کا کوئی انتظام سوچیں لیکن یہ زمانہ پچھلے زمانوں سے بالکل مختلف ہے اربابِ اختیار جاہل اور ناواقفِ حال لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو ایک ایک بات کی خبر

ہے اور ان کے ذرائع علم ایسے وسیع ہیں کہ وہ چاہیں تو آپ کی نجی گفتگوؤں کا بھی حال معلوم کر لے سکتے ہیں، اس لیے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آپ کی شکایات کے ازالہ کے لیے بس اتنی بات کافی ہے کہ کسی طرح وہ اربابِ اختیار کے کانوں تک پہنچ سکیں، بلکہ وہ اس بات پر موقوف ہے کہ آپ کے اندر اپنی بات منوانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔ بالفاظ دیگر آپ کے معاملات کا فیصلہ اسمبلیوں کے اندر نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کے فیصلے کی اصل جگہ اسمبلیوں کے باہر ہے۔ اگر آپ نے اپنی حالت ایسی بنالی کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کا وزن محسوس کیا جائے تو چاہے آپ زبان سے کچھ نہ کہیں وہ بات پوری ہو کر رہے گی، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو چاہے آپ سب کے سب اسمبلیوں میں پہنچ کر شور وغل مچائیں سوڈانٹ پھٹکار کے آپ کو کچھ میسر نہیں آئے گا۔ خود کانگریس کی پچھلی تاریخ اس حقیقت کی ترجمان ہے، اِس کی آواز اُس وقت کے ایوانِ اقتدار میں اس وقت سنی گئی، جب اس نے اسمبلیوں سے باہر رہ کر اپنے اندر یہ قوت پیدا کرلی کہ اس کی بات سنی جائے، نہ اس سے پہلے یہی ہوتا رہا ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں اس اصولِ عام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسمبلیوں کا رُخ کیا تو بہت جلد ان کو معلوم ہو گیا کہ انگریزوں کے خلاف ہندستان کی شکایات محض اس لیے نہیں ہیں کہ کوئی اس کی بات ان کے کانوں تک پہنچانے والا نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ کچھ اپنی ہی کم زوریوں میں چھپی ہے، پنڈت جی اور ان کے ساتھیوں کی پُر جوش تقریروں سے اکثر ایوانِ اسمبلی لرز اٹھا کرتا تھا، لیکن پرنالہ گرنے کی جو جگہ متعین تھی اس میں ان تقریروں کے ذریعے سرِ موفرق واقع نہیں ہوتا تھا اور ایک بار کچھ اسی طرح کی غلطی خود کانگریس نے اپنی سرکاری حیثیت میں کی تھی، یعنی اس نے وزارتوں پر قبضہ کے ذریعے اپنا کام نکالنا چاہا تھا لیکن اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور بہت جلد اس کو سب کچھ چھوڑ کر اپنے اس میدانِ عمل میں واپس آنا پڑا جہاں کی ہر بات پر واقعی دھیان دیا جاتا ہے اور جس کو خالی چھوڑ دینے سے بڑی سے بڑی آواز میں بھی کوئی قوت نہیں ہوتی ہے، اور نہ اس کی طرف کوئی دھیان دینے والا ہوتا ہے۔

پس ہمارے نزدیک اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کی آواز واقعی اربابِ اختیار کے کانوں تک پہنچے اور سنی جائے تو اس کی حقیقی تدبیر یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی آواز ایسے گراموفونوں میں

بند کرنے کی کوشش کریں جو اپنی مرضی سے بول بھی نہ سکتے ہوں۔ اس طرح کے گراموفون، لوگوں کی تفریح کا ذریعے تو ضرور بن سکتے ہیں، لیکن ان کی آواز ارباب کار کو آپ کے حقوق و مطالبات کی طرف متوجہ نہیں کر سکتی، اس کے لیے آپ کو اس کے ماسوا کچھ کرنا پڑے گا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھیے کہ یہ طریقِ عمل بعینہٖ وہی طریق عمل ہے جو اب تک مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اختیار کرتے رہے ہیں، لیکن جس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ ہندستان میں ایک عرصے سے مسلمانوں کی سیاست کا محور یہی رہا ہے کہ وہ کس طرح اسمبلیوں میں زیادہ سے زیادہ حقِ نمائندگی حاصل کریں اور وزارتوں میں ان کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہو، اس کی خاطر انھوں نے خوشامدوں کی ذلت بھی گوارا کی اور مخالفتوں اور لڑائیوں کا خطرہ بھی مول لیا اور بالآخر اس مقصد میں وہ ایک حد تک کام یاب بھی ہوئے، چناں چہ تقسیم سے پہلے ان کو غیر منقسم ہندستان کی وزارتوں اور اسمبلیوں کی ممبروں کا اس سے زیادہ حصہ حاصل رہا ہے، جس کے وہ اپنے تناسبِ آبادی کے لحاظ سے مستحق ہو سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ باتیں ان کے دکھ کا درماں نہیں بن سکیں، اور ہر کام یابی کے بعد ان کو پہلے سے زیادہ اپنی ناکامی کا احساس ہوتا گیا تا آں کہ آخری چارۂ کاران کو یہی نظر آیا کہ وہ اپنے لیے ایک علیٰحدہ مامن پاکستان کی شکل میں حاصل کریں۔ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لیے خیر و برکت کا موجب ثابت ہوا، یا اس سے ان کے قومی مسائل اور زیادہ الجھ گئے ہیں یہ ایک علیٰحدہ سوال ہے، جس سے یہاں تعرض کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے کم از کم یہ بات واضح ہے کہ وزارتیں اور ممبریاں اس ملک میں جہاں ان کی حیثیت ایک نہایت کم زور اقلیت کی ہو کوئی زیادہ سود مند چیز نہیں ہے تو کیا ہندستان کے مسلمان اسی آزمائے ہوئے نسخہ پر زندہ رہنا چاہتے ہیں؟ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لیے یہ تدبیر اس وقت بھی صحیح اور کارگر نہیں تھی لیکن اب تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس تدبیر کا سہارا ڈھونڈھنا ان کو بالکلیہ ترک کر دینا چاہیے، ہندستان کے موجودہ حالات میں اس کی مطلق گنجائش نہیں ہے، اس زمانہ میں قومی حقوق و مطالبات پر زور دینا اور وہ بھی قوم پرستانہ طریقوں کے ذریعے، یہ ان حقوق کو پامال کرنے کے مترادف ہے، ان کے لیے صحیح بات تو یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اب اپنا صحیح مقام سمجھتے ہوئے خود ہی اپنے قومی حقوق و مطالبات کی فہرست پر

نظر ڈالیں اور جو باتیں ان کی اصلی حیثیت کے مطابق ہیں ان کو پوری قوت سے برقرار رکھنے کی کوشش کریں اور بقیہ کو نظر انداز کر دیں لیکن اگر ابھی ان پر اپنی اصل حیثیت واضح نہیں ہوئی ہے اور وہ اپنی موجودہ حیثیت ہی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر انھیں اپنے حقوق و مطالبات کے منوانے کے لیے کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیے، یہ اسمبلیوں کی نمائندگی تو اس کے لیے کچھ سود مند نہیں ہے۔

خطرات سے تحفظ کا فریب

الیکشن سے علیٰحدگی کا ایک اور زبردست نقصان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں کوئی ایسی پارٹی برسرِ اقتدار آجائے گی جو مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ خطرناک ثابت ہوگی اور اس وقت مسلمانوں کو جو سہولتیں اور آزادیاں حاصل ہیں وہ بھی اس کے تحت ختم ہو جائیں گی، اِس لیے آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کو پوری قوت و ہمت کے ساتھ حصہ لینا چاہیے اور ان پارٹیوں میں سے نسبتاً کسی بہتر یا کم خطرناک پارٹی کو منتخب کر کے اس کو کام یاب بنانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

الیکشن کی حمایت میں اس وقت جتنی دلیلیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ان سب میں مذکورہ بالا دلیل اس اعتبار سے ایک خاص امتیاز رکھتی ہے کہ اس کا مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقہ پر بہت گہرا اثر پڑ رہا ہے لیکن اس کی وجہ کچھ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہٖ اس دلیل میں کوئی وزن ہے، وزن تو کیا فی نفسہٖ یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے جیسا کہ آپ کو آئندہ بتایا جائے گا، البتہ چوں کہ یہ دلیل خوف زدہ مسلمانوں کی ذہنیت سے مطابقت رکھتی ہے اس لیے اس طرح کے مسلمانوں پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر پڑنا ناگزیر ہے۔

تقسیم کے بعد سے اس وقت تک مسلمان مختلف قسم کی آفات و مصائب کے شکار رہے ہیں اور آئندہ بھی ان کو اپنے لیے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ دکھائی پڑ رہا ہے اور ساتھ ہی انھوں نے اپنی کم نگاہی یا بدحواسی کی وجہ سے یہ سمجھ لیا ہے۔ اور بدقسمتی سے یہی عام طور سے ان کو سمجھایا بھی جاتا ہے کہ ان کو جو کچھ بھی مصیبتیں ہندستان میں پیش آ رہی ہیں وہ محض یہاں کی بعض پارٹیوں کے غلط طرزِ عمل کا نتیجہ ہیں اور ان کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے کہ وہ انہی پارٹیوں میں سے کسی پارٹی کے دامنِ عطوفت میں پناہ لیں، اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ خوف زدہ

مسلمان امن وسکون کی تلاش میں ہراس راستے پر دوڑ پڑیں جس کو ان کے نجات کا راستہ قرار دیا جائے۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی راستہ محض ظن وگمان کی بنا پر امن وسکون کا راستہ نہیں بن جائے گا اور نہ ان کی خوش گمانیوں سے اس کی خطرناکیاں ان کے حق میں راحت وسکون کا ذریعہ بن جائیں گی بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنی اس سراسیمگی اور سرگشتگی کی حالت میں کسی ایسے راستے کو اپنے لیے راہِ نجات فرض کرلیں جس پر چل کر ان کی مصیبت ختم ہونے کی بہ جائے اور زیادہ سخت اور سنگین ہوجائے اور پھر بعد کو ان کو سوا پچھتانے کے اور کچھ حاصل نہ ہوسکے۔

ہمارے نزدیک الیکشن میں حصہ لے کر کسی بہتر پارٹی کو برسرِ اقتدار لانے کی کوشش کی بھی حیثیت یہی ہے۔ یہ ان کی بدحواسی کا سوچا ہوا نسخہ ہے اور اس سے فائدہ کی بہ جائے اُن کو اور زیادہ الٹا نقصان پہنچنے والا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے چند باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ الیکشن میں حصہ نہ لینا اگر اس پہلو سے خطرناک ہوسکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہم کسی خطرناک پارٹی کے زیر اقتدار آجائیں گے اور یہ خطرہ ہمارے لیے بہت سے خطرات کا پیش خیمہ ہے۔ تو ہمارے نزدیک فی نفسہٖ الیکشن میں حصہ لینے سے جو خطرات پیش آئیں گے وہ ان خطرات سے بہ درجہا زیادہ خطرناک ہیں اس لیے اگر آپ خطرات سے اپنا تحفظ چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے آپ الیکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں ــــــ دراں حالیکہ اس کی شرعی اور دینی حیثیت آپ پر واضح ہوچکی ہے کہ یہ کسی طرح آپ کے لیے جائز نہیں ہے ــــــ تو آپ اِس خطرہ کے نقطۂ نظر ہی کے تحت فیصلہ کرلیجیے کہ آپ کے لیے الیکشن میں حصہ لینا زیادہ مفید ہوگا یا اس سے علٰیحدہ رہنا۔

الیکشن میں شرکت کے نقصانات پر ہم اس سے پہلے تفصیل سے گفتگو کرچکے ہیں اس موقع پر ان کو پھر ذہن میں تازہ کرلیجیے۔

(۲) دوسری قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اگر بالفرض ایسا ہو بھی کہ ہمارے موجودہ خطرات ومصائب کا علاج یہی ہو کہ ہم موجودہ پارٹیوں میں سے کسی ایک کی امداد حاصل کریں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سی پارٹی ایسی ہوسکتی ہے، جس کو ہم اس حیثیت سے منتخب کریں؟ یہ ظاہر بات ہے کہ اس وقت ہم خام ملکی مصالح ومفاد کے پیش نظر ان پارٹیوں کے فرق وامتیاز پر

غور نہیں کر رہے ہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہم خود بڑی آسانی کے ساتھ کسی ایک پارٹی کے حق میں اپنی رائے ظاہر کر سکتے تھے، کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ اس حیثیت سے ان میں باہم فرق و امتیاز پایا جاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ مختلف اعتبارات کے سامنے رکھنے کی وجہ سے لوگ اس بارے میں مختلف الرائے ہوں، جیسا کہ اس وقت ہے۔ ہم تو ان پارٹیوں پر اس وقت اس حیثیت سے نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ اس میں سے کون سی پارٹی مسلمانوں کے لیے ان کے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے تحت قابلِ ترجیح ہو سکتی ہے، اور اس نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بعد کم از کم ہمارے لیے ان میں فرق و امتیاز کرنا بہت دشوار ہے۔

الیکشن جب قریب آئے گا اور اس میں مسلمان عملاً حصہ لیں گے تو اس وقت کیا ہوگا، اس کو ابھی جانے دیجیے کہ یہ آئندہ سے متعلق سوال ہے جس کے بارے میں ہم اور آپ جو کچھ کہیں گے وہ بہ ہر صورت از قبیل ظن و قیاس ہی ہوگا جس میں بحث کی کافی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اس کے سلسلے میں تو ظن و قیاس سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے، وہ ایک قطعی چیز ہے اس لیے اس پر غور کرنے کے بعد بہ آسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ پارٹیاں کیا ہیں اور مسلمانوں کے بارے میں ان کا رویہ و مسلک کیا ہے اور ان کی اب تک کی کارروائیاں مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید یا مضر ثابت ہو چکی ہیں۔

وہ پارٹیاں جن کو مسلمانوں کی طرزِ عمل سے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ آئندہ الیکشن میں ان کی اکثریت ان کا ساتھ دے گی اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ یہ محض ان کے ساتھ لگاؤ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اس وقت ان کی حریف جماعتوں کے طرح طرح کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ ان کا بھی حال یہ ہے کہ سب کچھ جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی ان کے اندر مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو رہا ہے درآں حالیکہ ان پارٹیوں میں بعض ایسی ہیں جن کے کندھوں پر اس وقت ملک کے نظم و انصرام کی ذمہ داریاں بھی ہیں جن کا بہ جائے خود یہ تقاضا ہونا چاہیے کہ وہ ملک میں امن و اماں قائم کریں، اور بلا امتیازِ مذہب و ملت ہر قوم کو عدل و انصاف کے قوانین سے یکساں طور سے مستفید ہونے کا موقع دیں، کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آج مسلمان ہندستان میں طرح طرح کے مظالم کے ہاتھوں اس طرح

پریشاں ہیں کہ انھیں اپنی بدحواسی کی حالت میں اپنے لیے کوئی راہِ نجات بھی سوجھائی نہیں دیتی ہے، سوائے اس کے کہ وہ ہنسی خوشی اپنے کو موت کے آغوش میں ڈال دیں اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ان کے ہم دردوں کی ہم دردی جنبش میں نہیں آتی ہے تو اس حالت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ آئندہ آپ کو ان کی ہم دردیاں حاصل ہوسکیں گی اور آپ اس کی وجہ سے ہر فکر سے نچنت ہوجائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان جن پارٹیوں کو اپنے سہارے کے لیے امید کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ان میں خود ایسے لوگ گھسے ہوئے ہیں بلکہ ان کے ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز ہیں جن کی طبعی خواہش یہی ہے کہ مسلمان اگر ان کے ہاتھوں نہیں کیوں کہ یہ ان کی یا ان کی پارٹی کی بدنامی کا باعث ہوگا ــــــ تو دوسروں کے ہاتھوں ستائے اور دبائے جائیں تا کہ مسلمانوں کو ذلیل وخوار دیکھ کر خود ان کے دل کو تسکین ہو یا مسلمانوں میں احساس عجز و بے چارگی پیدا ہوتا کہ وہ ان کو اپنے پارٹی کے مقاصد کے تحت جس رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں اس کے لیے راستہ ہم وار ہوجائے۔

اور ان پارٹیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو مسلمانوں کا اس طرح تختۂ مشق بننا دل سے تو پسند نہیں ہے لیکن وہ اس پر اس لیے خاموش ہیں کہ ان مقہورین کی حمایت کے جرم میں وہ یا ان کی جماعت پبلک میں بدنام نہ ہوجائے جس کے ووٹوں ہی پر اُن کی آئندہ کام یابی و کام رانی کا دارومدار ہے۔

اور ایک تیسری وجہ ان کی خاموشی اور تحمل کی یہ بھی ہے کہ ان پارٹیوں کے ذمہ دار لوگوں کو بہ ہرصورت یہ اطمینان ہے کہ مسلمانوں کا ووٹ ان کے سوا اور کسی کو نہیں مل سکے گا، بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مسلمان دوسری پارٹیوں کی طرف سے جتنا زیادہ ستائے جائیں گے اتنا ہی زیادہ وہ ان کے قریب ہوں گے کیوں کہ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مسلمان اس وقت اس حالت میں پہنچ گئے ہیں کہ ان کو ان کے سوا اور کوئی دوسرا سہارا نظر نہیں آتا ہے، اس لیے وہ ہر طرف سے پریشان ہوکر اور زیادہ شدّت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔

اصل یہ ہے کہ ہندستان میں اگرچہ ایک جمہوری نظامِ آئین نافذ ہے جو اپنی ظاہری ہئیت میں بہت شان دار اور یہاں کی اقلیتوں کے لیے بہت اطمینان بخش نظر آتا ہے لیکن واقعہ یہ

ہے کہ عوام اپنے مزاج و ذہنیت کے اعتبار سے ابھی جمہوریت سے کوسوں دور ہیں، اور یہ پارٹیاں ایسے ہی جمہور کا مرکب یا اس کی نمائندہ ہیں، اس لیے وہ ابھی تک عوامی جذبات سے بالاتر نہیں ہوسکی ہیں۔ اور بد قسمتی یہ ہے کہ عوام کے اس مزاج و ذہنیت کی تبدیلی کا اس وقت کوئی سامان بھی نہیں ہے، حتیٰ کہ جن لوگوں کو اس ذہنیت سے خاص طور سے نقصان پہنچ رہا ہے، وہ بھی اس کی اصلاح میں اپنا واجبی حصہ ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ اس میں تبدیلی کرنے کی بہ جائے اپنے لیے زیادہ مناسب یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو علیٰ حالہٖ چھوڑ کر اس سے تحفظ کے لیے اپنی تدابیر اختیار کریں، خواہ یہ تدابیر ایسی ہی کیوں نہ ہوں جو ایسی ذہنیت کو اور زیادہ ہوا دینے والی ثابت ہوں۔ یہی غلطی مسلمان ایک عرصہ سے کرتے چلے آرہے ہیں اور اب اس کا تلخ خمیازہ بھگتنے کے بعد بھی وہ اصل مرض کا علاج سوچنے کی بہ جائے ایسی ہی تدابیر اختیار کرنے پر مصر ہیں۔

بہ ہر حال یہ الگ بحث ہے، اس وقت کہنا یہ ہے کہ جب ہندستان کی موجودہ پارٹیوں کی اصل حیثیت یہ ہے کہ ہم ان میں سے کسی سے بھی اپنی پریشانیوں میں کسی خاص امداد کی توقع نہیں کرسکتے، تو پھر ہمارے لیے یہ سوال کیا اہمیت رکھتا ہے کہ آئندہ الیکشن میں ان میں سے کون سی پارٹی برسرِ اقتدار آتی ہے، جو پارٹی بھی کام یاب ہو، کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ ہمارے لیے یکساں مفید یا یکساں مضر ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر ان میں اس وقت بہ ظاہر کوئی فرق بھی ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ فرق اس بات کا نتیجہ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کچھ پارٹیاں ایسی ہیں جو فی الحال اقتدار کی مالک ہیں اور ان کے کندھوں پر ملک کے نظم و انصرام کی ذمہ داریاں ہیں، اور دوسری پارٹیاں وہ ہیں جو اقتدار سے محروم ہیں اور اس کے لیے وہ کوشاں ہیں، یہ فرق خود ان میں مختلف حیثیتوں سے فرق کا موجب ہے، اس لیے یہ ناممکن نہیں ہے کہ اگر آئندہ الیکشن میں برسرِ اقتدار پارٹیاں اقتدار سے محروم اور محروم پارٹیاں برسرِ اقتدار آجائیں تو اس تبدیلی کے نتیجے میں مسلمانوں کے ضمن میں ان کا موجودہ رجحان و رویہ بھی بدل جائے، ایسی حالت میں کسی پارٹی کے ساتھ ہر طرح کی امیدیں وابستہ کر لینا اور دوسری سے بالکلیہ مایوس ہو جانا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

ان باتوں کو سامنے رکھ کر آپ خود غور فرمائیں کہ آپ اپنی محبوب پارٹیوں کی حمایت و امداد کی توقع پر اپنے مخالفین کو اور زیادہ برگشتہ کرنے کا جو کھیل کھیلنا چاہتے ہیں وہ کہاں تک آپ

کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ سہارا نہایت بودا سہارا ہے اور اس کے اعتماد پر الیکشن میں حصہ لینا، انتہائی خطرناک بات ہے، اس لیے ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ مسلمانوں کو اس اعتماد پر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے، خطرات و مصائب سے نجات اس ذریعہ سے ممکن نہیں ہے، اس کے لیے کوئی دوسری ہی راہ اختیار کرنی ہوگی جس کا پہلا قدم الیکشن سے علیحدگی ہے جو ان شاء اللہ اس خطرہ کے پہلو سے بھی مفید ثابت ہوگا، کیوں کہ اس سے ایک طرف مخالف پارٹیوں کا جذبۂ عناد کچھ نہ کچھ کم ہوگا یا کم از کم اس میں شدّت پیدا نہیں ہوسکے گی اور دوسری طرف اس سے ان کے ''دوستوں'' کا جذبۂ ہم دردی بھی شاید کوئی عملی شکل اختیار کرسکے کیوں کہ اس سے ان کا یہ اعتماد یقینی طور سے متاثر ہوگا کہ مسلمان ہر حال میں ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں اور اس کے بعد یہ توقع ہوسکتی ہے کہ وہ از سرِ نو مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کریں اور یہ فائدہ آپ کے نقطۂ نظر سے آپ کے لیے بہت قیمتی ہوسکتا ہے اور ان دونوں فائدوں کے علاوہ اس سے ایک اور زبردست فائدہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے نتیجے میں عام پبلک کا غصہ کچھ فرو ہوسکتا ہے جو خواہ مخواہ اس سے برہم ہوتی ہے کہ مسلمان ان کے ساتھ حقوق کے لیے کش مکش کررہے ہیں۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ ان کی برہمی ہمارے لیے دوگونہ مصیبت کا باعث ہے، مخالفین اس کو ہماری مخالفت کے لیے استعمال کرتے ہیں اور موافقین اس کی موجودگی میں ہمارے ساتھ مناسب برتاؤ کرنے سے ہچکچاتے ہیں، بلکہ اکثر حالتوں میں ان کے جذبات میں ان کا عملاً ساتھ دیتے ہیں کیوں کہ ان کو چھوڑ کر کوئی پارٹی نہ اقتدار حاصل کرسکتی ہے اور نہ اقتدار پر تا دیر متمکن رہ سکتی ہے۔

(۳) تیسری بات اس سلسلے میں یہ عرض کرنی ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ان پارٹیوں میں ہماری ہم دردی یا مخالفت کے اعتبار سے باہم فرقِ مراتب پایا جاتا ہے، اور یہ ہمارے لیے بہت زیادہ قابلِ لحاظ ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آئندہ الیکشن میں کسی پارٹی کی کام یابی یا ناکامی محض آپ کی تائید یا مخالفت پر منحصر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً آپ الیکشن میں حصہ لے کر کچھ دنیاوی فائدے حاصل کرسکتے تھے، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ایسا نہیں ہے مسلمانوں کی تعداد بلاشبہ ہندستان میں... اب بھی بہت زیادہ ہے، لیکن یہ تعداد کہیں اکٹھی نہیں ہے بلکہ ہندستان کے طول و عرض میں اس طرح بکھری ہوئی ہے کہ اگر وہ سب مل کر بھی چاہیں کہ

کسی ایک امیدوار کو الیکشن میں کام یاب بنادیں تو اس میں کام یاب نہیں ہو سکتے ہیں، کیوں کہ ہندستان کا آئندہ الیکشن مخلوط بنیاد پر ہوگا اور ہندستان میں شاید ہی کوئی ایسی نشست ہو جہاں مسلم ووٹروں کی تعداد کوئی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہو، غیر مسلم ووٹروں کی ہر جگہ اکثریت ہے اور یہی فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں، اِس لیے آپ کی شرکت یا علیٰحدگی کا الیکشن کے عام نتائج پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوسکتا۔ بلکہ آپ کی شرکت سے تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ آپ جس پارٹی کو کام یاب بنانا چاہتے ہیں وہ ناکام ہو جائے اور جس کی ناکام یابی کے متوقع ہیں وہ کام یاب ہو جائے کیوں کہ مسلمانوں کی کسی امیدوار کی حمایت موجودہ حالات میں اس بات کی دلیل سمجھی جائے گی کہ وہ ''نالائق'' ہے اور اکثریت اس کی مخالفت پر تل جائے گی۔ گویا اس طرح الیکشن میں حصہ لے کر مسلمان اپنے کو بھی نقصان پہنچائیں گے اور اس پارٹی کو بھی جس کو وہ کام یاب دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

پھر مصیبت تنہا یہی نہیں ہے کہ مسلمان اس طرح ظاہری طور سے بکھرے ہوئے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان میں کسی طرح کی فکری ہم آہنگی اور یک جہتی موجود نہیں ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ظاہری طور سے منتشر ہوتے ہوئے بھی اپنی معتد بہ تعداد کے ذریعہ الیکشن پر بہت کچھ اثر انداز ہو سکتے تھے، لیکن اس وقت حالت یہ ہے کہ وہ کسی ایک نقطہ پر نہ مجتمع ہیں اور نہ مجتمع ہو سکتے ہیں، حبل اللہ المتین کو چھوڑ کر وہ مختلف احزاب میں تقسیم ہو گئے ہیں، ہندستان کی کون سی پارٹی ایسی ہے جس میں مسلمان شریک نہ ہوں، حد یہ ہے کہ ہندو مہا سبھا کے جنرل سکریٹری کے بیان کے مطابق بہت سے مسلمان مہا سبھا میں بھی شریک ہو رہے ہیں تا کہ آئندہ الیکشن میں اس کو کام یاب بنائیں، گویا مسلمان کی حیثیت ہی اس وقت یہ ہوگئی ہے کہ اس کا خود اپنا کوئی وجود ہے اور نہ اس کا کوئی مخصوص مطمح نظر، وہ ہر اس پارٹی کا ممبر ہوسکتا ہے جس کی ممبری اس کے سامنے پیش کی جائے اور جس کے ذریعہ اس کے خیال کے مطابق کوئی چھوٹے سے چھوٹا دنیاوی فائدہ پہنچ سکے، پس جب حالت یہ ہو تو آپ کے پاس آخر وہ کون سا آلہ ہے جس کو استعمال کرنے کے بعد آپ یہ توقع رکھ سکتے ہوں کہ تمام مسلمان آئندہ الیکشن میں صرف اس پارٹی کا ساتھ دیں گے جس کو آپ نے مسلمانوں کے حق میں بہتر یا کم خطرناک سمجھ کر اپنی تائید کے لیے منتخب کیا ہو؟ اور

اگر آپ کا منشاء یہ ہو کہ چاہے مسلمان متفق ہوں یا نہ ہوں، جو لوگ کسی پارٹی کو اس نقطۂ نظر سے بہتر سمجھتے ہوں، انھیں اپنی حد تک اس کی تائید کرنی چاہیے تو بلا شبہ آپ کو اس کا حق حاصل ہے اور ہم خود اس اصول کے قائل ہیں کہ ہمیں اپنے عمل کی بنیاد خود اپنے ذاتی فکر و عقیدہ پر رکھنی چاہیے اور اس کے بارے میں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ اس میں ہمارا ساتھ دینے والے کتنے ہیں، لیکن اس کے بعد آپ کو یہ دلیل پیش کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہ جاتا کہ آپ کا پسند کیا ہوا یہ طریقہ مسلمانوں کے لیے خطرات کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے مفید بھی ہے، کیونکہ یہاں جس فائدہ پر گفتگو ہو رہی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان سب کے سب یا ان کی اکثریت اس پر متفق ہو، صرف اس صورت میں آپ کسی بہتر پارٹی کو کامیاب بنانے میں کچھ مفید ثابت ہو سکتے ہیں، اگر ایسا نہ ہو تو پھر الیکشن میں مسلمانوں کی شرکت سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ان کی قوتیں رائگاں جائیں، ان کا انتشار اور زیادہ بڑھے اور نمایاں ہو، مخالفین کا جوشِ مخالفت اور زیادہ ترقی کرے، اور کوئی ایک پارٹی بھی ان سے زیادہ خوش نہ ہو سکے اور اگر آپ مسلمانوں کی اس انتشار کی کیفیت کے باوجود اس اعتماد پر الیکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں کہ یہ پارٹیاں **تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيۡعًا وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى** کی مصداق ہیں اور ایسی حالت میں مسلمانوں کی تھوڑی سی جمعیت بھی الیکشن کے نتیجے کو ان کے حق میں موڑ سکتی ہے تو یہ بات صحیح ہو سکتی تھی، لیکن ایسا اس وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان بھی ان کی طرح منتشر اور پراگندہ نہ ہوتے، بلکہ جیسا کہ ان کو ہونا چاہیے، ان کی حیثیت ''بنیانِ مرصوص'' یا ''جسدِ واحد'' کی ہوتی اور وہ سب مل کر کسی پارٹی کی حمایت یا مخالفت کرتے ہوتے۔ موجودہ حالت میں جب کہ یہ ان سے بھی زیادہ انتشار میں خود مبتلا ہیں اور اس کے ساتھ ہی بدحواسی نے ان کو تدبیر و حکمت سے بھی کوسوں دور پھینک دیا ہے، یہ توقع رکھنا انتہائی سادہ لوحی کی بات ہے۔ پھر اسی کے ساتھ اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنے کی ہے کہ ان پارٹیوں کی یہ باہمی چپقلش ان کے لیے کتنی ہی مضر کیوں نہ ہو، اس سے آپ کو کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں ہے، اوّل تو وہ آپس میں کتنا ہی لڑیں بھڑیں، وہ آپ کو اپنے قریب آنے دینے کی روادار نہیں ہیں بہ شرطے کہ آپ فی الواقع اپنے کو مٹا کر ان کے جسم کا جزء نہ بن جائیں اور اگر آپ قریب جانے کا کوئی موقع نکال بھی لیں تو یہ لڑائی بھڑائی آپ کے لیے اس حیثیت سے بالکل

بے معنی ہے کہ اس میں جو پارٹی بھی کام یاب ہوگی وہ کوئی آپ کی پارٹی نہیں ہوسکتی، وہ انھیں پارٹیوں میں سے کوئی پارٹی ہوگی اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی آپ کے دُکھ کا مداوا نہیں ہے۔

بزدلی کا طعنہ

اوپر جو باتیں ہم نے پیش کی ہیں ان کے ضمن میں بہت سے لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ کسی ایک یا متعدد جماعتوں کی چیرہ دستیوں کے اندیشے سے الیکشن سے علیٰحدہ رہنا خوف اور بزدلی کی راہ ہے جو مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں ہوسکتی۔ اور پھر وہ ایک خاص مجاہدانہ انداز میں تقریر کرتے ہیں کہ کسی قوم کے زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے کو خطرات میں ڈالے کہ یہی اصل زندگی ہے یا اس کے ذریعے زندگی کی راہیں کھلتی ہیں اور علیٰحدگی جمود کا پیش خیمہ ہے جس کی حیثیت قوموں کے لیے موت کی ہے۔

اس کے جواب میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ اِن باتوں سے ہمیں سو فی صدی اتفاق ہے، لیکن یہ باتیں بنانے والے شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ الیکشن میں حصہ لینے کی جو دلیل وہ پیش کر رہے ہیں وہ بھی تو خوف و بزدلی ہی پر مبنی ہے، اگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ الیکشن میں حصہ لینا آپ کے دین اور آپ کی ملّی حیثیت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، آپ الیکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو اس کی وجہ خود آپ کے بہ قول یہی تو ہے کہ اس سے کسی خطرناک تر پارٹی کے برسرِ اقتدار آجانے کا اندیشہ ہے...، تو پھر آخر الیکشن سے علیٰحدہ رہنے کو آپ خوف و بزدلی کے عذر کی بنا پر کیوں کر رد کر سکتے ہیں۔ اگر اس پہلو سے یہ دونوں راہیں یکساں درجہ رکھتی ہیں تو پھر مدار بحث صرف یہی بات ہوسکتی ہے کہ ان دونوں راہوں میں کون سی راہ ایسی ہے جس کو اختیار کرنے سے مسلمانوں کو کم سے کم خطرہ پیش آسکتا ہے۔ یا جس سے وہ زیادہ سے زیادہ خطرات سے محفوظ ہوسکتے ہیں اور جہاں تک آپ کی تجویز کردہ راہ کا تعلق ہے یہ بات اوپر کی بحث سے بھی یک گونہ واضح ہوگئی ہے اور آئندہ آپ کو اس کے سلسلے میں مزید معلوم ہوگا کہ وہ نہ کسی پہلو سے ہمارے لیے مفید ہوسکتی ہے اور نہ اس سے کسی خطرہ ہی کا ازالہ ہوسکتا ہے اور اس کے برعکس ہم جس راہ کے

داعی ہیں اس کا یہ فائدہ تو بین طور سے ہر حال میں محسوس کیا جاسکتا ہے کہ چاہے اس سے کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن اس سے مختلف مصیبتوں کا سدِّ باب ہو جاتا ہے اور اگر فی الواقع آپ حرکت وسعی کی زندگی ہی کے طالب ہیں تو آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ہم الیکشن سے علیٰحدگی کا جو مشورہ دے رہے ہیں وہ بس علیٰحدگی پر ختم ہو جائے گا، ہمارے نزدیک تو یہ کام کا ایک منفی پہلو ہے اور حقیقی کام جو ہمارے نزدیک ضروری ہے اس کی حد اس علیٰحدگی کے بعد شروع ہوتی ہے اور یقیناً وہ کام ایسا ہے جس میں آپ کو اپنی حوصلہ مندیاں دکھانے کا کافی موقع مل سکتا ہے، اس لیے اگر آپ کو ترک و جمود کی زندگی پسند نہیں ہے اور اس بنا پر کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو تھوڑا صبر کر کے پہلے ہمارے پیشِ نظر کام کا ایک سرسری جائزہ لے لیجیے اگر اس سے آپ کے ذوق کار کی تسکین ہو سکے تو ہمارے نزدیک اسی کو اختیار کرنا آپ کے لیے مناسب ہوگا کیوں کہ وہ کام دینی حیثیت سے بھی آپ کے کرنے کا ہے اور ہمارے نزدیک آپ کی دنیا بھی اسی سے محفوظ ہو سکتی ہے اور کوئی عقل مندی نہیں ہے کہ کوئی کام جس سے نہ دین کا کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہو اور نہ دنیا کا، محض اس لیے کیا جائے کہ آپ کی بے چینی آپ کو کوئی کام کرنے پر مجبور کر رہی ہے، جمود و بے عملی بلاشبہ بہت بُری چیز ہے، لیکن ایسی سعی و عمل سے تو وہ بہ ہر حال پسندیدہ ہے جو غلط جگہ اور بے جا طور پر صرف ہو اور جس کا نتیجہ کھلے طور پر فائدہ کی بہ جائے سراسر نقصان ہو۔

ان نقصانات کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے بعض لوگ کچھ اور نقصانات کا نام بھی لیا کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ نقصانات کچھ زیادہ لایقِ توجہ یا قابلِ بحث نہیں ہیں، اس لیے ہم ان پر کسی تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے، البتہ ان کا سرسری تذکرہ یہاں اس لیے کرنا چاہتے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ مسلمان اس وقت کس ذہنی ابتری اور انتشار کے شکار ہیں۔

ناخوشی کا اندیشہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الیکشن سے مسلمانوں کی علیٰحدگی ان پارٹیوں کی ناخوشی کا موجب ہوگی جن کا مسلمان اب تک ساتھ دیتے آئے ہیں، اس لیے چاہے ان کا ساتھ دینے سے مسلمانوں کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ ان کی مروّت کے منافی بات ہے کہ وہ الیکشن جیسے

نازک موقع پر ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔

یہ دلیل پیش کرنے والے تو تھوڑے لوگ ہیں لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ تحت الشعور میں ہمارے بہت سے بزرگ اسی دلیل کو اپنے لیے رہ نما بنائے ہوئے ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس دلیل پر اپنی انتہائی نفرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے، الیکشن میں حصہ لینے سے اگر نقصان پہنچ رہا ہو تو یہ مروّت نہیں ہے کہ ہم اس نقصان کو کسی کی خوشی یا ناخوشی کے لیے گوارا کرلیں۔ بلکہ یہ انتہائی حماقت کی بات ہے، مروت کے اظہار کے دوسرے مواقع ہوتے ہیں اور پھر شخصی اور قومی مروت میں بھی بڑا فرق ہے، جہاں مروت برتنے سے صرف شخصی نقصان پہنچ رہا ہو وہاں یہ چیز جائز ہوسکتی ہے بلکہ بہت سی صورتوں میں صفت محمود بھی بن سکتی ہے، لیکن اگر اس سے پوری قوم وملت کو نقصان پہنچ رہا ہو تو ایسی مروت ایک لمحہ کے لیے گوارا نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو خودکشی کے مترادف ہے اور اس کو وہی شخص گوارا کرسکتا ہے جو اپنے شخصی فوائد ومصالح کو قومی وملی فوائد ومصالح پر ترجیح دے رہا ہو، پھر یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا کسی پارٹی کے لیے ناخوشی کا موجب کیوں ہوگا۔ سوا اس کے کہ اس سے خود اس کو کوئی نقصان پہنچنے والا ہو، ہم دردی کا جذبہ تو بہ ہر حال ناخوشی کا محرک نہیں ہوسکتا بالخصوص ایسی حالت میں کہ کوئی قوم اپنا فائدہ علیٰحدگی ہی میں سمجھ رہی ہو۔ الیکشن میں حصہ لینے یا نہ لینے کی ہر قوم مجاز ہے، وہ اپنے مصالح کے تحت ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت کو بھی اختیار کرسکتی ہے پھر اس پر کوئی دوسرا جزبز کیوں ہو؟ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اگر مسلمان علیٰحدگی کا یہ فیصلہ احتجاجاً کررہے ہوں تو قدرتی طور پر بعض لوگوں پر اس کا اثر پڑسکتا ہے، وہ اس کو اپنے خلاف اظہارِ ناخوشی سمجھ سکتے ہیں اور اس سے وہ ناراض بھی ہوسکتے ہیں لیکن اوّل تو ہمارے نزدیک یہ علیٰحدگی کسی احتجاج یا شکایت کے جذبہ کے تحت ہونی نہیں چاہیے، بلکہ اس کا اصل محرک ہمارا اپنا دینی احساس ہونا چاہیے اور اس طرح علیٰحدگی بھی بس محض علیٰحدگی کے لیے نہیں ہونی چاہیے بلکہ کسی بہتر کام کے لیے جس کا فائدہ پورے ملک کو پہنچ سکتا ہو۔ اور یہی بات تمام لوگوں پر واضح بھی کردینی چاہیے اور دوسرے اگر یہ کسی درجہ میں احتجاج ہی سمجھا جائے تو ان پارٹیوں کو اس پر خفا ہونے کی بہ جائے اس پر اس حیثیت سے غور کرنا چاہیے کہ مسلمان یہ قدم اٹھانے پر کیوں مجبور

ہو رہے ہیں اور پھر اسی حیثیت سے انھیں اپنا رویہ بھی متعین کرنا چاہیے، بہ ہر حال اس کے لیے ان کو صرف مسلمانوں کو مطعون کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا، اس کے ساتھ جن لوگوں کو اس ناخوشی کی بڑی اہمیت محسوس ہوتی ہے وہ ان کا غصہ یوں بھی دور کر سکتے ہیں کہ ان پر یہ واضح کر دیا جائے کہ ہماری یہ علیٰحدگی خود ان کے حق میں مفید ہوسکتی ہے، کیوں کہ ہمارے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ خود مفت میں بدنام ہو رہے ہیں اور اس بدنامی کا براہِ راست اثر الیکشن کی کام یابی و ناکامی پر پڑتا ہے۔ کچھ لوگ اس دلیل کو اس سے زیادہ وسعت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کی علیٰحدگی کسی خاص پارٹی ہی کی ناخوشی کا موجب نہیں ہوگی، بلکہ بہ حیثیت مجموعی تمام پارٹیاں ان سے ناراض ہو جائیں گی اور یہ چیز مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہوسکتی، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں ہے، ہندستان کی کتنی ہی پارٹیاں ہیں جو مسلمانوں کی علیٰحدگی کو اپنے لیے مفید سمجھیں گی اور اس بنا پر وہ نہ صرف یہ کہ ناراض نہیں ہوں گی بلکہ خوش ہوں گی اور ان کی خوشی یا ناخوشی سے قطع نظر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے ہمیں اپنے رویہ کی بنیاد اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں رکھنی چاہیے۔ ہمیں بہ حیثیت مجموعی اپنے مفاد و مصلحت کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس کے مطابق اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرنا چاہیے، خواہ اس سے کسی کو کتنا ہی دکھ کیوں نہ پہنچے اور اس کی وجہ سے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ پیدا ہوں، کوئی قوم دوسروں کی خوشی یا ناخوشی کے ساتھ اپنی موت و زیست کو وابستہ نہیں کر سکتی اور اگر کوئی قوم ایسا کرے تو اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

تفریق کا فائدہ

کچھ لوگ الیکشن سے علیٰحدگی کا یہ نقصان بتاتے ہیں کہ الیکشن نے ہمارے لیے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ ہم ان پارٹیوں میں گھس کر ان کو ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان کر سکیں۔ اس لیے اگر ہم اس قیمتی موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ بڑے نقصان کی بات ہوگی۔ یہ دلیل ہمارے نزدیک انتہائی سفاہت پر مبنی ہے اگر یہ چیز ممکن ہو بھی تو یہ کسی طرح ہمارے شایانِ شان نہیں ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم کی بدبختی پر اپنا مستقبل تعمیر نہیں کر سکتی، اس کے لیے ٹھوس بنیادیں درکار ہیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم ہندستان میں یہاں

کی عام خوش بختی اور بدبختی سے الگ ہوکر اپنے لیے کسی خوش بختی کی توقع نہیں کر سکتے، جو چیز یہاں کی عام آبادی پر مضر اثر ڈال سکتی ہے اس کے اثرات سے ہم اپنے کو بھی محفوظ نہیں کر سکتے ہیں، اس لیے جولوگ اس انداز سے سوچتے ہیں وہ ملک ہی کے دشمن نہیں ہیں بلکہ اپنی قوم کے اور خود اپنے بھی دشمن ہیں۔ بعض لوگوں کی زبانی اس طرح کی دلیلیں سن کر ہمیں مسلمانوں کی حالت پر انتہائی قلق ہوتا ہے۔ ان کے نادان لوگ اپنے غم وغصہ کی شدت میں عقل وہوش کی تمام حدود کو نظرانداز کر جاتے ہیں اور یہ حالت انتہائی تباہ کن ہے۔

بہ ہر حال یہ اور اسی طرح کی دلیلیں اس وقت الیکشن سے علیٰحدگی کے نقصانات کے ضمن میں پیش کی جاتی ہیں، لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ نے گزشتہ تفصیلات سے اچھی طرح اندازہ کرلیا ہوگا کہ یہ ہمارے لیے کہاں تک قابلِ قبول یا لائق اعتنا ہوسکتی ہیں۔

اس بحث سے فارغ ہونے کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ الیکشن سے علیٰحدگی کے بعد ہمارا دوسرا قدم کیا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے اس رسالہ کا حصہ دوم جو مسلمانان ہند کا لائحۂ عمل کے نام سے علیٰحدہ شائع ہورہا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

مسلمانان ہند

کا

لائحہ عمل

پیش لفظ

پیش نظر کتاب یوں تو 'مسئلہ انتخابات اور مسلمانان ہند' کا حصہ دوم ہے کیوں کہ انتخابات کے ضمن میں ہی وہ سوال سامنے آیا تھا جس پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ لیکن چوں کہ اس حصے میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں وہ ہندستان میں مسلمانوں کے طرز عمل کے بارے میں ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے اس کو 'مسلمانان ہند کا لائحہ عمل' کے نام سے الگ شائع کیا جاتا ہے۔

ہمارا ارادہ اصل میں تو یہی تھا کہ یہ دونوں حصے الگ الگ شائع ہونے کی بہ جائے ایک ساتھ ناظرین کے سامنے آ سکے اور الیکشن سے پہلے ہی ہم نے اسے شائع کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن پیہم کچھ ایسے موانع پیش آتے رہے کہ الیکشن سے پہلے اس پورے مجموعے کو شائع کرنے میں دشواریاں محسوس ہوئیں اس لیے مجبوراً الیکشن سے متعلق حصہ الیکشن سے پہلے شائع کیا گیا اور بقیہ حصے کو اس سے الگ کر لیا گیا جو اب پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ ممکن تھا کہ مذکورہ دشواریاں تھوڑی توجہ و محنت سے حل ہو سکتیں لیکن اس تاخیر میں ایک مصلحت بھی پیشِ نظر تھی اور وہ یہ کہ الیکشن کا زمانہ بحران کا زمانہ ہوتا ہے جس میں لوگ سنجیدگی کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے مشکل ہی سے تیار ہوتے ہیں لیکن اب الیکشن کا ہنگامہ ختم ہو چکا ہے اور اس کے وہ نتائج بھی سامنے آتے جا رہے ہیں جن کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا اس لیے ہم امید رکھتے ہیں کہ اس کتاب میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں اب ان پر زیادہ سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ غور کیا جائے گا۔

اس کتاب کے مختلف حصے مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے وہ ساتھ ہی ساتھ چھپتا بھی رہا ہے اس لیے کتاب پڑھتے وقت مختلف دوروں کے حالات و واقعات نگاہوں کے سامنے سے گزریں گے جو موجودہ حالات سے کلیتاً مطابق معلوم نہ ہوں گے، اس سے بچنے کے لیے حالات و واقعات کو ان کے اپنے اپنے اصلی ماحول میں رکھ کر پڑھنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے اور اسے مسلمانوں کے فکر و عمل کو راہ راست پر لگانے کا ذریعہ بنائے۔

۱۴؍شعبان ۷۱ھ

ابواللیث

علیٰحدگی کے بعد

پچھلے مباحث سے یہ بات واضح ہوچکی ہوگی کہ ہمارے دینی اور دنیاوی دونوں طرح کے مصالح ومفاد کا تقاضا یہ ہے کہ آئندہ الیکشن سے ہم کسی طرح کا واسطہ نہ رکھیں۔ اب اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ الیکشن سے علیٰحدہ ہوکر ہمارا کام اور رویہ کیا ہونا چاہیے؟ آیا اتنی ہی بات ہمارے لیے کافی ہوگی کہ ہم الیکشن سے علیٰحدہ رہیں اور اس کے ماسوا اور کچھ نہ کریں یا اس کے ساتھ کچھ اور کرنے کی بھی ضرورت ہے؟

میں سمجھتا ہوں کوئی معمولی سمجھ کا انسان بھی ایسا نہیں ہوگا جو محض علیٰحدگی کو کافی سمجھ لے۔ اور نہ ہماری پچھلی ساری گفتگوؤں کا یہ منشا تھا۔ الیکشن میں شرکت کی مضرتیں یا اس سے علیٰحدگی کے فائدے، جو کچھ بھی بیان ہوئے ہیں وہ محض شرکت وعلیٰحدگی کے فوائد ومضرات بیان کرنے کے لیے ہیں ان کا کوئی علاقہ اس سوال سے نہیں تھا کہ اس کے بعد ہمیں کچھ کرنا ہے یا نہیں بلکہ اس کے برعکس ہم نے جا بجا اس کی تصریح کی ہے کہ صرف علیٰحدگی ہی ہمارے نزدیک کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور کام بھی کرنے ہیں۔ بہ ہر حال جہاں تک ہمارے نقطۂ نظر کا تعلق ہے، اس علیٰحدگی سے کتنے ہی فائدے کیوں نہ ہوں، وہ مسلمانوں کے موجودہ آلام ومصائب کا علاج نہیں ہے اور نہ یہ ہندستان میں ان کے تحفظ و بقا کے لیے کافی ہوسکتی ہے اور اسی کے ساتھ اتنی بات اور ملا لیجیے کہ ـــــ اور نہ محض الیکشن سے علیٰحدہ ہوکر بیٹھ رہنے سے مسلمان اپنے ان فرائض اور ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوسکتے ہیں جو بہ حیثیت مسلمان ان پر عائد ہوتی ہیں۔

دینی حیثیت سے اس علیٰحدگی کا مطلب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے الفاظ ''نصرتِ باطل''،[1] سے تو بچے رہے لیکن حق کے لیے کھڑے نہیں ہوئے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ انھوں نے لا الٰہ کی منزل تو طے کرلی لیکن الّا اللّٰہ کے مقام تک نہیں پہنچے۔ اس لیے جب تک الیکشن سے علیٰحدہ ہوکر وہ فرائض وذمہ داریاں ادا نہ کی جائیں جو ہر مسلمان پر بہ حیثیت مسلمان واجب ہیں یعنی اپنے مسلمان ہونے کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے یہ علیٰحدگی دینی حیثیت سے بہت زیادہ قدر و قیمت کی مستحق نہیں ہوسکتی۔ اور جہاں تک دنیاوی نقطۂ نظر کا تعلق ہے اس کی رو سے بھی صرف الیکشن سے علیٰحدگی مسلمانوں کے خیر وفلاح کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔ بہ حالاتِ موجودہ اس کی جو بھی قدر و قیمت ہو اس کی زیادہ سے زیادہ جو حیثیت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعے وہ چند خاص قسم کے خطرات سے، جو اکثریت کے موجودہ طرزِ عمل کی بنا پر پیش آ سکتے ہیں، اپنے کو محفوظ کرلیں لیکن کسی قوم کی بقاء اور تحفظ کے لیے صرف بیرونی خطرات سے تحفظ ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اس کی جڑوں کو اندرونی بیماریوں کی دیمک سے پاک کیا جائے اور ساتھ ہی اس کو مناسب غذا اور پانی بھی فراہم کیا جائے تاکہ وہ اپنی جڑوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ سکے ورنہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بیرونی آفت کے بغیر خود اپنی ناتوانی کا شکار ہوجائے، یا کسی معمولی حادثہ کے صدمہ کو بھی برداشت نہ کرسکے اور مرجھا جائے۔

بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اتنی سمجھ بوجھ اور توفیق عطا ئے کہ وہ الیکشن سے علیٰحدہ رہیں جو ہر حال ناگزیر ہے لیکن اس کے ساتھ ان کو اور کچھ کرنے کی ہمت نہ ہوئی تو اس سے ان کے لیے کچھ اور قسم کے نئے خطرات پیدا ہوجائیں گے جو ان کے حال و مستقبل کے لیے کم وبیش ویسے ہی خطرناک ہوں گے جیسے الیکشن میں حصہ لینے کے خطرات مثلاً اس کا ایک انجام یہ ہوسکتا ہے کہ یہ قوم ایک خاص طرح کے جمود و بے عملی میں مبتلا ہوجائے گی اور یہ ظاہر

---

(۱) جو لوگ جنگ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ غیر جانب دار تھے ان کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا: خَذَلُوا الحَقَّ وَالَمْ يَنصُرُ والبَا طِلَ (نہج البلاغہ) یعنی باطل کا ساتھ تو انھوں نے نہیں دیا لیکن وہ حق کو بھی چھوڑے رہے۔ آپ کے اسی قول کی طرف اشارہ ہے۔

بات ہے کہ جمود و بے عملی فرد و قوم دونوں کے لیے انتہائی خطرناک اور مہلک چیز ہے۔ ہاں اگر کسی آئندہ کام کی تیاری کے سلسلے میں کچھ وقفہ کے لیے تعطل پیدا ہو اور ہماری قومی زندگی میں اس کی وجہ سے کچھ خلا بھی پیدا ہو جائے تو چنداں مضر چیز نہیں ہے بلکہ تیاری کی شرط کے ساتھ یہ ضروری اور مفید بھی ہے اور حقیقتاً ہم نے الیکشن سے علیٰحدگی اختیار کرنے پر جو اتنا زور دیا ہے تو اس کا اصل مقصود بھی یہی ہے کہ مسلمان جو الیکشن کے پیچھے پڑکر اپنی اصل ملّی ضروریات سے بالکل غافل ہو گئے ہیں، وہ اس لغو اور لایعنی کام سے ہٹ کر اپنی توجہات اپنے اصلی مسائل پر مرکوز کریں اور ان کے حل کے لیے مناسب تدابیر عمل میں لائیں۔

پھر جمود و بے عملی کے اندیشے کے علاوہ صرف علیٰحدگی پر اکتفا کر لینے کا ایک کھلا ہوا نقصان یہ بھی ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کا موقف عجیب ہونے کے ساتھ غیر مسلموں کے لیے اچھے خاصے اشتباہ کا موجب بن جائے گا۔ وہ معلوم نہیں اس کو کیا کیا معنی پہنانے لگیں گے اور اس کی وجہ سے ان کے لیے کیا کیا نئی مشکلیں یا نئے نئے مسئلے پیدا ہو جائیں گے جن پر ان کو چار و ناچار اپنا اچھا خاصا وقت اور توجہ صرف کرنی پڑے گی لیکن اس کے برعکس اگر وہ الیکشن سے الگ ہو کر کسی کام میں لگ جائیں تو ایک طرف شبہات اور غلط فہمیوں کا دروازہ بہت کچھ بند ہو جائے گا کیوں کہ اب ان کے بارے میں جو رائے قائم کی جائے گی وہ ان کے کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ہوگی اس لیے اگر شبہات پیش بھی آئے تو وہ متعین قسم کے ہوں گے اور ان کا ازالہ نسبتاً آسان ہوگا۔ اور دوسری طرف صحیح کام کی بہ دولت ان میں وہ قوت پیدا ہو جائے گی جس سے وہ حالات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں گے۔

امراض ملی کی تشخیص

آئندہ کام اور اس کے طریق پر غور کرنے کے ضمن میں سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ ہم یہاں سب سے پہلے اپنی موجودہ حالت کا جائزہ لیں کہ ہم میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اور صحت یابی کے لیے ہمیں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ آئندہ جو کچھ ہمیں کرنا ہے اس کی حیثیت علاج و تدبیر کی ہے اور کوئی علاج و تدبیر اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ

مریض کے حالات کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے اور اس میں ان حالات کی پوری پوری رعایت مدّ نظر نہ رکھی جائے۔

ہندستان کے مسلمانوں کا حال اس وقت بعینہٖ اس مریض کا سا ہے جو پہلے سے امراض مزمنہ کا شکار رہا ہو لیکن اس کے ساتھ ہی اس پر ناگہانی طور سے کچھ نئے امراض کا حملہ ہو گیا ہو جن سے مریض کی جان کو فوری طور سے خطرہ پیش آ گیا ہو ـــــ جب کسی مریض کو ایسی حالت درپیش ہو تو اطبّاء کا فیصلہ یہ ہے کہ پہلے اس کے فوری امراض کا علاج ضروری ہوتا ہے کیوں کہ انھیں کے علاج پر مریض کی سلامتی کا دارومدار ہوتا ہے، اگر ان کو چھوڑ کر امراض مزمنہ کی طرف توجہ کی جائے تو قبل اس کے کہ اس سے کوئی نتیجہ برآمد ہو یہ فوری امراض اس کو موت کی آغوش میں پہنچا دیں گے اور علاج ودوا کا سوال ہی سرے سے ختم ہو جائے گا۔ بنابریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسلمانوں کے ان امراض کا جائزہ لیا جائے جو تقسیم کے بعد یا اس کے نتیجے میں فوری طور سے ان کو پیش آ گئے ہیں اور جو اپنی نوعیت میں اتنے شدید ہیں کہ اگر بروقت ان کا کوئی علاج نہیں ہو سکا تو خدانہ خواستہ یہ قوم تھوڑے ہی دنوں میں دم توڑ دے گی اور پھر آنسو بہانے کے سوا اور کچھ کرنا ممکن نہ رہے گا۔

[۱] غلبۂ یاس

تقسیم کے بعد سب سے بڑا مرض جو مسلمانوں کو لاحق ہوا ہے اور جس کی بنا پر ان کا مستقبل نہایت تیرہ وتار نظر آ رہا ہے وہ غلبۂ یاس ہے، جس میں کم وبیش ہر شخص حتیٰ کہ اس قوم کے رہنما اور معالجین تک بھی مبتلا ہیں۔ مسلمانوں کو اپنی طویل تاریخ میں بارہا نہایت ہولناک اور زہرہ گداز واقعات وحوادث سے دوچار ہونا پڑا ہے، خود ہندستان میں بھی تقسیم سے پہلے بڑے بڑے قومی وملی سانحات ان کو پیش آ چکے ہیں جن میں ۱۸۵۷ء کا وہ انقلابِ عظیم بھی داخل ہے جو اپنے اثرات ونتائج کی ہولناکی کے اعتبار سے قیامت صغریٰ کہا جاتا ہے۔ لیکن ان واقعات و حوادث کو مسلمانوں نے جس صبر وتحمل کے ساتھ برداشت کیا تھا آج اس کے بالکل ہی برعکس ان کا

حال یہ ہو رہا ہے کہ گویا ان کی کمرِ ہمت بالکل ٹوٹ چکی ہے اور حالات و واقعات نے ان کو اتنا حواس باختہ کر دیا ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹنے پر آمادہ ہیں۔

یاس و ناامیدی کی اس حالت کا وہ کیوں شکار ہوئے ہیں؟ یہ ایک طولانی داستان ہے جس پر اس وقت تفصیل سے گفتگو کا موقع نہیں ہے، لیکن اس مرض کی صحیح کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے اسباب کو سامنے رکھنا ایک حد تک ضروری ہے اِس لیے ہم اختصار کے ساتھ اس پر کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

جس طرح مسلمانوں کو دو طرح کے امراض در پیش ہیں، مستقل و غیر مستقل یا مزمن و عارضی، اسی طرح ان کے ہر مرض کے پیدا ہونے کے اسباب بھی دو طرح کے ہیں: مستقل اور عارضی۔

سب سے پہلے عارضی اسباب پر غور کیجیے۔

(۱) ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مسلمانوں کو جس وسیع پیمانے پر لوٹا مارا گیا اور جس جس طرح ان کو ذلیل و رسوا کیا گیا اس نے مسلمانوں کے دلوں میں ایسی دہشت و ہیبت طاری کر دی ہے کہ کئی سال گزرنے پر بھی اس کا تصور کرنے سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ فسادات ملک کے ایک وسیع خطے میں رونما ہوئے تھے اس لیے کتنوں نے اپنی آنکھوں سے مظلوموں اور بے کسوں کو قتل ہوتے اور عفت مآب خواتین کی عصمتوں کو سرِ بازار لٹتے ہوئے دیکھا تھا اس لیے یہ مناظر برابر ان کی نگاہوں کے سامنے رہتے ہیں اور جنھوں نے یہ مناظر بہ چشم خود نہیں دیکھے تھے اُنھوں نے اس کی الم ناک داستانیں معتبر ذرائع سے سنی تھیں، اس لیے وہ بھی کم و بیش ان سے اُنہی کی طرح متاثر ہیں۔ ممکن ہے مرورِ ایام سے ان کا زخم مندمل ہو جاتا اور حالات و واقعات پر وہ مایوسی کی بہ جائے پُر امید نقطۂ نظر سے غور کر سکتے لیکن بد قسمتی سے ان فسادات کے بعد بھی فسادات کا سلسلہ کلیتاً منقطع نہیں ہو سکا ہے۔ حکومت کی ہر طرح کی کوششوں کے باوجود آئے دن کہیں نہ کہیں یہ فتنہ سر اٹھاتا ہی رہتا ہے اور اس وقت تک نہیں ٹلتا جب تک کہ کچھ مسلمانوں کی جان اس کی بھینٹ نہیں چڑھ جاتی اور بسا اوقات تو یہ فتنہ بالکل بے وجہ محض پاکستان کے کسی رویہ کے ردّعمل کے طور پر رونما ہوتا ہے، جس کی وجہ سے یہ بات مسلمانوں کے

دلوں میں گھر کرگئی ہے کہ وہ اپنی ہی کرنی کے ذمے دار نہیں ہیں بلکہ ان کو دوسروں کے کیے کا بھی خمیازہ بھگتنا ہے اور اسی کے ساتھ جب وہ ان کوششوں کا جائزہ لیتے ہیں جو اس صورتِ حال کی تبدیلی کے لیے عمل میں لائی جارہی ہیں تو اس کے نتائج بھی ان کے لیے مایوس کن ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں کے خصوصی حالات میں ان کی امیدوں کا مرکز گاندھی جی کی شخصیت تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ تقسیم کے بعد انھوں نے بڑی ہمت وجرأت کے ساتھ مسلمانوں کی مدافعت کا کام انجام دیا تھا لیکن یہ شخصیت بھی اب ان کے درمیان باقی نہیں رہ گئی اور یہ بات ان کے لیے خاص طور سے حوصلہ شکن ثابت ہوئی کہ وہ انہی کی حمایت کی پاداش میں گولیوں کا نشانہ بنے۔ ان کے بعد ان کو ان لوگوں سے اپنی حمایت ودست گیری کی توقع ہوسکتی تھی جو گاندھی جی اور ان کے اصولوں کا نام لیے بغیر روٹی کا ٹکڑا بھی نہیں توڑتے لیکن پچھلے دنوں جو کچھ ان کی طرف سے رونما ہو چکا ہے اس نے ان کی طرف سے بھی ان کو مایوس اور بددل کردیا ہے اور اس وقت کانگریس میں جو شدید اختلافات رونما ہو چکے ہیں اور ان اختلافات کی تہ میں جو بنیادی مسئلہ کارفرما ہے اور ان اختلافات میں کانگریس کی اکثریت جس رُخ پر جانا چاہتی ہے اس کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنا مستقبل بھی بہت تیرہ وتار نظر آتا ہے۔ اور بہت سے لوگ تو ایسے ہیں کہ ان کا اعتماد نہ صرف اپنے مستقبل کی طرف سے اٹھتا جارہا ہے بلکہ وہ بہ حیثیت مجموعی انسانیت کے مستقبل سے بھی مایوس ہوچکے ہیں، ان کا خیال یہ ہوتا جارہا ہے کہ انسان محض شرارت وکمینگی کا پتلا ہے، اس سے کسی خیر کی توقع ہی نہیں رکھی جاسکتی اور اگر اس کے خلاف کوئی بات پائی جاتی ہے تو وہ کسی نہ کسی مجبوری کا نتیجہ ہے اس لیے وہ لائق اعتبار نہیں ہے۔ غرض وہ ایک جاہلی شاعر کے بہ قول:

اظلم من شیم النفوس فان تجد ذاعِفّة فسلعته لا یظلم

کے قائل ہوگئے ہیں۔

(۲) یاس وناامیدی کا دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ فسادات اور ان کے ہمہ وقتی اندیشوں کے ساتھ ان کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اور تقریباً اس کے تمام شعبوں میں سخت ترین مشکلات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ نئی ملازمتوں کے دروازے ان کے لیے تقریباً بند ہو چکے ہیں اور جو پُرانے

ملازمین ہیں وہ مختلف حیلوں بہانوں سے نکالے جارہے ہیں۔ تجارت میں مسلمان پہلے سے ہی پیچھے تھے کیوں کہ ان کے پاس سرمایہ کی ہمیشہ کمی رہی ہے اور اب تو حالت یہ ہورہی ہے کہ جن مسلمانوں کے پاس کچھ سرمایہ ہے بھی وہ اپنے غیر یقینی مستقبل کے پیش نظر اسے تجارت میں لگانے سے ہچکچاتے ہیں اور ان میں کتنے تو پاکستان جاچکے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کا رویہ ان کے ساتھ نہایت متعصّبانہ ہے جو تجارت میں ان کو آگے بڑھنے نہیں دیتا، ان کا ایک بڑا طبقہ زمین دار وغیرہ کے ذریعہ اپنی روزی حاصل کیا کرتا تھا لیکن اس کا بدلہ پائے بغیر وہ اس ذریعے سے بھی محروم ہوگئے ہیں اور اس طرح وسائل معاش سے وہ محروم ہوکر موت و زندگی کی شدید ترین کش مکش میں مبتلا ہوگئے ہیں۔

ایک طرف یہ پریشانیاں ہیں، دوسری طرف ان سے بھی زیادہ شدید پریشانی ان کو یہ درپیش ہے کہ مسلمان چاہے ایمان و اسلام سے واقف ہو یا نہ ہو لیکن اس کے ساتھ بالکل غیر شعوری طریقہ سے ایک والہانہ محبت وعقیدت کا جذبہ ہمیشہ اس کے دل میں موجزن رہا ہے لیکن آج اس کے اس جذبہ کو قصداً و بلا قصد طرح طرح سے مجروح کیا جارہا ہے، ملک کے بڑے بڑے لیڈر یہاں تک کہ کانگریس کے بہت سے اعلیٰ ذمے دار حضرات تک بھی علانیہ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو ہندستان میں رہنا ہے تو اس کی واحد شکل یہ ہے کہ وہ یہاں ہندو بن کر رہیں۔ وہ قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔

وشوا تہاس کی روپ ریکھا، پرارمبھک وشو کا اتہاس، سنسار کے اتہاس کی روپ ریکھا، سنسار کا سرل اتہاس، وشو پر یچے اور جے ہند جیسی کتابیں شائع ہوتی ہیں بلکہ ان میں سے متعدد نصابِ تعلیم میں داخل کرلی گئی ہیں اور خود مسلمانوں کو ان کے پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اگر مسلمان اس پر احتجاج کرتے ہیں تو اس کے بعد بھی اس کے لکھنے والوں اور چھاپنے والوں سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی زیادہ سے زیادہ اس کے نصاب سے خارج کرنے کا اعلان کردیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد بھی بہت سے مقامات پر وہ بہ دستور پڑھی پڑھائی جاتی ہیں اور اس کے برعکس اگر کوئی مسلمان اسی انداز کی کوئی چیز لکھ دیتا ہے تو قانون کی مشنری فوراً حرکت میں آجاتی ہے اور

اس کو جیل بجھوائے بغیر نہیں رکتی جیسا کہ اخبار شحنۂ شریعت کے ضمن میں پیش آچکا ہے۔ سیکولرزم کے نام پر مسلمانوں کو تو دینی تعلیم و تربیت سے ہر طرح روکنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن خود سرکاری مدارس میں وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں کھلم کھلا ہندو مذہب وروایات کا پرچار کیا گیا ہے جن کے پڑھنے کے بعد مسلمان بچوں کا آیندہ مسلمان باقی رہنا ناممکن نظر آتا ہے۔ غرض ہندستان میں مسلمان اپنے کو اپنے مذہب کی طرف سے بھی سخت خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے اور یہ پریشانی اس کی تمام پریشانیوں میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ اور اس پہلو سے اسے اپنے مستقبل کی طرف سے بھی سخت ترین مایوسی لاحق ہے کیوں کہ ملک میں ایسی تحریکات روز بہ روز طاقت پکڑتی جارہی ہیں جن کا اولین مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلام اور اسلامی تہذیب سے الگ کرکے ہندوازم کا جز بنالیا جائے۔ ہندومہا سبھا، راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ، رام راجیہ پریشد، بھارتیہ جن سنگھ اور اسی طرز کی کتنی پارٹیاں ہیں جن کے عزائم میں بنیادی طور سے یہی باتیں داخل ہیں اور خود کانگریس کے معدودے چند چوٹی کے لیڈروں کے سوا اس کی اکثریت کے رجحانات و جذبات بھی قریب قریب اسی طرح کے ہیں۔ ان باتوں کو مسلمان علانیہ طور سے ہوتے دیکھتا ہے اور پھر وہ اپنی حیثیت پر نگاہ ڈالتا ہے تو عجز و بے بسی کی تصویر اس کی نگاہوں میں پھرنے لگتی ہے۔ مجبوراً وہ اپنے کو مایوسی کی آغوش کے سپرد کردیتا ہے۔

(۳) یہ حالات جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے، ممکن ہے عام حالات میں ان کا ردِّعمل اتنا شدید نہ ہوتا لیکن دو باتوں نے ان کے اثرات کو زیادہ وسیع اور بھیانک بنادیا ہے۔

(الف) مسلمان تقسیم سے چند روز پہلے تک اپنے حال و مستقبل کے بارے میں انتہائی پُرامید اور خوش گمان تھے اور یہ ہر شخص جانتا ہے کہ امیدوں کے ٹوٹنے کا صدمہ کتنا شدید ہوتا ہے۔

(ب) یہ جو کچھ انھیں آج پیش آرہا ہے پہلے کبھی بھولے سے بھی اس کا خطرہ ان کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ آدمی اگر کسی پیش آنے والی مصیبت کے مقابلے کے لیے پہلے سے کم از کم ذہنی حد تک تیار نہ ہو تو وہ دفعۃً پیش آکر اس کو سخت ترین گھبراہٹ میں مبتلا کردیتی ہے اور جب اس سے نبٹنے کے لیے وہ کوئی چارہ کار نہیں پاتا ہے تو پھر

بہت جلد مایوسی کے کنارے جا لگتا ہے۔

یہی صورتِ حال مسلمانوں کو پیش آرہی ہے۔ تقسیم سے پہلے یہاں کے مسلمان عام طور سے دو گروہوں میں تقسیم تھے، وطن پرور مسلمان اور قوم پرست مسلمان۔ اور دونوں گروہوں کے لیڈروں نے اپنے بلند بانگ دعاوی کے ذریعہ مسلمانوں کو نہ صرف مستقبل کے خطرات سے غافل کر دیا تھا بلکہ اُن کو امیدوں اور آرزوؤں کی ایک نہایت خوش نما جنت میں پہنچا دیا تھا۔ پہلے گروہ کا دعویٰ یہ تھا کہ اسلام یا مسلمانوں کو جو مصیبت یا خطرہ بھی درپیش ہے وہ محض انگریزوں کی غلامی کی بدولت ہے جہاں وہ اس بند سے آزاد ہوئے، خوش بختی دوڑ کر ان کے قدم چومنے لگے گی اور دوسرا گروہ کچھ اس سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اعلان کر رہا تھا کہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی مسلمانوں کے تمام دلدّر دور ہو جائیں گے، پاکستان کے اصل باشندوں کا تو کہنا ہی کیا، وہ ہندی مسلمانوں کا بھی ملجا و ماویٰ ہوگا اور اگر وہ اپنے گھروں میں ہی رہنا چاہیں گے تو وہ ان پر اس طرح سایہ فگن ہوگا کہ کوئی ان پر ترچھی نگاہ بھی نہیں ڈال سکے گا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پاکستان کی شکل میں وہ اس چودھویں صدی میں قرن اوّل کی خلافتِ راشدہ کا نمونہ دیکھیں گے اور پھر اسلام پوری دنیا میں پھولے پھلے گا!

مسلمان اپنے لیڈروں کی یہ لن ترانیاں سنتے تھے اور سر دھنتے تھے، ان کے قدم زمین پر پڑتے ہی نہ تھے۔ تخیل کی جنت ان کا مسکن تھی، لیکن جب واقعی ان سنہری خوابوں کی تعبیر ان کے سامنے آئی تو اس وقت انھیں محسوس ہوا کہ:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

۱۵/ اگست ۱۹۴۷ کا آفتاب قریب قریب ان دونوں گروہوں کی تمناؤں کے مطابق طلوع ہوا۔ ایک طرف بھارت میں آزادی کا پرچم لہرایا، اور دوسری طرف دنیا نے پاکستان کی شکل میں ایک نئی وسیع ترین اسلامی سلطنت کے وجود میں آنے کی بشارت سنی۔ لیکن مسلمانوں کی قسمت میں اگر کچھ آیا تو یہ آیا کہ امیدوں اور آرزوؤں کے پورے ہونے کا تو سوال ہی کیا، جو خطرات ابھی وہم کے درجے میں تھے وہ عملاً ظہور میں آنے لگے۔ بلکہ بہت سے ایسے خطرات سامنے آ گئے جن کا پہلے سے انھیں کوئی وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

آزادی کا سب سے پہلا تحفہ خون خرابہ کی شکل میں ملا اور اس کے بعد اس کے جو فوائد و برکات ان کو حاصل ہو رہے ہیں، ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کی طرف سرسری اشارہ ابھی پچھلی سطروں میں گزر چکا ہے اور اگر کسی کی آنکھیں بند ہی ہوں تو وہ آزادی پسند گروہ ہی کے ایک ترجمان کے حسب ذیل فقرے سے حالات کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے جو اس نے پیغمبرِ اسلام کے بارے ایک توہین آمیز مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ''...سارا مضمون اسی دریدہ دہنی اور خرافات سے بھرا ہوا ہے، جسے پڑھ کر مسلمانوں کا خون کھولے بغیر نہیں رہ سکتا، اب ہم کیا عرض کریں!

انگریز کے دورِ میں بھی اس قسم کی شرارتیں ہوتی رہتی تھیں مگر انگریز ایسے بدمعاشوں کو سزا بھی کس کے دیا کرتا تھا، مگر اب کس کے پاس فریاد لے جائیں، اور کس امید پر! ہم کبھی نہ سنیں گے کہ اس بدہنگام اخبار پر حکومت نے مقدمہ چلایا اور اسے عبرت ناک سزا دی۔ افسوس ہے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کو یہ صلہ ملا کہ ان کا مذہب تک محفوظ نہیں اور کوئی ایسی طاقت نہیں جو ان حرکتوں کا سدِّ باب کر سکے۔'' (الجمعیۃ)

یہ سطریں آزادی خواہ گروہ کی ٹوٹی ہوئی امیدوں کے ٹکڑے ہیں۔ ان سے ان کی مایوسیوں اور ان کے احساسِ عجز و درماندگی کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہی انجام بلکہ کچھ اس سے بھی بُرا دوسرے گروہ کی توقعات اور خوش گمانیوں کا ہوا ہے۔ پاکستان جن خطرات سے تحفظ کے لیے قائم کیا گیا تھا، وہ خطرات کچھ زیادہ شدت کے ساتھ ہندی مسلمانوں کو اب بھی درپیش ہیں اور خود پاکستان کے باشندے بھی پاکستان میں رہتے ہوئے ان سے محفوظ نہیں ہیں، اور قیامِ پاکستان سے جو امیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں منتشر ہو گئی ہیں۔ نہ پاکستان ہندی مسلمانوں کو اپنے یہاں جگہ دینے کے لیے تیار ہے اور نہ کبھی کبھی زبانی ہم دردی کرنے کے سوا، جو ان کے لیے اور زیادہ مصیبتوں کا باعث ہے، وہ مشکلات و مصائب میں ان کی کوئی مدد کر سکتا ہے اور جو تھوڑے سے مہاجر زبردست تمنائیں لے کر پاکستان جا پہنچے ہیں ان میں سے ان لوگوں کو چھوڑ کر، جو خود کچھ دنیاوی جاہ و شہرت رکھتے تھے یا ایسے کسی شخص کے عزیز و رشتہ دار تھے، عام طور سے وہ اس ''جنتِ ارضی'' میں پہنچ کر بھی

پریشان و تباہ ہیں، جن کی حالت کسی پر چھپی ہوئی نہیں ہے۔ رہی اسلامی نظامِ حکومت کے قیام یا خلافتِ راشدہ کو دوبارہ دیکھنے کی تمنا، جس کی خاطر بہتوں نے اس تحریک میں حصہ لیا تھا تو آج چار سال گزرنے پر بھی وہاں انگریزوں کا مسلط کیا ہوا آئین ہی نافذ ہے اور ابھی تک وہاں کی سیاست، معاشرت، معیشت، ہر چیز احکام شریعت سے اتنی ہی دور ہے جتنی اس سے پہلے تھی بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ، جس کا عکس خود پاکستانی اخبارات کے صفحات پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، غرض دینی اور دنیاوی دونوں پہلوؤں سے مسلمانوں کی وہ تمام امیدیں خاک میں مل گئیں جو قیامِ پاکستان سے وابستہ تھیں۔ اس سے اگر ہندی مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچا ہے یا پہنچ رہا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان پہلے تحریکِ پاکستان میں اپنی سابقہ شرکت کے جرم میں اور اب اس کے ساتھ تعلق رکھنے کے خیالی اندیشے سے ملک کی اکثریت کی نگاہ میں خار بن کر کھٹک رہے ہیں اور حکومت اور عوام دونوں کی نگاہ میں سخت مشکوک اور ناقابلِ اعتبار ہیں۔ یا پھر یہ فائدہ پہنچ رہا ہے کہ یہاں کے مسلمان ہزاروں منتوں اور خوشامدوں سے یہاں کے حالات کو کچھ اپنے لیے سازگار بناتے ہیں کہ دفعتاً پاکستان اپنے کسی قول یا فعل کے ذریعہ یہاں کی اکثریت کو مشتعل و غضب ناک بنا دیتا ہے، جس کا نزلہ ان پر گرتا ہے اور اس طرح وہ، اندرو باہر اور دونوں طرف سے مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایک طرف ان حالات کو رکھیے اور دوسری طرف ان خوش گمانیوں اور آرزوؤں کو جن میں تقسیم سے پہلے مسلمان مبتلا کر دیے گئے تھے، آپ محسوس کریں گے کہ آرزوؤں کی کتنی دنیا آباد کی گئی تھی اور پھر وہ کس طرح چشم زدن میں پامال ہوگئی۔ اس کا قدرتی ردِعمل عام حالات میں یہی ہونا چاہیے کہ مسلمان شدید ترین مایوسی میں مبتلا ہو جائیں اور یہی کیفیت آج ان پر شدت کے ساتھ طاری ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ یاس و ناامیدی کے یہ چند عارضی اسباب ہیں جن کا اجمالی طور سے یہاں تذکرہ کیا گیا ہے، رہے ان کے مستقل اسباب تو وہ بیان میں تو متعدد ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک ان سب کا منبع، غلبۂ یاس ضمن میں ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ دوسرے امراض کے ضمن میں بھی جن کا تذکرہ آگے آئے گا، صرف ایک بات ہے یعنی یہ کہ پچھلے دنوں مسلمانوں کو سب کچھ بنانے کی کوشش تو کی گئی لیکن اگر نہیں کی گئی تو صرف اس بات کی کہ وہ اپنے اصل مقام کو

پہچانیں اور صحیح معنوں میں مسلمان بنیں، یہاں تک کہ جو لوگ اپنے اصل منصب کے لحاظ سے اس کام کے اصلی ذمہ دار ہیں، ان کی کوششیں بھی پچھلے دنوں بہ جائے اس کام پر مرکوز ہونے کے زیادہ تر آزادیِ وطن اور آزادیِ قوم کا درس دینے، انگریزوں یا ہندوؤں کے خطرات سے ہوشیار کرنے اور مسلمانوں کے دنیاوی مفادات کے تحفظ کے لیے سیاسی جوڑ توڑ کرنے میں صرف ہوتی رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ ایک طرف تو ان ناکامیوں کی شکل میں نمودار ہوا جن کا تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے، کیونکہ وہ کوششیں تھیں ہی غلط انداز کی، جن کا نتیجہ وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا، اور دوسری طرف ان کوششوں میں انہماک اور اصل ضرورت سے غفلت اختیار کرنے کے نتیجے میں مسلمانوں سے رفتہ رفتہ وہ بہت ساری خوبیاں بھی رخصت ہوگئیں جو سخت سے سخت ناکامیوں میں بھی ان کو ثابت قدم رکھتی رہی ہیں اور انھوں نے کبھی انھیں مایوسی کا شکار نہ ہونے دیا۔ استقلال و استقامت مسلمانوں کا ہمیشہ سے ایک خصوصی شیوۂ امتیاز رہا ہے جس کے ذریعے انھوں نے اس سے پہلے اس وقت کے مصائب و مشکلات سے بھی زیادہ بڑے قومی سانحات کا مقابلہ کیا ہے۔ لیکن یہ کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں تعلق باللہ اور اعتماد علی اللہ سے اور پچھلے دنوں میں مسلمانوں پر جو دینی انحطاط طاری ہوا ہے اس میں استقلال و استقامت کے اس حقیقی سرچشمہ سے ان کا لگاؤ کسی معقول اور مؤثر حد میں باقی نہیں رہ گیا ہے، اس لیے پچھلے اَدوار کے سانحات کے مقابلے میں کم تر درجے کے سانحات سے دوچار ہوکر بھی ان پر دل شکستگی اور مایوسی کی ایک ایسی حالت طاری ہوگئی ہے کہ وہ بہ ظاہر تو زندہ ہیں لیکن فی الواقع زندگی ان سے کوسوں دور ہے۔ پیش آمدہ مصیبتیں ان کے لیے پہاڑ ثابت ہو رہی ہیں اور دنیا ان کو بالکل تاریک دکھائی دے رہی ہے۔

[۲] عام خوف و ہراس

مسلمانوں کا دوسرا بڑا مرض ان کا خوف و ہراس ہے۔ یہ خوف و ہراس اتنی وسعت و شدت کے ساتھ پھیلا ہوا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے کو یاس و ناامیدی کا شکار ہونے سے کسی طرح بچالیا ہے وہ بھی انتہائی حد تک اس میں مبتلا ہیں۔ اور یہ حالت صرف افراد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کی بڑی بڑی جماعتیں بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں۔ ان کی طرف سے

جو اعلانات و بیانات آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں ان کی ہر ہر سطر سے ان کی یہ کیفیت نمایاں ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ کھل کر نہ اپنے حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں اور نہ ان کے لیے کوئی حل تجویز کر سکتے ہیں۔ ان کو ہر لحہ یہ خطرہ دامن گیر رہا کرتا ہے کہ ان کی وفاداری مشکوک نہ سمجھ لی جائے اور اپنے مذہب وملت کی فکر کی وجہ سے وہ فرقہ پرست نہ سمجھ لیے جائیں۔ گویا ہندستان میں اس وقت مسلمانوں کا حال اس زخمی جاں بلب شکار کی حالت کے مشابہ ہے جو اس ڈر سے ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا کہ شکاری جو ٹکٹکی باندھے اس کی حالت کو دیکھ رہا ہے، زخم کو ناکافی سمجھ کر اور زیادہ زخم نہ پہنچادے یا وہ اس توقع میں جان دینے سے پہلے جان دینے لگتا ہے کہ ممکن ہے کہ شکاری کو اس پر رحم آجائے اور وہ اس کو اسی حال میں چھوڑ دے۔ اس درجہ خوف وہراس میں مبتلا ہو جانے کے بعد مسلمان اپنے لیے تین ہی راستے کھلے ہوئے پا رہے ہیں:

(الف) پہلی قسم کے یعنی مایوس مسلمانوں میں شامل ہو کر گھروں میں بیٹھ رہیں۔

(ب) یا پاکستان میں ٹھکانے کی توقع ہو تو نقل مکانی کر کے وہاں پہنچ جائیں۔

(ج) یا ہندستان ہی میں رہیں، اور کچھ کام کرنا چاہیں تو بے جا خوشامد اور تملق کے ذریعہ اکثریت کو راضی کرنے کی کوشش کریں، خواہ اس کا نتیجہ الٹا ہی کیوں نہ نکلے اور ان کی اس روش کے نتیجے میں ان کی عزت و غیرت کے ساتھ خود اسلام اور اسلامی مفادات، ملت اور ملی عزّ و وقار کو کتنا ہی صدمہ کیوں نہ پہنچے! اور اب تو یہ خوشامد بھی ان کے ذہنی انحطاط کے ساتھ ساتھ اتنی ناعاقبت اندیشانہ ہوتی جارہی ہے کہ اس سے کسی دنیوی فائدے کی توقع بھی کم اور اس کی بجائے سراسر نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اب اکثریت کی بہ جائے وہ کسی ایک پارٹی اور پارٹی میں سے بھی صرف ایک یا چند افراد کی خوشامد میں لگ گئے ہیں، دراں حالیکہ نہ وہ پارٹی ہمیشہ برسرِ اقتدار رہنے والی ہے اور نہ وہ افراد ہمیشہ زندہ رہنے یا زندگی بھر با اقتدار رہنے کا کوئی ٹھیکہ لکھوا چکے ہیں۔

تقسیم کے بعد مسلمانوں کا اس حالت کو پہنچ جانا یقیناً تاریخ کا ایک زبردست سانحہ ہے اور اس سے جو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں ان کا ہر شخص بہ خوبی اندازہ کر سکتا ہے، یہ ان کے مستقبل کے لیے نہایت ہی بُرا شگون ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، ان میں کوئی بھی اس طرح خوف وہراس میں

مبتلا ہو کر اپنی زندگی کو زیادہ دنوں تک بچا نہیں سکتا اور کم از کم باعزت زندگی کے امکان کو تو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔ یہ دنیا کش مکش اور تصادم کا میدان ہے، اس میں ہر فرد اور ہر قوم کو موانع و مشکلات پیش آتی ہیں، لیکن جینے کا حق صرف ان کو حاصل ہوتا ہے جو صبر و ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کریں اور جو لوگ ان کو دیکھ کر گھبرا اٹھیں، وہ گویا قبل از مرگ اپنی موت کا اعلان کر دیتے ہیں، یہی کیفیت آج خوف و ہراس سے مسلمانوں کی ہو رہی ہے اور اس کے اسباب تقریباً وہی ہیں، جو اس سے پہلے غلبۂ یاس کے ضمن میں اوپر گزر چکے ہیں۔ اس لیے یہاں پھر سے ان پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

علاج وتدبیر

غرض، غلبۂ یاس اور خوف و ہراس —— یہ دوز بردست بیماریاں ہیں جو نہایت تیزی کے ساتھ مسلمانوں کو موت کے گڑھے کی طرف ڈھکیل رہی ہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے، ان کی تمام بیماریوں میں یہ سب سے پہلے توجہ کی مستحق ہیں، آیئے اب اس سوال پر غور کریں کہ آیا یہ ناقابلِ علاج امراض ہیں یا ان کا کوئی علاج ممکن ہے؟

(۱) غلبۂ یاس اور اس کا علاج

سب سے پہلے غلبۂ یاس کے مسئلہ پر غور کیجیے۔ ہم اس سے پہلے متعدد مواقع پر اس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر تفصیل کے ساتھ پیش کر چکے ہیں۔ ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ انھیں باتوں کو دوبارہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

(الف) اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ہندستان کے حالات ہزار در ہزار بگڑنے پر بھی اتنے نہیں بگڑے ہیں جتنے مایوسی کی حالت میں ہمیں نظر آ رہے ہیں۔

سب سے پہلے اس پر غور کیجیے کہ آج مسلمانوں کو یہاں جو مشکلات پیش آ رہی ہیں کیا وہ پوری ہندو قوم کی متفقہ خواہش و کوشش کا مظہر ہیں؟ عام مسلمان سب سے زیادہ لوٹ مار کے واقعات سے متاثر ہوتے ہیں، جس کا طوفان نہایت شدت کے ساتھ تقسیم کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا، اور جو اب بھی تھوڑے تھوڑے وقفوں سے چھوٹے بڑے پیمانے پر برابر اٹھتا رہتا ہے، لیکن کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ واقعات پوری ہندو قوم کی متفقہ کوشش و خواہش سے پیش آتے ہیں

یا ان کا ایک ایک فرد ان کو پسندیدہ سمجھتا ہے؟ ہمیں یہ باور کرنے سے شدت کے ساتھ انکار ہے۔ علاوہ اس بات کے کہ ایسا کہنا فطرتِ انسانی کا انکار کرنا ہے، جو ہر حال میں خیر پر مبنی ہوتی ہے اور بہ ظاہر اس بات کی کوئی علامت موجود نہیں ہے کہ اتنی بڑی قوم کی فطرت بالکلیہ مسخ ہو چکی ہو، اس کی تردید کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو تقسیم کے بعد قتل و غارت گری کا جو ہنگامہ برپا ہوا تھا اس میں کسی ایک مسلمان متنفس کا بچ رہنا ممکن نہیں تھا کیوں کہ وہ ہر طرف انھیں سے گھرے ہوئے تھے اور اس وقت نہ وہ خود اپنی حفاظت کے قابل تھے اور نہ کوئی اور ظاہری قوت ان کی پشت پناہ تھی، رہی حکومت تو وہ بہ قول آپ کے ہندو حکومت ہے اور ایسی صورت میں آپ کی حفاظت کا کام کیوں انجام دیتی! لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس، یہ فسادات ملک کے خاص حصوں تک ہی محدود رہے۔ اور ملک کی اکثریت عملاً ان سے علیٰحدہ رہی اور نہ صرف علیٰحدہ رہی بلکہ ہمارے علم میں بہ کثرت ایسے واقعات آئے ہیں کہ بسا اوقات ہندوؤں نے خود اپنے کو خطرات میں ڈال کر فسادات کو روکنے اور مظلومین کی مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور آپ یہ یقین رکھیں کہ اگر خدانخواستہ یہ ملک ایسے لوگوں سے خالی ہو جاتا اور سب کے سب ایسی ہی خون آشامی اور زبردست آزاری میں مبتلا ہو جاتے کہ مظلوموں و بے کسوں کے خون میں ہاتھ رنگین کرنے سے انھیں عار نہ ہوتا تو یہ ملک کب کا صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہوتا۔ یہ سنت اللہ کے خلاف ہے کہ کسی ملک میں فساد اس درجہ عام ہو جائے اور پھر بھی اسے جینے کی مہلت دی جائے۔ اللہ کی رحمت و شفقت اور اس کا عدل و انصاف اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتا اور تاریخ کے ہزاروں واقعات اس کے شاہد ہیں۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾ (الحج:۴۵)

''سو کتنی بستیاں ہم نے غارت کر ڈالیں در آں حالیکہ گنہ گار تھیں اب وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنوئیں نکمے پڑے ہیں اور کتنے محل گچ کاری کے۔''

اپنے قانون الٰہی کے مطابق وہ کسی ظالم بستی کو کچھ دنوں کی ڈھیل تو ضرور دے سکتا ہے لیکن وہ ہمیشہ کے لیے اس اندھیر کو گوارا نہیں کر سکتا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ (الحج:۴۸)

''اور کتنی بستیاں تھیں کہ میں نے ان کو ڈھیل دی اور وہ گنہ گار تھیں۔ پھر میں نے ان کو پکڑ لیا اور میری طرف پھر کر آنا ہے۔''

فسادات کے بعد مسلمانوں کو زیادہ شکوہ، غیر مسلموں کی متعصّبانہ ذہنیت اور طرز عمل سے ہے اور یہ شکوہ ایک حد تک بجا ہے، لیکن اگر بدگمانیوں اور مایوسیوں کے اثرات سے تھوڑی دیر کے لیے اپنے کو آزاد کر کے آپ حالات کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ فسادات کے ضمن میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ اس ضمن میں بھی صحیح ہو سکتی ہیں۔ ہر غیر مسلم یکساں طور سے مسلم دشمن نہیں ہے اور نہ سب مسلمانوں کے خلاف یکساں طور سے تعصب کا شکار ہیں۔ ان میں اب بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے اور خود ہمیں ایسے بہت سے لوگوں سے سابقہ پڑا ہے جن کے سوچنے کا انداز تعصب اور فرقہ پرستی کے اثرات سے خالی ہے اور کیوں نہ ہو، جب کہ ایک طرف اس ملک میں جو ہمیشہ سے ایک روحانی ملک رہا ہے، دھرم اور اخلاق کا تصور بالکل مٹ نہیں گیا ہے اور دوسری طرف علم کی ترقی اور آزادی اور اس کے تحفظ کی ذمہ داریوں کا احساس خود بہ خود ذہنوں میں وسعت اور فراخی پیدا کرنے کا موجب ہے اور ایسے لوگ تو بے شمار ہیں بلکہ غالب تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جو ان معاملات میں کچھ غیر جانب دار سے ہیں کیوں کہ مسائل سے براہِ راست ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے وہ ان کے اچھے بُرے اثرات سے بہت حد تک محفوظ ہیں۔ یہ لوگ وقتی طور سے ہیجان انگیز باتوں سے متاثر ہو سکتے ہیں لیکن ان کا یہ تاثر بہت عارضی ثابت ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس کے خلاف باتوں سے اثر پذیر ہونے کے لیے بھی پوری طرح آمادہ ہیں، اس عنصر کو اور اُس کی اِس حالت کو نظر انداز کر کے یہاں کے عام باشندوں کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا حالات کے صحیح اندازہ پر مبنی نہیں ہوگا۔ اس لیے ان کو نظر انداز کر کے جو مایوسانہ نقطۂ نظر قائم کر لیا گیا ہے وہ بھی پوری طرح مبنی بر واقعہ نہیں کہا جا سکتا۔

پھر اس ضمن میں ایک بات اور قابل لحاظ ہے۔ غیر مسلموں کے جس طرزِ عمل کا ہمیں شکوہ ہے وہ ہر حال میں ان کی اسلام دشمنی یا مسلم آزاری ہی کا پیدا کردہ نہیں ہے، اس میں بہت

کچھ دخل ملک کے عام اخلاقی زوال وانحطاط کو بھی ہے اور اس کا تختۂ مشق خود غیر مسلم بھی بنتے رہتے ہیں، لیکن ان کے نزدیک اس کا نام ظلم وزیادتی ہوتا ہے اور وہی چیز جب آپ کو پیش آتی ہے تو آپ اس کو عصبیت اور فرقہ پرستی وغیرہ کا نام دے دیتے ہیں۔ یہ درحقیقت آپ کی بدگمانی اور مایوسانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے اور اس چیز نے آپ کے مایوسانہ نقطۂ نظر کو اور زیادہ پختہ کر دیا ہے۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ غور کریں تو آپ کی مایوسی کے عام انداز میں یقیناً تھوڑی سی کمی واقع ہو جائے گی۔

یہ صحیح ہے کہ جو نقصان یا تکلیف پیش آتی ہے وہ بہ ہر حال اپنا اثر دکھاتی ہے، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے لیکن اس نقطۂ نظر کا یہ فائدہ ضرور محسوس ہوگا کہ آپ اس مصیبت کو تنہا اپنی مصیبت نہیں سمجھیں گے بلکہ اسے ایک عام ملکی بلکہ بین الانسانی مسئلہ سمجھیں گے، اس لیے اس سے خصوصیت کے ساتھ اپنے یا اپنی قوم کے ضمن میں بددل ومایوس نہیں ہوں گے۔

(ب) اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تعصب اور فرقہ وارانہ ذہنیت کی جو کچھ بھی نوعیت ہو، کیا وہ ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے، یا اس میں تبدیلی کا امکان ہے، اگر خدانخواستہ پہلی صورت ہے تب تو مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جائیں اور اپنے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کر لیں، لیکن اگر اس میں تبدیلی کا امکان ہے تو اس عارضی مدت کے حالات کی بنا پر مایوس ہو جانا نہایت ہی ناعاقبت اندیشانہ بات ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ اچھی یا بری کوئی ذہنیت خواہ کسی فرد کی ہو یا قوم کی، اس میں تبدیلی کا واقع ہو جانا دنیا کا کوئی نادرالوقوع واقعہ نہیں ہے، بلکہ ایسا برابر ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے اور دنیا کی پوری تاریخ درحقیقت اسی قسم کی تبدیلیوں کی ایک مسلسل داستان ہے۔ جس قوم کی بھی آپ تاریخ اٹھا کر دیکھیں، آپ اس میں مسلسل تبدیلیوں کا ثبوت پائیں گے۔ خود ہندستان بھی جس میں مختلف وجوہ سے تغیر پذیری کی صلاحیت نسبتاً کم ہے۔ اس قسم کے تغیرات سے خالی نہیں ہے۔ اس کی جو تاریخ مسلمانوں کی آمد سے پہلے رہی ہے وہ اس سے بہت مختلف ہے جو مسلمانوں کے دور میں رہی ہے اور اس کے بعد انگریزوں کی آمد نے اس دوسری تاریخ کو بھی بہت کچھ بدل دیا ہے اور اب آزادی کے بعد جو

تاریخ تیار ہو رہی ہے، وہ ان سب سے مختلف ہے۔ کہاں یہ بات کہ کسی شودر کا سایہ پڑنے سے آدمی نجس ہو جاتا ہے اور اس کے کان میں اگر وید مقدس کا کوئی کلمہ پڑ جائے تو اس میں سیسہ پلا دیا جائے اور کہاں یہ بات کہ مندروں کے دروازے ان کے لیے کھولے جا رہے ہیں، چھوت چھات قانوناً جرم قرار دی جا چکی ہے اور بہت سے نسلی اچھوت نامی گرامی پنڈتوں کے ساتھ بلکہ آگے بیٹھ کر ملک کے لیے آئین و دستور تیار کر رہے ہیں، جس میں ان کو وید اور منوسمرتی کے بہت سے احکام پر خطِ نسخ کھینچ دینے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور یہ اسی قسم کی معلوم نہیں کتنی تبدیلیاں ہیں جو برابر ہوتی رہی ہیں اور ہو رہی ہیں، جن میں ایک تازہ ترین مثال ہندو کوڈ بل بھی ہے، جس کے ذریعے ہندوؤں کی ہزاروں سال پہلے کی بہت سی بنیادی باتوں میں تبدیلی پیش نظر ہے، اس بل کا پیش ہونا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہندوؤں کے بہت سے پرانے بنیادی عقائد میں بھی زبردست تبدیلیاں واقع ہونے لگی ہیں اور امید یہ ہے کہ یہ بل مخالفتوں کے باوجود عنقریب قانون بن جائے گا جس کا اچھا یا برا ہونا تو ایک علیٰحدہ بات ہے جس سے یہاں بحث کی ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ واقعہ بہ جائے خود اس بات کا قطعی گواہ ہوگا کہ مرورِ ایام سے ہندوؤں کی پرانی ذہنیت کی جڑیں کتنی کھوکھلی ہو چکی ہیں اور یقیناً یہ ایک زبردست تبدیلی ہے۔

اور واقعہ تو یہ ہے کہ پہلے اس قسم کی تبدیلیاں بڑی دھیمی رفتار کے ساتھ واقع ہوتی تھیں اور مدتوں بعد ان کے اثرات ظاہر ہوا کرتے تھے، لیکن اس زمانہ میں تیز اور شریع الاثر عواملِ تاثیر، ریڈیو، اخبارات اور پروپیگنڈے کے دوسرے ذرائع جو وجود میں آ گئے ہیں ان کے ذریعے بڑی بڑی تبدیلیاں آناً فاناً واقع ہو جایا کرتی ہیں جن کو دیکھ کر بسا اوقات آدمی محوِ حیرت ہو کر رہ جاتا ہے، ابھی گزشتہ جنگِ عظیم کے دوران میں اس طرح کے کتنے عجوبے رونما ہو چکے ہیں۔ روس و جرمنی کے اتحاد کا کس کو گمان ہو سکتا تھا جب کہ ہٹلر نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں روس اور روسی لیڈروں کے خلاف سخت زہر افشانی سے کام لیا تھا، لیکن دفعتاً ایک دن دنیا یہ سن کر حیران ہو گئی کہ ہٹلر اور اسٹالن گلے مل رہے ہیں اور اس کے بعد آناً فاناً دونوں ملکوں کے باشندوں میں خلوص و محبت کے تعلقات قائم ہو گئے، جس پر برطانیہ و فرانس عش عش کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ابھی اس واقعہ کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ دنیا نے اس سے بھی زیادہ عجوبہ زا یہ خبر سنی کہ یہ دونوں

دوست میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف ہیں۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات اگر آپ نگاہ میں رکھیں تو اس سے آپ اس نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ کسی قوم یا ملک کی کوئی ذہنی یا مزاجی کیفیت ایسی نہیں ہے، جو ہمیشہ باقی رہ سکے، بلکہ اس میں اسباب وعوامل کے تحت اچھی، یا بری تبدیلیاں ہمیشہ واقع ہوتی رہتی ہیں اور واقع ہوسکتی ہیں۔

خود ہندستان میں خاص ہندو مسلم تعلقات کے ضمن میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے ادوار بار ہا گزر چکے ہیں، ماضی بعید میں یہ قومیں باہم کس طرح رہتی تھیں یہ جاننے کے لیے تو آپ کو تاریخ کی ورق گردانی کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن اتنی بات تو بہت سے لوگ محض اپنے حافظہ پر زور ڈال کر معلوم کرا سکتے ہیں کہ اسی ہندستان میں جہاں مسلم و غیر مسلم کش مکش اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ ان کے لیے بھلے مانسوں کی طرح ایک ساتھ رہنا ناممکن ہوگیا اور مجبوراً ملک کے دو ٹکڑے کرنے پڑے اور اس پر بھی ان کی باہمی رنجشیں اور عداوتیں دور نہیں ہوئیں اور وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کے لیے آمادہ کھڑے ہیں، وہیں کبھی چشم فلک نے ان کے باہمی اتحاد و اعتماد کی یہ کیفیت بھی دیکھی ہے کہ جامع مسجد دہلی کے منبر سے غیر مسلم تقریر کر رہے ہیں اور مسلمان نہایت ذوق وشوق کے ساتھ سنتے اور سر دھنتے ہیں، یا خلافت کے نام پر جلسے ہو رہے ہیں اور ہندو ان میں شریک ہوتے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر انہی کی طرح اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اور خیر یہ باتیں تو پھر بھی پرانی ہو چکی ہیں یہ اب کسے یاد رہی ہوں گی لیکن نہرو لیاقت پیکٹ کا واقعہ تو ابھی تھوڑے ہی دنوں کا واقعہ ہے، کیا اس کا یہ اثر نہیں ہوا تھا کہ بہ قول دونوں ملکوں کے وزیر اعظموں کے جنگ سر پر آ کھڑی ہوئی تھی لیکن اس پیکٹ نے آناً فاناً فضا بدل دی۔ نہ صرف جنگ ٹل گئی بلکہ دونوں ملکوں میں ایک خاص طرح کے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے جو دوسرے متعدد دوستانہ معاہدات کا پیش خیمہ ثابت ہوئے جن سے دونوں ملکوں کو فائدہ پہنچا۔

غرض یہ کہ قوموں کی اچھی یا بُری کوئی بھی ذہنی کیفیت ایسی نہیں ہے جو ہمیشہ ایک حال پر قائم رہ سکے۔ اس میں عوامل و اسباب کے تحت تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں اور واقع ہوسکتی ہیں اس لیے مسلمانوں کے ضمن میں اس وقت غیر مسلموں کی جو ذہنیت اور طرز عمل ہے اس سے مایوس ہوجانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں از خود بھی تبدیلیاں واقع ہوسکتی ہیں

کیوں کہ اس کے اسباب موجود ہیں اور اگر مسلمان چاہیں تو وہ اپنی حسن تدبیر سے ان حالات کو بہت کچھ بدل سکتے ہیں۔

ازخود واقع ہونے والی تبدیلیاں

پہلے ازخود واقع ہونے والی تبدیلیوں کے اسباب کا جائزہ لیجیے۔

غیر مسلموں کی متعصّبانہ ذہنیت جس کے آپ شاکی ہیں وہ ازخود پیدا نہیں ہوگئی ہے بلکہ اس کے کچھ متعین اسباب ہیں اور یہ اسباب اب رفع ہو رہے ہیں یا مستقبل میں ان کا رفع ہو جانا اغلب ہے۔

(۱) اسباب تعصب کے ضمن میں اولین مقام مسلمانوں کی اس تاریخی حیثیت کو حاصل رہا ہے کہ وہ ایک عرصہ تک اس ملک کے حکم راں رہے ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے طویل دور حکومت میں بہت سی ایسی باتیں ظہور میں آئی ہیں جن سے غیر مسلموں کے دلوں میں بے رنگی یا نفرت کے جذبات پیدا ہوئے ہیں اور اس کے بعد جب ان کی یہ حیثیت بدل گئی یعنی وہ حاکم کی بہ جائے محکوم بن گئے تو اس وقت بھی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے مسلمان اپنے حقوق کے سلسلے میں غیر مسلموں کے ساتھ جو کش مکش کرتے رہے اور اس سلسلے میں ابتداءً یا جواب الجواب کے طور پر وہ جو طریقے اختیار کرتے رہے وہ عام طور سے غیر مسلموں کے لیے ناگوار اور ناپسندیدہ تھے جس کی بنا پر پچھلی شکایتیں کم ہونے کے بہ جائے اور زیادہ بڑھتی چلی گئیں یہاں تک کہ یہ واقعہ ہے کہ غیر مسلموں کا ایک بڑا طبقہ ہمیشہ مسلمانوں کو اپنا انگریزوں سے بھی بڑا دشمن سمجھتا رہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے وہ برابر ان کو نقصان پہنچانے کے بھی درپے رہا کیا ہے۔

لیکن جہاں تک اس سبب کا تعلق ہے تقسیم ہند کے بعد یہ خود بہ خود ختم ہوگیا ہے۔ ہندستان میں جو مسلمان رہ گئے ہیں وہ ایک طرف جسدِ ملت کے طاقت ور حصہ سے کٹ جانے کی بنا پر اور دوسری طرف زبردست وطاقت ور اور ساتھ ہی بدگمان اور ایک حد تک مشتعل اکثریت کے رحم وکرم پر آجانے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہے ہیں کہ وہ اکثریت کے ساتھ کسی طرح کی کش مکش کر سکیں، حالات نے اُن کو اس درجہ شکستہ خاطر بلکہ بزدل اور نکما بنادیا ہے کہ ان میں اب

اپنے جائز حقوق کے مطالبہ کی بھی ہمت باقی نہیں رہ گئی ہے، جس کا خود غیر مسلموں تک کو بھی احساس ہے اور ان میں بہتوں کو ان کی اس حالت پر اب ترس بھی آنے لگا ہے۔ اس حالت کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ مسلمان قومی کش مکش کے مواقع سے خود بہ خود الگ ہوتے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ جن لوگوں کی زندگیاں اب تک سیاست ہی کے کوچوں میں بسر ہوئی ہیں وہ بھی اب اپنی اور مسلمانوں کی خیریت اسی میں دیکھتے ہیں کہ عملاً اس سے علیٰحدہ رہنے کا اعلان کر دیں اور اگر ابھی کچھ لوگ ایسے باقی ہیں جن کا پرانا ذوق، سیاست کی گلی کا طواف کرنے پر انھیں مجبور کر رہا ہے تو یہ شوق چند روزہ ہے، اس راہ کی رسوائیاں بہت جلد ان کے شوق کو ٹھنڈا کر دیں گی، یا اگر وہ اس میں زیادہ پختہ ثابت ہوئے تو پھر یا تو وہ اپنا رشتہ مسلمانوں سے منقطع کر کے جو کھیل چاہیں گے کھیلیں گے یا پھر اپنے اس شوق میں منفرد ہو کر رہ جائیں گے مسلمان تو شاید ان پر ترس کھانے کے لیے بھی نگاہ ڈالنا گوارہ نہ کریں الّا یہ کہ وہ بھی خدانخواستہ یہ طے کر لیں کہ انھیں ہندستان میں مسلمان بن کر عزّت کے ساتھ رہنا نہیں ہے اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے وجود کو برباد کرنا ہے، ہاں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان اپنے وجود یا اپنے طرز عمل کے ذریعے قومی کش مکش کے باقی رہنے کا ایک بڑا سبب بن سکتا ہے، کیوں کہ بدقسمتی سے پاکستان جس غرض کے لیے حاصل کیا گیا تھا تا حال وہ غرض پوری نہیں ہو سکی ہے۔ یعنی عملاً وہ ایک اصولی اسلامی اسٹیٹ کی بہ جائے اب تک ایک قومی اسٹیٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس سے بہت سی ایسی حرکتیں قوم پرستانہ نقطۂ نظر کے تحت سرزد ہو سکتی ہیں جو دوسری قوموں کے لیے قوم پرستانہ نقطۂ نظر سے قابل شکایت ہوں اور اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندستان میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جن کے لیے پاکستان کا وجود ہی ایک ناقابل برداشت صدمہ ہے جس کا غصہ وہ یہاں کے مسلمانوں پر نکالنا اپنے لیے ہر طرح جائز سمجھتے ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد تو ان سے بھی زیادہ ہے جو کسی وقتی غصہ کے وقت پاکستان کے کسی فعل کا انتقام یہاں کے مسلمانوں سے لینے لگتے ہیں یا اس ردعمل کی ہمت افزائی کرتے اور اس کو پسند کرتے ہیں۔

لیکن حالات کی جو رفتار ہے اس میں اگر پاکستان یا خود ہندستانی مسلمانوں کی حماقتوں نے کوئی روڑا نہ اٹکایا تو آپ یقین رکھیں کہ یہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔

تقسیم یہاں کے بہت سے غیر مسلموں کے لیے کتنا ہی بڑا تکلیف دہ واقعہ کیوں نہ ہو وہ بہ ہر حال ان کی بڑی بڑی جماعتوں کی رضا مندی سے وجود میں آئی ہے اور شروع شروع میں اس کا صدمہ کتنا ہی ناقابلِ برداشت کیوں نہ رہا ہو لیکن یہ زخم زیادہ دنوں تک ہرا نہیں رہ سکتا مرور ایام اور کہنگی خود اس کے اندمال کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور مستقبل کی مایوسیاں بھی اس میں بہت کچھ معاون ثابت ہوں گی کیوں کہ پاکستان اب ایک واقعہ بن چکا ہے اس کو بدلنے کے دو ہی ذریعے ہو سکتے ہیں، جنگ یا دوستی اور بہ حالت موجودہ نہ وہ دوستی ممکن ہے جو دونوں ملکوں کو اکھنڈ ہو جانے پر راضی کر دے اور نہ اکھنڈ بھارت کے حامی یہ حوصلہ کر سکتے ہیں کہ بہ زور شمشیر اپنا یہ خواب پورا کرنے کی کوشش کریں اس لیے الیکشن جیتنے کے لیے تو اس کے نعرے ضرور لگائے جا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے کسی سنجیدہ کوشش کا امکان جوش و خروش کے ٹھنڈے پڑنے کے ساتھ ساتھ خود بہ خود ختم ہوتا جا رہا ہے اس لیے جو لوگ اب تک اس کے قیام کو ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے وہ بھی رفتہ رفتہ اس کے لیے تیار ہوتے جا رہے ہیں۔ مسٹر ٹنڈن نے ابھی حال میں کھل کر اعلان کیا ہے کہ انھوں نے اس واقعہ کو واقعہ کے طور پر تسلیم کر لیا ہے، حد یہ ہے کہ ہندو مہا سبھا جو دن رات اکھنڈ بھارت کا نام لیتے نہیں تھکتی، یہاں تک کہ اس نے اس کو اپنے الیکشن کے منشور کا ایک اہم جز بنا لیا ہے اس نے بھی اپنے سابقہ اعلان میں اتنی تبدیلی کر لی ہے کہ آئینی ذرائع سے وہ اپنا یہ خواب پورا کرنا چاہتی ہے۔ رہے عوام الناس تو ان کو اب تقسیم یا عدم تقسیم سے کوئی خاص دل چسپی نہیں ہے، ان کے نزدیک جو ہو چکا ہو چکا، اب اس کی کرید سے کوئی فائدہ نہیں۔ ملک میں جو طرح طرح کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں وہ کیا کم ہیں کہ وہ اپنی توجہ اس طرح کے مسئلوں میں الجھائیں جن کے ساتھ جنگ و خلفشار کا تصور بندھا ہوا ہے۔

رہی یہ بات کہ تقسیم جو ثالث بالخیر کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے اس لیے جان بوجھ کر بعض مسائل اس طرح طے کیے گئے ہیں کہ وہ ہمیشہ ان دونوں ملکوں کے درمیان وجہ اختلاف بنے رہیں، مثلاً نہری پانی کا مسئلہ یا سرحدات کی غلط تقسیم، جن کا ایک شاخسانہ کشمیر کا جھگڑا بھی ہے، یا یہ بات کہ تقسیم کے نتیجے میں لاکھوں افراد تباہ و برباد یا منتشر ہو گئے ہیں اور دونوں ملکوں کی

انتہائی کوششوں کے باوجود ان کو ابھی تک سکون کی زندگی میسر نہیں آسکی ہے اور اس طرح وہ اب تک ان دونوں ملکوں کے تعلقات پر ایک زبردست بار بلکہ ان کے لیے ایک سخت خطرہ بنے ہوئے ہیں تو اس شبہ نہیں کہ یہ مسائل اپنی اپنی جگہ بہت اہم اور خطرناک ہیں لیکن یہ یقینی بات ہے کہ یہ مسائل زود یا بدیر کسی نہ کسی شکل میں طے ہو کر رہیں گے کیوں کہ ان مسائل کا لاینحل رہنا دونوں ہی کے مستقبل کے لیے ان کے حل کا قطعی ذریعہ جنگ نہیں ہے کیوں کہ جنگ دونوں ہی کو تباہ و برباد کردے گی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے ان کی آزادی اور وجود بھی خطرہ میں پڑ جائیں اس لیے گو یہ ممکن ہے کہ وقتاً فوقتاً کسی گراہم کی آمد پر جنگ کے نعروں سے فضا گونج اُٹھے یا کسی خاص مہم کو سر کرنے کے لیے جنگ کے خطرے کی سی حالت پیدا کرلی جائے لیکن دونوں ملکوں کے لیڈر اتنے احمق نہیں ہوسکتے کہ وہ ان مسائل کو باہمی گفت وشنید یا ثالث کے ذریعے طے کرانے کی بہ جائے ان کا حل آخری چارہ کار یعنی جنگ کے ذریعے تلاش کرلیں۔ صلح کے فوائد جنگ کی تباہ کاریوں کے مقابلے میں بہ ہر صورت قابل ترجیح ہیں جو ممکن ہے جوش وتعصب کی حالت میں کسی کو نظر نہ آسکیں لیکن کوئی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان ان کو نظر انداز نہیں کرسکتا اور ہمارا تو خیال یہ ہے کہ آج ہندستان میں جو لوگ بڑھ بڑھ کر جنگ کی باتیں کررہے ہیں کل اگر انھیں کو پنڈت نہرو کی جگہ سنبھالنی پڑے تو وہ اپنی آج کی یہ باتیں بھول جائیں گے اور وہ بھی انہی کے انداز کی باتیں کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ بہ ہر حال تلخی وتعصب کا وہ پہلا سبب جس کا ذکر شروع میں کیا گیا ہے وہ تقسیم کے بعد اب بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے اور اگر اس کی کچھ اہمیت ابھی باقی ہے بھی تو وہ ہرگز زیادہ دنوں تک باقی رہنے والی نہیں ہے۔

(۲) دوسرا سبب انگریزی حکومت کی وہ نفرت انگیز پالیسی ہے جسے اس نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر یہاں اختیار کر رکھا تھا اور جس پر وہ اپنے پورے دور حکومت میں پوری مستعدی اور حکمت کے ساتھ عمل پیرا رہی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی خاطر اس نے مسلمانوں کے دور حکومت کی گزشتہ تاریخ کو بھی نہایت درجہ مسخ کرکے پیش کیا ہے تاکہ یہ قومیں کبھی ایک دوسرے کے قریب نہ آسکیں۔ لیکن خوش قسمتی سے اب یہ سبب بھی رخصت ہوگیا ہے اور اب یہاں کے اندرونی درو بست سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا ہے بس زیادہ سے زیادہ وہ یہاں

کے خارجی امور و معاملات پر اپنا اثر جمانے کی فکر میں ہیں۔ لیکن یہ راستہ بھی بند ہوتا جا رہا ہے اور ہندستان خود اپنے ملکی مفاد کی خاطر بالکلیہ ان کی دسترس سے آزاد رہنے کے لیے کوشاں ہے، البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو یک گونہ اندیشہ کی موجب ہو سکتی ہے اور وہ ہے ان کا چھوڑا ہوا ترکہ یعنی ان کے طویل دور حکومت کی تفریق انگیز پالیسی کے اثرات، لیکن اب جب کہ انگریز یہاں سے رخصت ہو چکے ہیں یہ اثرات زیادہ دنوں تک اپنا اثر نہیں دکھا سکتے۔ جب جڑ ہی غائب ہو جائے تو شاخیں کب تک تروتازہ رہ سکتی ہیں۔

وکم قدر أینا فروع کثیرۃٍ تموت اذالم تحیھن اصولٗ

اور اب تو ملک میں بہت سے ایسے رجحانات کام کر رہے ہیں جو گو بہ جائے خود کتنے ہی مفسدہ انگیز ہوں لیکن جہاں تک انگریزوں کے چھوڑے ہوئے اثرات کا تعلق ہے وہ ان کے ختم کرنے کے موجب ہو سکتے ہیں، مثلاً ملک میں جو اشتراکی خیال کے لوگ ہیں وہ نہ صرف اس وقت کے ہندو مسلم سوال کو معدوم کر دینا چاہتے ہیں بلکہ وہ گزشتہ دور کے متعلق بھی اس نظریہ کا پرچار کر رہے ہیں کہ ہندستان میں کبھی ہندو مسلم کش مکش رہی ہی نہیں ہے، جو چیزیں اس نام سے پیش کی جا رہی ہیں وہ محض امیروں اور غریبوں کی کش مکش تھی جن کا رشتہ خواہ مخواہ مذہب یا قوم سے جوڑ دیا گیا ہے۔ بہت سے لوگ کچھ دوسرے جذبات کے تحت یہ ثابت کرنے کے درپے ہیں کہ ہندو اور مسلمان جن مذہبوں کے ماننے والے ہیں وہ اصلاً ایک ہیں اور ان دونوں کا کلچر بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اس لیے یہاں ہندو اور مسلمان ہمیشہ شیر و شکر ہو کر رہتے رہے ہیں اور اگر کچھ اس میں فرق آیا ہے تو انگریز اس کے موجب رہے ہیں۔ غرض یہ دونوں گروہ دو مختلف زاویہ نگاہ سے تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن یہ دونوں اس بات میں مشترک ہیں کہ انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو'' کی پالیسی نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ ان دو گروہوں کے علاوہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے، گو ان کی تعداد کتنی ہی تھوڑی کیوں نہ ہو جو واقعات کو ان کی اصل شکل میں پیش کر دینے کا حامی ہے جو فی الواقع واقعہ نگاری کا اصل منشا ہے اور ساتھ ہی وہ اپنی نیک نیتی اور نیک طینتی کی بنا پر اس بات کا بھی خواہش مند ہے کہ یہ بیانِ واقعات خواہ مخواہ تلخی و کدورت کا موجب ثابت نہ ہو اس لیے ان کا قلم بہت احتیاط سے اٹھتا ہے۔ ان لوگوں کی کوششیں بھی انگریزوں کے اثرات کے

دفعیہ میں مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ انگریزی دور حکومت کے جو اثرات گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں پھیلے اور مستحکم ہوئے ہیں وہ آناً فاناً ختم نہیں ہوسکتے اسی لیے مذکورۂ بالا گروہوں کے ساتھ ایک ایسا گروہ بھی نظر آتا ہے جو انگریزوں کے ایک ایک ترکہ کو سعادت مند اولاد کی طرح سینوں سے چمٹائے رکھنا چاہتا ہے۔ یہ لوگ یقیناً گزشتہ تلخیوں کو ہوا دینا چاہتے ہیں اور مزید تلخیاں پیدا کرنے کے درپے ہیں لیکن جو مؤثر عوامل حالات میں تبدیلی کے خواہاں ہیں ان کے سامنے یہ گروہ یا تو ہتھیار ڈال دے گا یا اتنا بے اثر ہوجائے گا کہ ان سے آئندہ مسلمان کچھ زیادہ خطرہ محسوس نہ کریں گے اور اس بارے میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد چیز مسلمانوں کی خود اپنی کوششیں ہوں گی جن کا ذکر بعد کو آنے والا ہے۔

(۳) تیسرا خاص سبب جس نے غیر مسلموں کے رویہ کو مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ مخالفانہ اور معاندانہ بنا دیا ہے وہ وہ قوم پرستی اور وطن پرستی ہے جو جدید تعلیم وتہذیب کی بدولت ہندستان میں عام ہوئی ہے اور سچ یہ ہے کہ اس وقت اسباب نفرت وعناد میں یہ سبب دیگر تمام اسباب سے زیادہ سخت اور اہم ہے کیوں کہ دوسرے اسباب کی قوت وتاثیر کا بھی درحقیقت اسی پر دارومدار ہے۔ اگر یہ جذبہ شدت کے ساتھ ہندوؤں میں پیدا نہ ہوچکا ہوتا تو نہ ہندستان کی گزشتہ تاریخ آڑے آتی اور نہ انگریز ہی اپنی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی میں کام یاب ہوسکتے تھے اس لیے کہنا چاہیے کہ انگریزوں نے اپنے مطلب کی سب سے زیادہ کام یاب جو تدبیر ہندستان میں اختیار کی تھی وہ قوم پرستی اور وطن پرستی کے جذبات کا فروغ ہے، یہ اور بات ہے کہ یہ چیز خود ان کے قابو میں نہیں رہ سکی اور ان کے مجوزہ حدود سے آگے نکل کر خود ان کے لیے خطرہ بن گئی جس پر بالآخر ان کی حکومت کو قربان ہوجانا پڑا اور اب آزادی کے بعد تو یہ چیز اور زیادہ زور وقوت دکھلا رہی ہے جس کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں اس اعتراف میں تامل نہیں ہے کہ اس کا علاج دیگر اسبابِ نفرت کے علاجوں سے کہیں زیادہ دشوار ہے کیوں کہ اور اسباب کے برعکس ابھی تک اس خاص سبب کے دفعیہ کے لیے ہندو قوم کی طرف سے کوئی نمایاں چیز اٹھتی ہوئی نظر نہیں آرہی ہے، بس زیادہ سے زیادہ اگر کوئی چیز اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہے تو وہ احیاء مذہب کی تحریک ہے جو اصولاً مغربی تعلیم وتہذیب کے مذکورہ اثرات کے ازالہ کے لیے صحیح تدبیر

بن سکتی ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ جو لوگ اس تحریک کے علم بردار ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد ہر اس قدیم چیز کا احیاء ہے جو صدیوں پہلے اس ملک میں رائج رہی ہے اس لیے قدرتی طور پر ان کو خود اپنی قوم کے پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس کے علاج کے طور پر ان کی کوشش یہ ہے کہ وہ اپنی تحریک میں زیادہ سے زیادہ قوم پرستی اور وطن پرستی کا عنصر شامل کریں تاکہ وہ لوگوں کے لیے باعث کشش ثابت ہو سکے یا ممکن ہے ان کا تصور مذہب ہی یہ ہو کہ یہ چیزیں اس کی حقیقت میں داخل ہیں حالاں کہ مذہب کی حقیقی روح کے ساتھ ان چیزوں کا کوئی جوڑ ہی نہیں لگ سکتا۔ مذہب کے بنیادی اصول چند ابدی حقیقتیں ہیں جن کا کسی خاندان کسی نسل قوم یا کسی ملک سے کوئی رشتہ نہیں ہے بلکہ وہ ان چیزوں کی نفی پر مبنی ہیں۔

لیکن اوپر جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اس سبب کی موجودگی میں مستقبل سے مایوس ہو جائیں۔ اس کے دفعیہ کے لیے اگر کوئی مؤثر کوشش سرِ دست سامنے نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ناقابلِ علاج ہے۔ اوّل تو خود مسلمان اگر چاہیں تو اس میں بہت کچھ تبدیلی کر سکتے ہیں اور اس کے ذرائع ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں، جیسا کہ آگے آئے گا اور دوسرے براہ راست نہ سہی بالواسطہ طور سے اس کے خطرناک اثرات دور کرنے کی کوششیں بہ ہر حال ملک میں جاری ہیں۔ اس سلسلے کی ایک نمایاں چیز یہ ہے کہ ہندستان کے لیے جو بنیادی دستور طے ہوا ہے وہ ایک جمہوری دستور ہے جس میں ملک کے ہر قوم و فرقہ کے لیے ہر قسم کے یکساں حقوق کا اعلان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ لادینی بھی ہے جو اور وجوہ سے غلط یا خطرناک ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک جارحانہ قوم پرستی کے اثرات کا تعلق ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ان کے دفعیہ کے لیے ایک مؤثر چیز ثابت ہو سکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ دستور ابھی تک محض ایک کاغذی دستاویز ہے جس پر عمل درآمد اعلان و اشتہار سے آگے نہیں بڑھا ہے اور جس پارٹی کے سر اس کو پاس کرانے کا سہرا بندھا ہے، خود اس کا ایک طاقت ور عنصر اس کو ناکام بنا دینے پر تلا ہوا ہے تو ہمارے نزدیک یہ بھی کوئی مایوس ہونے کی چیز نہیں ہے، ملک کو چارو ناچار اس چیز کی طرف آنا ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ ہو سکا اور مخالفت کرنے والے جن جذبات کے ساتھ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ اس میں کام یاب ہو گئے تو یہ چیز خود ملک کے لیے انتہائی حد

تک تباہ کن ثابت ہوگی۔ اس کا سب سے بڑا خطرہ تو یہی ہے کہ ملک کی وحدت برقرار نہیں رہ سکے گی بلکہ جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے بار بار اپنی تقریروں میں اشارہ کیا ہے، ہندستان مختلف مذہبی اور نسلی گروہوں میں بٹ جائے گا اور خود ان کے آپس میں شدید اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ یہ خطرات زیادہ دنوں تک لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتے، آپ یقین رکھیں کہ مخالفین کی قوت بہ ظاہر اس وقت کتنی ہی بھاری کیوں نہ دکھائی دے رہی ہو اس کے پیچھے جذبات کے سوا کوئی ٹھوس فکر و عمل نہیں ہے اور اس کے برعکس پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں جو گروہ آگے بڑھنا چاہتا ہے اس کی کوششیں ملکی ضروریات اور رجحانات زمانہ کے نسبتاً زیادہ مطابق ہیں اس لیے زود یا بدیر ان کے غالب آنے کے امکانات زیادہ اور روشن ہیں۔

یہ ہیں وہ چند وجوہ جو ہمارے نزدیک از خود موجودہ حالات میں تغیر و انقلاب کا باعث بن سکتے ہیں۔

سعی و کوشش سے حالات بدلنے کے ذرائع

اَب آیئے اِس پر غور کریں کہ خود مسلمان اپنی کوششوں سے موجودہ حالات پر کہاں تک اثر انداز ہو سکتے ہیں اور اس کے مؤثر ذرائع کیا ہیں۔

(الف) اوپر اس بات کی بار بار تشریح کی جا چکی ہے کہ قومی کش مکش جو پچھلے دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں قائم رہی ہے وہ آج مسلمانوں کی بہت سی بد بختیوں کی جڑ بنی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے طرز عمل سے اس کش مکش کا خاتمہ کرنا ہے اور اس کے لیے یہ از بس ضروری ہے کہ وہ حقوق اور ملازمتوں کے لیے چیخ و پکار بالکل بند کر دیں اور خاص طور سے جیسا کہ اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے، الیکشن اور موجودہ سیاسی کش مکش سے اپنے کو کلیۃً علیحدہ رکھیں۔ یہ باتیں پہلے بھی غلط تھیں لیکن اب ان کو جاری رکھنا محض غلطی ہی نہیں بلکہ مہلک غلطی اور احمقانہ خودکشی ہے۔ اس کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے کہ قومی تعصب اور زیادہ بھڑکے اور مسلمانوں کو جو حقوق اس وقت حاصل ہیں ان سے بھی انھیں محروم ہو جانا پڑے۔ اس کے برخلاف اگر مسلمان اپنے کو ان چیزوں سے بالکلیہ الگ کر لیں تو ان کے حق میں موجودہ فضا کے

بدلنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگے گی ان کے خلاف جذبات کو سب سے زیادہ ابھارنے والی چیز یہی ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ عام پبلک اصلاً آپ کی دشمن نہیں ہے۔ وہ صدیوں سے ایک ساتھ رہتی سہتی چلی آ رہی ہے اور ان کے باہم طرح طرح کے تعلقات و روابط ہیں، اگر ان کو تعصب و نفرت ہے تو یہ ان لوگوں کی بہ دولت ہے جو اپنے حقوق میں آپ کو کش مکش کرتے دیکھ کر برہم ہیں اور وہ اپنی غرض کے لیے عوام کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ طبقہ کسی طرح مطمئن ہو جائے تو عمومی نفرت از خود ختم ہو سکتی ہے۔

رہا یہ خیال کہ حقوق و مطالبات سے دست کش ہو جانے کے بعد مسلمانوں پر قیامت آ جائے گی اور وہ معاشی حیثیت سے بالکل تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ تو ہمارا خیال یہ ہے کہ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ واقعات کی دنیا سے شاید کچھ زیادہ واسطہ نہیں رکھتے صرف تخیلات کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جن کا ذریعۂ معاش سرکاری ملازمتیں رہی ہیں؟ شاید مجموعی آبادی کے ایک فی صدی بھی نہیں اور اب تقسیم کے بعد تو یہ تناسب اس سے بھی کم ہوگا۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو آیندہ تھوڑے ہی دنوں میں غالباً حالت یہ ہو جائے گی کہ مسلمان اس غم میں گھلے جائیں گے کہ وہ کس طرح اپنی تعداد ملازمتوں میں بڑھائیں اور وہ ان سے خالی ہو چکی ہوں گی۔ پس عقل مندی کی بات یہ ہے کہ ہماری مرضی کے خلاف جو کچھ پیش آ رہا ہے اور جسے روکنے کی ہم میں استطاعت نہیں ہے، اس پر پہلے ہی سے راضی ہو جائیں اس سے کوئی بڑا نقصان بھی نہیں ہوگا اور اس کے ساتھ یہ توقع ہو سکتی ہے کہ اس سے حالات کی اس رفتار میں رکاوٹ پیدا ہو جائے جیسا کہ عرض کیا گیا ہے اور اس طرح یہ مفت کی قربانی آئندہ اس پہلو سے بھی ان کے لیے خیر و برکت کی موجب ثابت ہوگی۔

(ب) ملازمتوں وغیرہ سے علٰیحدہ رہتے ہوئے اگر مسلمان اپنی پوری توجہ اپنی اخلاقی اصلاح پر صرف کریں تو یہ چیز مثبت طور پر موجودہ حالات پر بہت خوش گوار اثر ڈال سکتی ہے، غیر مسلموں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو بدگمانی اور نفرت پچھلی کش مکش کی بنا پر بیٹھ گئی ہے اس کے پیشِ نظر وہ نہ صرف مسلمانوں کے بارے میں بلکہ نفس اسلام کے بارے میں بھی انتہائی بدگمانیوں کا شکار ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ ہماری اخلاقی حالت گرتے گرتے اس سطح پر پہنچ

گئی ہے کہ مسلمانوں کے دین واخلاق کی کوئی امتیازی خصوصیت کسی شعبہ زندگی میں باقی نہیں رہ گئی ہے بلکہ بہت سے معاملات میں ان کا امتیاز ہی یہ ہو کر رہ گیا ہے کہ وہ ان میں دوسروں سے پیچھے ہیں، اگر اس حالت کو بدلنے کی کوشش کی جائے اور مسلمان اپنے اخلاق کا درجہ اتنا اونچا بنائیں کہ ان کا معاشرہ نمایاں طور سے دوسروں سے ممتاز نظر آنے لگے تو یہ قدرتی بات ہے کہ بدگمانیاں دور ہوں گی، ان کی طرف دلوں کی کشش بڑھے گی اور لوگ ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوں گے، یقین رکھیے کہ آج دنیا کی سب سے کمیاب جنس یہی ہے اور کمیاب ہونے کی وجہ سے وہ سب سے زیادہ قابل قدر چیز ہے اور اس کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دلوں کی تسخیر کا یہی سب سے زیادہ موٴثر اور کام یاب حربہ ہے۔ مسلمانوں کو اس سے پہلے دنیا میں جو کچھ کام یابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ تلوار کی نہیں بلکہ ان کے حسن اخلاق کی رہین منت ہیں اور آج بھی اخلاق کی یہ تاثیر اس سے علیحدہ نہیں ہوئی ہے کیوں کہ زمانہ کتنا ہی بدل گیا ہو لیکن انسانی فطرت نہیں بدلی ہے جو اخلاق کو ہمیشہ کی طرح اب بھی پسندیدہ سمجھتی اور اسے دل سے لگانے کے لیے بے تاب ہے۔

(ج) اخلاقی اصلاح موقوف ہے مذہبی اصلاح پر کیوں کہ اخلاق کی مضبوط اور ٹھوس بنیادیں وہ عقائد ہی ہوسکتے ہیں جو مذہب فراہم کرتا ہے اس لیے خاص اس غرض کے لیے مذہبی اصلاح ضروری ہے، اور یوں بہ جائے خود اس کا ضروری ہونا اور دوسرے بہت سے فوائد کا اس پر منحصر ہونا ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اس اصلاح کا اس پہلو سے ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان اپنے معاملات میں نہ صرف خود قوم پرستی اور وطن پرستی سے الگ رہ سکیں گے۔ بلکہ وہ اس کا ایک عملی نمونہ پیش کر کے دوسروں کو بھی ان سے باز رکھنے کا ذریعہ بنیں گے۔ اور اس طرح وہ تنہا اپنی ذات یا قوم ہی کو مصائب و مشکلات سے نجات نہیں دیں گے۔ بلکہ ان پرستاریوں کی بنا پر خود ملک کو جو تباہیاں اور بربادیاں پیش آسکتی ہیں اس سے ان کی نجات کا ذریعہ بنیں گے۔ اس طرح وہ اپنی خدمت کے ساتھ ملک کی ایک نہایت زبردست خدمت بجالائیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آج مسلمان ملک کے جن حالات کو سامنے رکھتے ہوئے خائف و ہراساں بلکہ مایوس ہیں وہ ہرگز ایسے نہیں ہیں کہ وہ ان سے خوف زدہ یا مایوس ہوں، ان میں

تبدیلیاں ہورہی ہیں اور وہ کوشش وہمت سے تبدیل کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے ان سے ڈرنا چھوڑ کر مسلمانوں کو ہمت و استقلال سے کام لینا چاہیے اور ان کو بدلنے کا عزم پیدا کر کے ان کے بدلنے کی کوشش میں لگ جانا چاہیے، یہی ان کے اچھے مستقبل کا پیش خیمہ ہے ورنہ یہ مایوسانہ طرز عمل ان کو کہیں کا بھی نہیں رکھے گا۔ دین و دنیا دونوں تباہ ہوجائیں گے۔ (لاقدر اللّٰہ)

(۳) تیسری بات جو ان باتوں سے زیادہ امید افزا اور قابل اعتماد بلکہ درحقیقت پہلا اور آخری سہارا ہے وہ قدرت کی کارسازیوں کا یقین ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ دنیا میں اصل کارفرما چیز خدا کی مشیت ہے۔ وہ جس چیز کا فیصلہ کرلیتا ہے چشم زدن میں ہوجاتی ہے۔

وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ (البقرہ:۱۱۷)

''جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرلیتا ہے تو وہ کہتا ہے ہوجا سو وہ ہوجاتی ہے۔''

اور نفع وضرر اور فائدہ ونقصان جو کچھ بھی ہے اسی کے قبضہ میں ہے۔

اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۷﴾ (الانعام:۱۷)

''اگر اللہ تم پر کوئی مصیبت ڈال دے تو اس کو اس کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں ہے۔ اور اگر وہ تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَ لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ﴿۱۷﴾ (الاحزاب:۱۷)

''کہہ دیجیے کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچاسکے۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے؟ یا (کون ہے جو اللہ کے رحم وکرم سے تمہیں محروم کردے) اگر وہ تم پر کوئی مہربانی کرنا چاہے۔ اور یہ لوگ اللہ کے سوا اپنے لیے کوئی ولی اور مددگار نہ پاسکیں گے۔''

یہی عقیدہ و اذعان مسلمانوں کو مشکل سے مشکل وقت میں اضطراب و پریشانی اور مایوسی سے محفوظ رکھتا ہے۔ جس دل میں یہ عقیدہ زندہ ہو، وہ کبھی پریشان اور مایوس نہیں ہوتا۔ اسی

بنا پر کہا گیا ہے کہ ایمان اور مایوسی ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ (یوسف:۸۷)

''یقیناً اللہ کی رحمت سے کافر ہی مایوس ہو سکتے ہیں۔''

مایوسی ایک مسلم کی شان کے بالکل منافی بات ہے۔ ہر حال میں اس کا اعتماد اللہ پر ہوتا ہے جو تمام قوتوں اور حکمتوں کا سرچشمہ ہے۔ ایسی ذات سے وابستہ ہو جانے کے بعد مایوسی کا پھر گزر کہاں، حالات واقعات اور اسباب وعلل اس کے سامنے بھی ہوتے ہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر چیز کسی نہ کسی علت سے وابستہ ہے اور یہ اللہ کی سنت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ علت العلل صرف خدا کی مشیت ہی کو سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ کیسی ہی حالت میں گھر جائے، حالات کی خوف ناکی اس کو مایوسی اور دل شکستگی کی حد تک متاثر نہیں کرتی اور وہ اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ اپنی سعی و تدبیر میں لگا رہتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اللہ کا سہارا باقی نہ رہے تو پھر زندگی سکون وطمانیت سے آشنا ہو ہی نہیں سکتی، انسان بے چارۂ محض ہے، قدم قدم پر اس کی تدبیروں کی ناکامیاں سامنے آتی ہیں۔ ان پر تکیہ کر کے وہ کیسے خوش ومطمئن رہ سکتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾
(الحج:۱۵)

''جو شخص مایوس ہو کر یہ خیال کر بیٹھتا ہے کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد کرنے والا نہیں تو (اس کے لیے زندگی کی کوئی راہ باقی نہیں) اسے چاہیے کہ ایک رسی چھت تک لے جا کر باندھ دے اور (اس میں گردن لٹکا کر زمین سے) رشتہ کاٹ لے پھر دیکھے اس تدبیر نے اس کا غم وغصہ دور کیا یا نہیں۔''

اسی کے ساتھ ایک بات اور ذہن میں رکھیے اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ نے یا آپ کی قوم نے اسلام سے الگ ہو کر زندگی بسر کرنی چاہی تو خدا نے آپ کے نام کوئی پٹہ نہیں لکھ دیا ہے کہ ہر حال میں وہ آپ کی مدد کرے گا۔ فرد فرد اور قوم قوم کی حیثیت سے اس کی نگاہ میں سب یکساں ہیں۔ اسی لیے کوئی وجہ نہیں کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی خصوصی رعایت برتے، لیکن اگر آپ نے اس

کے بھیجے ہوئے دین سے اپنا رشتہ مضبوط کر لیا، تو آپ یقین رکھیے، اس سے ایک طرف خود بہ خود آپ میں غیر معمولی قوت پیدا ہو جائے گی، جس سے مشکلات آپ کو مشکلات نہیں معلوم ہوں گی اور دوسری طرف اللہ کی مدد و نصرت ہر قدم پر آپ کو سہارا دینے کے لیے موجود رہے گی۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۴۰ (الحج: ۴۰)

''یقیناً اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرے گا جو (اس کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔

بے شک اللہ قوی اور عزت والا ہے۔''

آپ نے قرآن مجید میں پڑھا ہوگا کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے دربار میں تبلیغ حق کے لیے جانے کا حکم ملا تو ان کو شروع میں اس کی قہرمانیوں کا اندیشہ ہوا۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝۴۵ (طٰہٰ: ۴۵)

''ان دونوں (حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام) نے کہا اے ہمارے رب ہمیں خوف ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا۔ یا سرکشی کی روش اختیار کرے گا۔''

لیکن ارشاد خداوندی

اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝۴۶ (طٰہٰ: ۴۶)

''بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہر (بات کو) سنتا اور (ہر چیز کو) دیکھتا ہوں۔''

نے ان کے اندر وہ قوت بھر دی کہ وہ بے خوف و خطر ہو کر فرعون کے دربار میں پہنچے اور اس کی خدائی کو اس جرأت کے ساتھ چیلنج کیا کہ فرعون اور سارے درباری سکتے میں آ گئے۔ اور خیر یہ تو پیغمبر تھے ان کی جرأت ایمانی کا کہنا ہی کیا ہے، ان کے علاوہ بھی جن جن کو ایمان کی کم و بیش دولت نصیب ہوتی گئی وہ آناً فاناً سرتاپا قوت بنتے گئے۔ خود فرعون کے ایک عزیز جو ایک وقت مصلحتاً اپنے ایمان کو چھپا رہے تھے، وقت آنے پر اس جرأت کے ساتھ سامنے آئے کہ ان کی جرأت کتنوں کے دلوں میں زبردست ایمانی حرارت پیدا کرنے کی باعث بن گئی اور یہ ایمان ہی کی قوت تھی کہ فرعون نے جن جادوگروں کو حق کے مقابلے کے لیے جمع کیا تھا اور وہ خود بھی فتح و غلبہ کے جذبہ سے سرشار ہو کر مقابلہ کے لیے آئے تھے۔ جب وہ خود حق سے مغلوب ہو گئے تو وہ گویا وہ نہیں رہے جو چند لمحہ پیش تر تھے۔ اس مغلوبیت نے ان میں ایک نئی جان اور نئی روح پیدا

کردی، ابھی چند لمحہ پیشتر تک تو ان کا حال یہ تھا کہ فرعون ان کا بادشاہ ہے، دل اس کے سامنے انتہائی عجز و نیاز مندی کے ساتھ جھکے ہوئے ہیں اور زبانیں اس کی خوشامد میں مصروف ہیں لیکن حق کی چمک دل میں پیدا ہوتے ہی ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ فرعون ان کی سابقہ نیاز مندیوں کی بنا پر حیرت میں آ کر چلا اٹھتا ہے۔

اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ (الاعراف:۱۲۳)

''تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا!''

اور پھر غصہ میں آ کر ان کو اس آخری سزا کی دھمکی دیتا ہے، جو اس کے بس میں تھی۔

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ (طٰہٰ:۷۱)

''سو اب میں یقیناً تمہارے ہاتھ پاؤں الٹی سیدھی طرف سے کاٹ دوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا، کھجور کے تنا پر۔''

لیکن اس کا ان کے پائے استقامت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، وہ بے پروائی کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ؕ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴿۷۳﴾

(طٰہٰ:۷۲،۷۳)

''ہم ان واضح دلائل و تعلیمات کو چھوڑ کر جو ہمارے پاس آئی ہیں اور اس ہستی کو چھوڑ کر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، تجھے قبول نہیں کر سکتے تو تو جو فیصلہ بھی کرنا چاہے کر۔ تو اسی زندگی کو ختم کر سکتا ہے، ہم تو اپنے رب پر ایمان لا چکے تا کہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور جادو کی ان حرکات کو معاف کر دے، جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا اور اللہ سب سے بہتر اور سب سے زیادہ باقی رہنے والا ہے۔''

یہ جرأت و استقامت جو ان میں پیدا ہوئی تھی کہ انھوں نے بڑی سے بڑی مصیبت کو مصیبت نہیں سمجھا یہ آخر دین کے سوا اور کس چیز کا نتیجہ تھی؟ پھر قرآن ہی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اہل حق کو دبانے کے لیے جو تدبیریں بھی اختیار کیں وہ سراسر ناکام رہیں۔ حق بہ ہر حال غالب ہو کر رہا۔ اور فرعون اپنی تمام قہرمانیوں کے ساتھ غرق ہو گیا۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّ كُنُوْزٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ۚ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ (الشعراء: ۵۷-۵۹)

''پس ہم نے فرعونیوں کو باغات، چشموں خزانوں اور باعزت مقام سے نکالا اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دیا۔''

کیا ظاہری اسباب وعلل ہی پر نگاہ رکھنے والے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی حالات دیکھ کر اس انجام کا ایک لمحہ کے لیے بھی تصور کر سکتے تھے؟ خود اپنی تاریخ کے ابتدائی حالات ذہن میں رکھیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت کوہ صفا پر چڑھ کر اپنا سب سے پہلا پیغامِ حق نشر فرمایا تھا۔ تو اس وقت آپ کے ایک کم سن ساتھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا حاضرین میں کون تھا جس نے اس کا جواب استہزا اور تمسخر کے ساتھ نہ دیا ہو۔ اور آپ کے راستے میں جس جس طرح کانٹے بوئے گئے اس کو دیکھتے ہوئے اس وقت کون قیاس کر سکتا تھا کہ کلمۂ حق کا بول بالا ہو سکے گا۔ اور آپ کو کبھی اپنے مقصد میں کام یابی ہو سکے گی۔ لیکن ان واقعات پر ابھی چند ہی سال گزرے تھے کہ جن آنکھوں نے کسمپرسی اور مظلومیت کے وہ مناظر دیکھے تھے انہیں آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھ لیا کہ حق فتح وشکست اور سختی ونرمی کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا اس مرحلے میں داخل ہو گیا کہ جس سرزمین سے اس کو زبردستی نکالا گیا تھا۔ اس میں وہ فاتحانہ داخل ہو رہا ہے اور اس کے مخالفین جنھوں نے اسے مغلوب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ وہ اس کے آگے گردنیں جھکائے ہوئے اس کے آخری فیصلے کے منتظر ہیں۔ اس ابتدا کی یہ انتہا کس کے وہم وگمان میں آ سکتی تھی! لیکن کارسازِ حقیقی کی کارسازیوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ سب کچھ دکھا دیا۔ اس طرح کے معلوم نہیں کیسے کیسے حیرت انگیز واقعات پہلے ہو چکے ہیں جن سے خود قرآن کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔ اور اب بھی ان کا سلسلہ بند نہیں ہوا ہے۔

مسلمانوں کی خود اپنی تاریخ اس قسم کے کتنے حیرت انگیز واقعات سے پُر ہے۔ تاتاریوں نے اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنے میں کیا کسر اٹھا رکھی تھی! لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ بعد میں یہی ان کے سب سے بڑے پاسباں بھی ہوئے۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

پھر کیا یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اللہ پر ایمان رکھنے والوں کے لیے یہ جائز ہوسکتا ہے کہ وہ حالات کا اپنی نگاہ سے جائزہ لے کر ان سے مایوس ہوجائیں۔ اور اللہ کی قدرتوں اور رحمتوں اور اس کی کارسازیوں اور حکمتوں کے یقین سے کوئی سہارا حاصل نہ کریں؟ ہمارے نزدیک یہ مایوسی کفر کے ہم معنی ہے اور یہ ان کے مستقبل کو تباہ کرنے والی چیز ہے۔ اس لیے انھیں اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے مایوسی کو بالکل چھوڑ دینا چاہیے اور ہمت و جرأت کے ساتھ زندہ رہنے کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ اتنی بڑی قوم اس کا فیصلہ کرے تو حالات کو بدل دینا کوئی بڑا دشوار کام نہیں ہے باقی رہی یہ بات کہ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کا مذہبی پہلو خصوصیت کے ساتھ ہمارے لیے تکلیف دہ ہے تو ہم اس احساس کی شدت کو کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہمیں تو مسلمانوں سے شکایت یہی ہے کہ ان کو زیادہ تر غم اپنی دنیا کی تباہی کا ہے۔ دین کا معاملہ ان کے لیے وہ اہمیت نہیں رکھتا جس کا وہ مستحق ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ قابلِ غور بات ہے کہ دین کی حفاظت کی تدبیر کیا ہوسکتی ہے۔ آیا یہ کہ ہم مایوس ہوکر بیٹھ رہیں اور دین پر جو آفت آئے اسے خاموشی کے ساتھ انگیز کرتے رہیں یا یہ کہ ہمیں اس کے تحفظ و بقاء کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے؟ پھر یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ اگر دین کا غم ہمیں زیادہ ستا رہا ہے تو کیا دین کی تعلیم یہی ہے کہ ہم حالات کو ناسازگار دیکھ کر مایوس ہوجائیں؟ خود یہ حالت دین کے کہاں تک مطابق ہے۔ اور ظاہر ہے اس میں جو کچھ قصور ہے ہمارا ہے۔ حکومت یا اکثریت کو اس کے لیے الزام نہیں دیا جاسکتا۔ بہ ہر حال یہ پہلو بھی ہمارے لیے مایوسی کی بہ جائے عزم و ہمت اور عمل کا محرک ہونا چاہیے۔ اور اپنی جگہ پر یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ اگر ہم دین کی بربادی پر راضی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے بچاؤ کے لیے اپنی پوری قوت وصلاحیت کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ تو ہمیں مجبوراً جو خلاف دین باتیں گوارا کرنی پڑ رہی ہیں اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمائے گا۔ **لا یکلف اللّٰہ نفساً الّا وُسعھا۔**

(۲) خوف وہراس کا علاج

اوپر جو کچھ علاج مایوسی کے سلسلے میں عرض کیا گیا ہے وہی باتیں خوف وہراس کے سلسلے میں بھی کہی جاسکتی ہیں۔ اس لیے یہاں اس کے علاج وتدبیر کے بارے میں علیحدہ بحث کی ہم کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔ البتہ خوف دہراس کے جن تین نتائج کا ہم نے تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے مایوسی کو چھوڑ کر کیوں کہ اس پر کافی گفتگو ہو چکی ہے، بقیہ دو کے سلسلے میں ہم کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں یعنی ملک کو خیر باد کہنا یا یہاں رہنا ہی پڑے تو اکثریت کی خوشامد کو اپنا فرض سمجھنا۔

ان دونوں مسئلوں میں سے جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے اس پر دو حیثیتوں سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(الف) کیا حالات ایسے مجبور کن ہیں کہ ترک وطن کے سوا چارہ نہ ہو۔

(ب) کیا ترک وطن ہماری مصیبتوں کا علاج ہے۔

ہم ان دونوں کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر مختصراً پیش کرتے ہیں۔ پہلے نمبر الف پر غور کیجیے۔

مجبوریاں چند اس طرح کی ہوسکتی ہیں:

(۱) شرعی مجبوری کہ اس کی رو سے ہندستان میں رہنے کی گنجائش نہ ہو۔

(۲) ملکی حالات کہ وہ چارو ناچار مسلمانوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر رہے ہوں۔

(۳) معاشی پریشانیاں جن کا ملک میں رہتے ہوئے کوئی علاج ممکن نہ ہو۔

(۱) کیا ہجرت ضروری ہے؟

جہاں تک پہلی مجبوری کا تعلق ہے، ہم اس سے پہلے ایک علیحدہ مضمون میں اپنا نقطۂ نظر بہت تفصیل کے ساتھ پیش کر چکے ہیں۔ اس لیے وہ بحث وہیں دیکھنی چاہیے۔ یہاں ہم بہ طور خلاصہ اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ہر چند مخصوص لوگوں کے لیے مخصوص حالات میں شرعاً ترک وطن کی پوری گنجائش ہے۔ بلکہ بعض حالات میں یہ مستحسن اور واجب بھی ہے۔ لیکن ابھی عمومی طور سے یہاں کے حالات ایسے نہیں ہوئے ہیں جن میں ترک وطن ضروری ہو

بلکہ اس کے برعکس ہمارا خیال یہ ہے کہ بہت سے وجوہ ایسے ہوسکتے ہیں، جن کے تحت یہاں کا رہنا، اسے خیر باد کہنے کے مقابلے میں زیادہ پسندیدہ اور موجبِ اجر و ثواب ہوسکتا ہے اور خاص طور سے جو لوگ اس نیت و ارادہ کے ساتھ یہاں رہنا چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلمہ کو بلند رکھنے کے لیے وہ جدوجہد کریں یا ان کا رہنا یہاں کے مسلمانوں کی قوت و دل جمعی کا باعث بن سکتا ہے۔ ان کے بارے میں جائز و ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بہ ہر صورت جائز ہے اور ہم اپنے اس خیال میں منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ یہی فیصلہ یہاں کی تقریباً تمام مذہبی جماعتوں یا اشخاص کا ہے چنانچہ ہم نے اپنے مذکورۂ بالا مضمون کے بارے میں یہاں کے متعدد مشاہیر علماء کی رائیں معلوم کی تھیں اور وہ اس کی تائید و تصویب میں تھیں۔(۱)

---

(۱) ذیل میں چند رائیں بہ طور خلاصہ پیش کی جاتی ہیں:

مولانا سید احمد حسین صاحب مدنی

والا نامہ معہ رسالہ زندگی پہنچا۔ باوجود انتہائی عدیم الفرصتی ... میں امتثالاً للامر اشارات کو بہ تمامہا دیکھا۔ میں اس میں موافق رائے رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی

زندگی کا پرچہ پہلے ملا۔ اسی وقت اس مضمون کو اوّل سے آخر تک بڑی دل چسپی کے ساتھ پڑھا جو وقت کا اہم مسئلہ ہے۔ سال بھر سے زیادہ مدت غالباً گزری ہوگی کہ مسئلہ ہجرت پر صدق میں فقیر نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ معلوم نہیں آپ کی نظر سے وہ گزرا بھی یا نہیں بہ ہر حال جس نتیجے تک آپ پہنچے ہیں، خاکسار کا ناچیز خیال یہی تھا اور یہی اب بھی ہے۔ حال میں ابن عساکر کی تاریخ دمشق میں حضرت عباسؓ کے متعلق کچھ روایتیں بھی مل گئیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ جائے دار الہجرت مدینہ منورہ کے مکہ جو اس وقت دار الحرب کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہیں کے قیام پر حضرت عباسؓ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصرار فرمایا۔ مئی ۵۰ء کی کسی قسط میں مولانا عبدالماجد نے شائع بھی فرما دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حالات کا جائزہ اپنی کامل بصیرت اور وسعت نظر کے ساتھ آپ نے لیا ہے۔ اور ہر شق پر جو حکم آپ نے لگایا ہے۔ بالکل جچا تلا ہوا ہے۔ آپ نے نہ رجائیت ہی میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور نہ قنوطیت میں اس نقطہ تک پہنچ گئے ہیں جہاں صرف وہی پہنچ سکتے ہیں جن کے دل سے حق تعالیٰ کا یقین پھسل چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ وسیع پیمانہ پر ان نقاط نظر کی اشاعت کی جائے۔ کاش اردو کے روزنامے آپ کے مضمون کو قسط وار شائع بھی کرتے اور پھر تائید ی نوٹوں کے ذریعے مسلمانوں کے قلوب سے ان مغالطوں کے ازالہ کی کوشش کرتے جن میں بغیر کسی برہان و دلیل کے مسلمانوں کی سمجھیں الجھ گئی ہیں۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۲) ہندستان میں مسلمانوں کا مقام

دوسری مجبوری کے ضمن میں ملکی حالات سے اگر وہ حالات مراد لیے جائیں جو عوام کے تعصب یا فرقہ وارانہ ذہنیت وغیرہ کی پیداوار ہیں تو اس کے بارے میں یہاں ہمیں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ اس سے پہلے ہم خود تفصیل کے ساتھ ان حالات کا جائزہ لے چکے ہیں اور ان کے ضمن میں اپنا یہ نقطۂ نظر بھی پیش کر چکے ہیں کہ یہ حالات کتنے ہی سخت و سنگین کیوں نہ ہوں، اتنے مجبور کن نہیں ہیں کہ مسلمان ان کی بنا پر ترکِ وطن کے سوا اپنے لیے کوئی دوسرا چارہ کار نہ پائیں، بہ راہِ عنایت اس موقع پر اس بحث کو دوبارہ ملاحظہ فرمالیں اور اگر ان سے مراد یہ ہو کہ تقسیم کے بعد یہاں آئین اور نظمِ حکومت میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور ان کی رو سے یہاں مسلمانوں کا جو مقام متعین کیا گیا ہے اس کے پیش نظر یہاں ان کے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو ہمیں اس خیال پر حیرت ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ملک کا بنیادی دستور ان کے متعلق کیا کہتا ہے۔

آئینِ ہند کی رو سے ہندستان کے تمام مسلمان یہاں کے شہری ہیں اور ان کو کسی امتیاز و تفریق کے بغیر وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو کسی دوسرے باشندے کو حاصل ہیں، دستور کی دفعہ ۵ میں ایک ہندستانی شہری کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"اس دستور کے نفاذ کے وقت ہر وہ شخص جس کی سکونت سرزمینِ ہند میں ہو اور

(بقیہ گزشتہ صفحے کا)

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا خط مدیر زندگی کے نام

"زندگی میں مسئلہ ہجرت پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ مجھ کم علم کی نظر میں بڑی حد تک بجا و درست ہے اور بہ حیثیت مجموعی مسئلہ کی صحیح تعبیر ہے۔ دلائل و شواہد میں کہیں کہیں شدت محسوس ہوئی مثلاً صفحہ ۱۲ کی ابتدائی ،ور آخری سطروں میں لیکن نتیجہ فی الجملہ صحیح ہی نکالا گیا ہے۔ اور مضمون بہ حیثیتِ مجموعی مضمون نگار کے عام توازن و اعتدال کو قائم رکھے ہوئے ہے۔"

خدا نے چاہا تو یہ مضمون نظر ثانی کے بعد جلد کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے گا۔

(الف) جو ہندستان میں پیدا ہوا ہو یا

(ب) جس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندستان میں پیدا ہوا ہو یا

(ج) جو آغازِ دستور سے متصلاً قبل، کم از کم پانچ سال تک عموماً سرزمینِ ہند میں رہتا رہا ہو —— ہندستان کا شہری ہوگا۔"

بنیادی حقوق کے سلسلے میں دفعہ ۱۵ کے تحت اعلان کیا گیا ہے کہ

"محض مذہب، نسل، ذات، صنف یا جائے پیدائش یا ان میں سے کسی ایک کی بنا پر یہاں کی ریاست کسی شہری کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرے گی اور نہ آمد و رفت اور سڑکوں اور پبلک مقامات وغیرہ کے استعمال پر کوئی پابندی یا شرط وغیرہ عائد کر سکتی ہے۔"

اور دفعہ ۱۶ کے تحت بتایا گیا ہے کہ مذہب اور نسل وغیرہ کی بنیاد پر ریاست کے تحت کسی ملازمت یا عہدہ کے سلسلے میں بھی کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ اس کے بعد دفعہ ۱۹ آتی ہے جس کی رو سے ہر شہری کے لیے حسب ذیل حقوق کا اعلان کیا گیا ہے:

(الف) تقریر اور اظہار خیال کی آزادی۔

(ب) اسلحہ کے بغیر پُرامن طریقہ سے اجتماع منعقد کرنے کی آزادی۔

(ج) یونین یا ادارہ قائم کرنا۔

(د) پورے حدود مملکت میں آزادانہ چلنا پھرنا۔

(ہ) ہندستان کے کسی حصے میں رہنا اور سکونت اختیار کرنا۔

(و) کوئی جائداد حاصل کرنا، اس پر قابض رہنا اور منتقل کرنا۔

(ز) کوئی بھی پیشہ، تجارت اور کاروبار اختیار کرنا۔

پھر دفعہ ۲۵ تا ۳۰ کے ذریعے چند خاص شرطوں کے تحت جو سب کے لیے ہیں ہر شہری کے لیے یکساں طور سے تسلیم کیا گیا ہے کہ

"وہ آزادانہ اپنے ضمیر کی آواز پر چل سکتا ہے۔

کسی مذہب پر عقیدہ رکھ سکتا ہے، اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے اور اس کی تبلیغ کر سکتا ہے۔(۲۵)

اخلاق عامہ، صحت اور پبلک آرڈر کے تحت مذہبی یا خیراتی کاموں کے لیے ادارہ اور انجمنیں قائم کرسکتا ہے۔ اپنے مذہبی معاملات کا خود انتظام کرسکتا ہے اور ہر طرح کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ حاصل کرسکتا اور قانون کے مطابق اس کا بندوبست کرسکتا ہے۔ (۲۶)

کسی خاص مذہب یا مذہبی فرقہ کی بقا و ترقی کے لیے کسی کو کوئی ٹیکس ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ (۲۷)

نہ کسی تعلیمی ادارہ کو جو پوری طرح اسٹیٹ کے فنڈ سے چلایا جارہا ہو، کسی مذہبی قسم کی ہدایت کا پابند کیا جائے گا۔

کسی شخص کو کسی سرکاری امداد پانے والے تعلیمی ادارہ میں کسی مذہبی رسم یا عبادت میں شرکت پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ جب تک وہ خود یا اگر وہ نابالغ ہے تو اس کا سرپرست اس پر راضی نہ ہو۔ (۲۸)

شہریوں کا کوئی طبقہ جو اپنی خاص زبان، رسم الخط اور تہذیب رکھتا ہو اس کو ان کو برقرار رکھنے کا پورا اختیار ہوگا اور کسی شخص کو صرف مذہب، نسل، ذات یا فرقہ کی بنا پر کسی سرکاری یا نیم سرکاری تعلیمی ادارہ میں داخل ہونے سے روکا نہیں جاسکتا ہے۔ (۲۹)

تمام اقلیتیں خواہ وہ مذہب کی بنا پر قائم ہوئی ہوں یا زبان کی بنا پر اپنی مرضی کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا پورا حق رکھتی ہیں۔ اور حکومت اپنی تعلیمی امداد کے سلسلے میں کسی ادارہ کے ساتھ محض اس بنا پر کوئی تفریق نہیں کرے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیر انتظام ہے۔ (۳۰)

اسی طرح دفعہ ۳۱ کے ذریعہ جائداد اور آراضی کے سلسلے میں تحفظات کی یقین دہانی کی گئی ہے۔

گویا جہاں تک آئین کا تعلق ہے اس میں اور وجوہ سے نقائص ہوسکتے ہیں اور ہیں۔ لیکن جن امور کے سلسلے میں مسلمان خاص طور سے پریشانیاں محسوس کررہے ہیں ان کے سلسلے میں ان کے موجودہ ظرف کے مطابق کافی سامان اطمینان موجود ہے۔

یہ تو آئینی حیثیت سے ہندستان میں مسلمانوں کی پوزیشن ہے جسے خود ملک نے اپنی مرضی سے اپنے نمائندوں کی زبان سے تسلیم کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ اس بات کو فراموش نہیں کرنا

چاہیے کہ اس سے قطع نظر عقل و دیانت اور دنیا کے ہر قانون کی رو سے ہندستان مسلمانوں کا ویسا ہی وطن ہے اور اس پر ان کو اسی طرح کے حقوق حاصل ہیں جس طرح یہاں کے دوسرے باشندوں کو حاصل ہیں، ان کے ان حقوق کو کسی منطق و استدلال کی رو سے رد نہیں کیا جاسکتا اور آئینِ ہند میں ان کے لیے جو مساویانہ حقوق تسلیم کیے گئے ہیں وہ کچھ اکثریت کا صدقہ نہیں ہیں بلکہ وہ ان کے جائز حقوق ہیں جن کو تسلیم کیا جانا ہی چاہیے تھا۔ ہندستان میں مسلمان کچھ اب نہیں آئے ہیں بلکہ وہ صدیوں سے یہاں رہ رہے ہیں اور اس ملک کی ہر طرح کی ترقیوں میں ان کا زبردست ہاتھ رہا ہے اس لیے اس کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی کہ انھیں اپنی محنت و مشقت اور قابلیت کے بہ قدر اس ملک میں رہنے سہنے اور اس کے وسائل سے مستفید ہونے کا موقع نہ دیا جائے اور باتوں کو کوئی نظر انداز بھی کرسکتا ہے لیکن یہ بات کس طرح نظر انداز کی جاسکتی ہے کہ اس ملک کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے میں مسلمانوں نے جو قربانیاں دی ہیں وہ ہندوؤں کی قربانیوں سے کسی طرح بھی کم نہیں ہیں۔ سب قربانیوں کو چھوڑیے صرف جلیانوالہ باغ اور بازار قصہ خوانی کی جو تاریخ ان کے گرم گرم خون سے لکھی گئی ہے کیا وہ آسانی کے ساتھ بھلائی جاسکتی ہے؟ رہی یہ بات جو اکثر اس ملک کے نادان لوگوں کی زبانی سننے میں آتی ہے کہ مسلمان اس ملک کے اصل باشندے نہیں ہیں بلکہ وہ باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں اس لیے ان کا اس ملک پر کوئی حق نہیں۔ تو اوّل تو یہ بات تمام مسلمانوں کے بارے میں صحیح نہیں ہوسکتی کیوں کہ ان میں نوے پچانوے فی صدی افراد وہ ہیں جن کا خونی رشتہ اسی خاک وطن سے ملتا ہے ایسے لوگ محض عقیدہ و مذہب کی تبدیلی سے غیر ملکی نہیں کہے جاسکتے اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر باہر سے آنا ہی حقوق شہریت سے محرومی کی کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو اس قسم کی باتیں کہنے والے شاید خود اسی صف میں ہوں گے جس میں وہ مسلمانوں کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ مسلمانوں اور عام ہندوؤں میں اس لحاظ سے اس کے سوا اور کوئی فرق نہیں ہے کہ ایک گروہ کچھ زمانہ پہلے یہاں آیا ہے اور دوسرا کچھ بعد۔ اس دلیل کے بہ موجب اس ملک کے سارے حقوق ان لوگوں کو ملنے چاہئیں جو آج بھی نہیں جانتے کہ ان کے حقوق کیا ہیں تو کیا اس منطق کے اس نتیجہ کو قبول کرنے کے لیے یہ معترضین تیار ہیں!
اسی طرح جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان قائم کردیا گیا ہے اس لیے یہاں

ان کا کوئی حق نہیں ہے وہ بھی اپنے اس قول کے ذریعے محض اپنی جہالت کا مظاہرہ کرتے ہیں کیوں کہ ہر شخص جانتا ہے اور ملک کے لیڈر برابر یہ اعلان کرتے رہتے ہیں کہ تقسیم ملک کے مطالبہ کی بنیاد جو کچھ بھی رہی ہو لیکن ملک کی تقسیم علاقائی بنیادوں پر عمل میں آئی ہے نہ کہ قوم و مذہب کی بنیاد پر۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کی اقلیتیں اسی ملک کی باشندہ ہیں اور وہ اس پر بنیادی حقوق رکھتی ہیں اس لیے پاکستان اہلِ پاکستان کا ہے یا ان لوگوں کا جو وہاں جا کر بود و باش اختیار کرنا چاہیں لیکن جو لوگ ہندستان میں رہتے ہیں اور رہنا چاہتے ہیں وہ اپنے وطن میں رہنے کا پورا حق رکھتے ہیں۔ ان کو محض پاکستان قائم ہو جانے کی بنا پر ان کے اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کشمیر پر ہندستان کا کوئی حق نہ ہو اور جو غیر مسلم پاکستان کی سختیوں کی بنا پر ہندستان آ رہے ہیں ان کے سلسلے میں ہند پاکستان سے کسی قسم کا احتجاج نہ کر سکے حالاں کہ ان میں سے کوئی بات تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

اور اگر اس قسم کی باتیں کرنے والوں کا منشا یہ ہے کہ تحریک پاکستان میں حصہ لے کر یہاں کے مسلمانوں نے ہندستان کے ساتھ غدّاری کی ہے اور اس کی بنا پر وہ یہاں رہنے کا حق سلب کرا چکے ہیں تو یہاں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اول تو یہ بات اس عموم کے ساتھ کہی نہیں جا سکتی، کیوں کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بلکہ کم و بیش ان کی نصف آبادی جیسا کہ اس وقت کے انتخابات کی رائے شماریوں سے واضح ہو سکتا ہے، یا تو ہندوؤں سے بڑھ چڑھ کر قیام پاکستان کی مخالف رہی ہے، یہاں تک کہ اس کے پیچھے اس نے اپنی عزت و آبرو کی بھی کوئی پروا نہیں کی ہے، یا وہ اس معاملے میں بالکل غیر جانب دار رہی ہے اس لیے کم از کم یہ لوگ تو اس منطق کی زد سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور دوسرے تقسیم کے غلط یا صحیح ہونے سے قطع نظر کیا فی الواقع تحریک پاکستان کی حمایت ہر صورت میں غداری ہی کے ہم معنی ہے؟ کیا اس کی مخالفت کی طرح اس کی موافقت بھی خالص ملکی مفاد کے تحت نہیں کی جا سکتی تھی؟ پھر آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ راجہ جی نے اس تحریک کے ابتدائی دور ہی میں اس کی حمایت کا ''جرم'' کیا تھا لیکن وہ اسی سزا کے مستحق نہیں سمجھے گئے جو مسلمانوں کے ضمن میں پیش کی جاتی ہے بلکہ وہ اس کے برعکس آزاد ہند کی طرف سے پہلے ہندستانی گورنر جنرل منتخب کیے گئے اور اب بھی وہ حکومت ہند کے ایک اعلیٰ ذمہ دار وزیر ہیں۔ اور

اگر یہ حمایت جرم ہی تھی تو اس کی وجہ کیا ہے کہ ہندستان کے لیڈروں نے خود اپنی مرضی سے تقسیم کو قبول کیا اور ایک چھوٹی سی اقلیت کو چھوڑ کر سب نے اپنی خاموشی سے اس پر مہر تصدیق ثبت کی اور تیسرا سوال یہ بھی ہے کہ اگر یہ تقسیم ملک کے ساتھ غداری ہے تو کیا اس جرم کے مرتکب وہ لوگ نہیں ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے طرز عمل سے مسلمانوں کو ایک علیٰحدہ قوم ہونے کا حساس دلایا اور پھر اپنے طرز عمل سے مسلسل اس احساس کو طاقت ور بناتے رہے تا آں کہ اس نے ایک مضبوط تحریک کی شکل اختیار کر لی اور مجبوراً ملک کو دو حصوں میں تقسیم ہونا پڑا۔ ہمارے نزدیک یہ لوگ اس جرم کے اصل مجرم ہیں اسی لیے اگر اس کی کوئی سزا دی جانی مناسب ہے تو وہ اس سے زیادہ نہیں تو کم از کم مساوی درجہ میں ضرور مستحق ہیں۔

بہ ہر حال جہاں تک آئین ہند کا اور واقعات وحقائق کی شہادت کا تعلق ہے، مسلمانان ہند کے لیے کوئی ایسی مجبوری درپیش نہیں ہے کہ وہ اس ملک کو خیر آباد کہنے کے لیے اپنے کو مجبور سمجھیں۔ اب رہی یہ بات کہ آئین ہند ایک کاغذی دستاویز ہے جس کا واقعات سے کوئی خاص ربط نہیں ہے یا ان کے حقوق کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کو کوئی سننے اور ماننے والا نہیں ہے تو یہ بات ایک حد تک درست ہوسکتی ہے لیکن اس کے ساتھ اگر اس بات پر بھی نگاہ رکھی جائے کہ اس وقت حالات جیسے کچھ بھی ہیں ہمیشہ ایسے ہی نہیں رہ سکتے اور جہاں ان کا یہ ایک رخ ہے جو ہمارے لیے موجب پریشانی ہوسکتا ہے وہیں اس کا ایک رخ ایسا بھی ہے جو اطمینان وتشفی کا باعث ہوسکتا ہے تو یقیناً ان کے موجودہ مایوسانہ اور مضطربانہ نقطۂ نظر میں بہت کچھ تبدیلی واقع ہوسکتی ہے۔ آئین و دستور یا قانون عدل وانصاف کے احترام کا جذبہ فی الحال کتنا ہی کم زور کیوں نہ ہو، آزادی اور نظم وانصرام کی ذمہ داریاں خود رفتہ رفتہ اس کا احساس پیدا کر دیں گی اور بہ ہر حال یہ پہلو ہر حیثیت سے مایوس کن نہیں ہے۔ آئین پورے ملک کا نہ سہی لیکن اس کے معتد بہ حصہ کی خواہشات وجذبات کا بہ ہر حال مظہر ہے اور یہ طبقہ مسلمانوں کی محبت میں نہیں بلکہ خود اپنے ملکی مفاد کی خاطر اس بات پر مجبور ہے کہ وہ اس کا احترام کرے اور لوگوں سے اس کا احترام کرائے کیوں کہ اس کے بغیر یہی نہیں کہ دنیا کی نگاہوں میں ہندستان ذلیل وخوار ہو جائے گا بلکہ اس کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔

بہ ہر حال اس وقت مسلمانوں کے لیے یہ بات بنیادی طور سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ حالات کے ان دونوں پہلوؤں میں صحیح توازن پیدا کرنے کی کوشش کریں اور خواہ مخواہ اضطراب و پریشانی میں اس کے کسی ایک پلڑے کو جھکنے نہ دیں، ورنہ اس کا انجام ان کے مستقبل کے لیے نہایت خطرناک ہوگا۔ اور اس ضمن میں سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں اور خود اپنے بل پر جینے کی کوشش کریں، جب تک یہ بات پیدا نہیں ہوگی، واقعی آئین و دستور کی دفعات ان کے لیے ناکارہ ثابت ہوں گی۔ دنیا میں زندگی کا حق انھیں قوموں کو حاصل ہے جو مشکلات ومصائب سے جلد گھبرا نہیں جاتیں بلکہ عزم وہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہوجاتی ہیں، اور وہ قومیں جو مشکلات کے آگے سپر ڈال کر بیٹھ رہتی ہیں یا ان سے گھبرا کر راہ فرار اختیار کرتی ہیں ان کا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

(۳) معاشی مجبوریاں

آج جو لوگ ہندستان چھوڑ چھوڑ کر پاکستان جارہے ہیں، ان کی غالب تعداد ان لوگوں کی ہے جن کا بڑا عذر یہاں کی تنگیٔ معاش ہے۔ اس لیے ہم اس عذر پر علیٰحدہ بحث کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں۔

جہاں تک معاشی پریشانیوں کا تعلق ہے ہمیں اس کے واقعہ ہونے سے انکار نہیں ہے اور نہ ہم اپنے اندر یہ جرأت ہی پاتے ہیں کہ ہم معاشی تنگی کی حالت کو نظر انداز کرکے اس عذر کی بنا پر ترکِ وطن کرنے والوں کو ہر حال میں بزدل یا فراری ہونے کا طعنہ دیں لیکن اس کے ساتھ یہ کہنے کی ضرور جرأت کرتے ہیں کہ عام طور سے اپنے مایوسانہ طرز فکر کی بنا پر اس مسئلہ کو اس سے زیادہ بھیانک بنالیا گیا ہے جتنا کہ وہ فی الواقع ہے، اس سوال سے تو ہم آگے بحث کریں گے کہ ترکِ وطن ہمارے مصائب کا علاج ہے یا نہیں اس لیے اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم یہاں صرف اس مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ کیا فی الواقع ہمارے لیے معاش کے تمام دروازے اس طرح بند ہوچکے ہیں کہ اب ہمیں اپنا رزق کہیں اور ہی تلاش کرنے کی ضرورت ہے؟

ہم اس خیال سے متفق نہیں ہیں اور اس کے وجوہ مختصراً درج ذیل ہیں۔

(الف) ہماری معاشی پریشانیوں کا بہت کچھ حصہ وہ ہے جو کچھ ہمارے ہی ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں دوسرے ابناء وطن اور دنیا کا بیش تر حصہ ہمارے ساتھ شریک ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے ہر ملک کے نظام معاش پر جو زبردست دباؤ ڈالا تھا کئی سال گزرنے پر بھی ابھی اس کے اثرات ختم نہیں ہو سکے ہیں اور پھر اس کے بعد جو تیسری جنگ عظیم کی تیاریاں فوراً شروع ہو گئی ہیں وہ بھی اس نظام میں سخت ترین اختلال کا موجب ہیں، ظاہر ہے ان وجوہ سے جو معاشی دقتیں لاحق ہو رہی ہیں ان کا کوئی تعلق ہندو مسلم سوال سے نہیں ہے وہ سب کے لیے یکساں ہیں، یہاں تک کہ جن ملکوں کو ہم اپنی جائے پناہ کے لیے منتخب کرنا چاہتے ہیں وہاں بھی ان کے اثرات نمایاں ہیں پھر ان سے خاص طور سے ہمارے گھبرانے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔

(ب) کچھ پریشانیاں ایسی ہیں جو ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے باشندوں کو خاص طور سے تقسیم کے نتیجے میں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں کیوں کہ تقسیم کے بعد نظم حکومت میں عارضی طور سے اختلال کا پیدا ہو جانا ایک ناگزیر بات تھی جس کے اصل حالت پر آنے کے لیے بہ ہر حال ایک خاصی مدت درکار ہے اور اس کے ساتھ اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس ملک کے لیے ذمے دارانہ حکومت کا تجربہ ایک بالکل نیا تجربہ ہے اس لیے شروع شروع میں طرح طرح کی بدعنوانیوں اور خرابیوں کا پیش آنا ایک بالکل قدرتی بات ہے اور ان خرابیوں سے نظام معاش کا بہت گہرا ربط ہے مثلاً ایک سابق وزیر کے بہ قول ہمارے وزیروں نے اپنی حماقت سے کروڑوں روپیہ احمقانہ اسکیموں پر برباد کر دیے ہیں اور ایسے ہی ان کی ناتجربہ کاری یا پستیِ ذہن کا اثر دوسرے طریقوں سے بھی خود نمودار ہوتا ہے اور ایک عرصہ تک اس کا خمیازہ چار و ناچار بھگتنا ہے، جہاں بانی کوئی کھیل نہیں ہے مدتوں بعد اس کا صحیح سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔ تقسیم نے دونوں ملکوں کے معاشی وسائل میں بھی بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہے جس سے ان کی معاشیات کا متاثر ہونا ایک بالکل قدرتی بات ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں دونوں ملکوں پر پناہ گزینوں کا بہت بڑا بار آ پڑا ہے اور ان کی وجہ سے معاشی نظام میں سخت برہمی پیدا ہو گئی ہے، لاکھوں کی تعداد میں نئے لوگوں کی غیر متوقع آمد کوئی معمولی بات نہیں ہے، صرف ان کو بسانے پر کروڑوں روپے صرف ہو گئے اور اب تک اس کا بھی کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا، ان کے لیے مکان اور معاش کا ذریعہ فراہم

کرنا اس سے بھی بڑا اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔

ان وجوہ سے جو پریشانیاں پیش آتی ہیں وہ سب کے لیے عام ہیں اور ان سے کوئی مفر نہیں ہے۔

(ج) معاشی پریشانیوں کا ایک بڑا سبب ملک کی عام بداخلاقیاں، چور بازاری، رشوت ستانی، اقربا پروری، خیانت اور خودغرضی وغیرہ ہیں۔ ان کی بنا پر جو پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں وہ مسلمانوں کے لیے خاص نہیں ہیں، وہ سب کے لیے ہیں، اور پھر دنیا کے عام بگاڑ کی وجہ سے یہ بیماریاں ہر جگہ عام ہیں اس لیے ان کو ہر حال میں فرقہ پرستی کا نتیجہ خیال کر کے ان کی بنا پر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ان کی طرح ہمیں بھی ان کو سہنا چاہیے اور ہمت ہو تو ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

غرض ہماری بہت سی پریشانیاں تو ایسی ہیں جو خاص ہمارے لیے نہیں ہیں بلکہ ان میں دوسرے لوگ بھی ہمارے شریک حال ہیں اس لیے اس طرح کی پریشانیوں کو ہر حال میں تعصب اور فرقہ پرستی کا نتیجہ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ ان کو ان کے اصل اسباب ہی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے، اس طور سے توقع ہے ان کی مایوسی اور کرب و بے چینی کی موجودہ کیفیت بہت کچھ بدل جائے گی۔

اب رہیں وہ پریشانیاں جو واقعی خالص فرقہ پرستی اور تعصب کی پیداوار ہیں اور جو مسلمانوں کو محض مسلمان ہونے کی بنا پر پیش آرہی ہیں تو بلاشبہ وہ بہت زیادہ اور بہت سخت ہیں اور ان کا حل واقعی کوئی آسان بات نہیں ہے۔ لیکن یہاں بھی ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان اگر مایوسی چھوڑ کر ہمت و عزیمت کا سہارا لیں تو وہ اب بھی ان کے ازالہ و تخفیف کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

(۱) اس سلسلے میں سب سے پہلے جس بات کی ضرورت ہے وہ خود اپنے فکر و ذہن کی اصلاح ہے جس کے سلسلے میں یہ چند حقیقتیں جو ان کے ایمان کا جزو ہیں ہر وقت شدت کے ساتھ ان کے سامنے رہنی چاہئیں۔

اس دنیا کا ایک خالق اور رب ہے جس کے ہاتھ میں تمام دنیا کا رزق ہے وہ بڑا رحمٰن اور رحیم ہے، اس کا دست قدرت بہت وسیع ہے، زمین و آسمان کے خزانے اس کے پاس ہیں،

اس کی مرضی کے بغیر نہ کوئی کسی کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، جب وہ کسی کو کچھ دینا چاہتا ہے تو اس کا کوئی ہاتھ پکڑ نہیں سکتا اور جب وہ محروم کرنا چاہے تو کوئی اس کو دست کشائی پر مجبور نہیں کر سکتا اور جو لوگ اس پر بھروسا کرتے ہیں ان کو وہ اپنی بخشش سے کبھی محروم نہیں کرتا اور وہاں سے دیتا ہے جہاں ان کا وہم و گمان بھی نہ پہنچا ہو۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ (الطلاق:۲، ۳)

''اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا، اللہ اس کے لیے راہ پیدا کرے گا اور اس کو اس جگہ سے روزی دے گا جہاں سے اسے خیال تک نہ ہوگا۔''

یہ اور اس طرح کے عقائد جو اسلام نے سکھائے ہیں اگر پورے شعور و احساس کے ساتھ ذہن میں مستحضر رہیں تو اس کا فائدہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ ہماری مایوسیاں کافور ہو جائیں گی بلکہ ہم میں حالات کے مقابلہ کی ایک خاص قوت پیدا ہو جائے گی جو مشکل سے مشکل حالات میں ثابت قدم رکھ سکے گی۔

اور اگر اس کے ساتھ مسلمان یہ بھی کریں کہ وہ اپنے معاش کی ادھیڑ بُن سے کچھ وقت خارج کر کے اپنی خلقت کی اصل غرض و غایت اور امت مسلمہ کے حقیقی نصب العین پر بھی غور کر لیا کریں اور اس کے لیے کچھ جد و جہد پر آمادہ ہو جائیں تو وہ دیکھیں گے کہ محض ان کی اس جد و جہد کے نتیجے میں ان کی کتنی پریشانیاں دور ہوگئی ہیں کیوں کہ یہ واقعہ ہے آج دنیا میں جو اتنی بداخلاقیاں عام ہوگئی ہیں وہ اس بات کا نتیجہ ہیں کہ جن لوگوں کے سپرد ان کی اصلاح کا کام کیا گیا تھا وہ اس سے زیادہ معاش کی فکر میں الجھ گئے اس لیے اوروں کے ساتھ وہ خود بھی ان کے نتائج بھگتنے پر مجبور ہو گئے۔ اور اگر بالفرض ایسا نہ ہو سکے یا ایسا ہونے میں تاخیر ہو تو غرض و غایت اور نصب العین کی فکر پیدا ہونے کا یہ فائدہ تو کہیں نہیں گیا ہے کہ فکر معاش کی بندشیں بہت کچھ ڈھیلی ہو جائیں گی بلکہ یہ پریشانیاں ہی راحت کا ذریعہ بن جائیں گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ

اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ (حٰم السجدۃ:۳۰،۳۱)

''یقیناً وہ لوگ جنھوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ ثابت قدم ہو گئے ان پر فرشتے نازل ہوں گے کہ نہ خوف کھاؤ نہ مغموم ہو اور اس جنت کی خوش خبری پاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہم دنیا کی زندگی میں تمھارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی ساتھی ہیں۔''

(۲) اس بنیادی تبدیلی کے ساتھ مسلمانوں کو لازماً حسب ذیل باتوں کا پابند بن جانا چاہیے اس سے بھی ان کو معاش کا مسئلہ حل کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

(الف) ہر چھوٹے بڑے معاملے میں انتہائی کفایت شعاری سے کام لیا جائے۔ یہ بدقسمتی سے مسلمانوں کا خاصہ رہا ہے کہ وہ دنیا کی مفلس ترین قوم ہوتے ہوئے بھی انتہائی مسرف ہے۔ یہ بات پہلے بھی غلط تھی لیکن اب اس کا باقی رہنا انتہائی مہلک ہے اس بارے میں بنیادی طور سے جو باتیں پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اپنے مال و دولت کا اپنے کو مالک نہ سمجھیں بلکہ اس کا دینا سمجھیں اور اسے خرچ کرنے سے پہلے سوچ لیں کہ اس کے مالک حقیقی نے جن کاموں میں اور جن حدود کے اندر رہ کر خرچ کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان کے اندر ہی وہ صرف کر رہے ہیں یا نہیں ورنہ وہ اس کے مواخذہ سے ڈریں کیوں کہ قیامت کے دن اور باتوں کے ساتھ اس بارے میں بھی ان سے باز پرس ہوگی کہ دنیا میں اس کی دولت کا مصرف کیا جا رہا ہے۔

لا یزول قد مَاابُن اٰدم یوم القیامة حتّی یسْئل عن خمس عن عمره فیما افناهُ وَعَنْ شبابه فیماابُلاه وعن مالهٗ من اینَ اکتسبه وفیما انفقهٗ وماذا عمل بما علم۔

''کوئی انسان قیامت کے دن اللہ کے حضور سے ہٹ نہیں سکتا جب تک کہ اس سے پانچ باتوں کی باز پرس نہ ہو جائے، عمر کے بارے میں کہ اسے کس کام میں کھپایا، اپنی جوانی کے بارے میں کہ اسے کس چیز میں گزار کر پرانا کیا، مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کس مصرف میں صرف کیا اور یہ کہ اپنے علم پر کتنا عمل کیا۔''

مال و دولت کے بارے میں یہ بنیادی تصور از خود انسان میں تبدیلی پیدا کر دے گا کہ وہ

اپنی ضروریات کا فیصلہ دنیاداروں کا معیار زندگی سامنے رکھ کر نہ کرے اور نہ اس بارے میں جگ ہنسائی کے اندیشہ کو اپنے فیصلے پر اثر انداز ہونے کا موقع دے۔ اور یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہوگی کیوں کہ آج ہماری بہت کچھ اقتصادی پریشانیاں ہمارے اس غلط تصور کا ہی نتیجہ ہیں کہ ضرورت وہ ہے جسے عرف عام میں ضرورت کہا جاتا ہے اور جس کا پاس ولحاظ سوسائٹی میں معزز بننے کے لیے ضروری ہے۔ حالاں کہ ایک مسلم کا نقطۂ نظر یہ ہونا چاہیے کہ ضرورت وہ ہے جسے احکام دین نے ضروری قرار دیا ہو اور ایک مسلم کی عزت احکام دین کی تعمیل میں ہے نہ کہ ان کے حدود توڑنے میں۔

(ب) ہماری پریشانیوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے

اَفْضَلُ الْغِنَاءِ غِنَیُ النَّفْسِ

''بہترین غنی نفس کا غنی ہے۔''

کے زریں اصول کو چھوڑ دیا ہے اس لیے بہت سے لوگ بہت کچھ رکھتے ہوئے بھی ہمیشہ اپنے کو مصیبت میں پاتے ہیں۔ یہ بھی اسلامی ہدایات کو نظر انداز کرنے ہی کی سزا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ (النسآء:۳۲)

''اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے سے زیادہ جو چیزیں دی ہیں ان کی تمنا نہ کرو۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لَا تنظروا الیٰ من هو فوقكم

''ان لوگوں کو نہ دیکھو جو (دولت دنیاوی میں) تم سے اوپر ہیں۔''

(ج) ہماری موجودہ معاشی پریشانیوں کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے توکل کا مفہوم نہایت غلط سمجھا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جب ہمارا رزق مقسوم ہو چکا ہے تو وہ ہر صورت میں ہمیں مل کر رہے گا اس لیے ہم معاش کے لیے کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں سمجھتے حالاں کہ یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ رزق مقسوم بے طلب مل جائے گا، یہ کارخانۂ قدرت علت ومعلول کے سلسلے سے جکڑا ہوا ہے، اس لیے طلب وجستجو اور حصولِ رزق کے مناسب وسائل وذرائع بہ ہر حال اختیار کرنے پڑیں گے، قضا وقدر کا عقیدہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم بغیر کچھ کیے پالینے کی امید میں

مبتلا ہو جائیں بلکہ اس لیے ہے کہ ہم اس کو اچھے طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اور کوشش کر کے نتیجہ اللہ کے حوالے کر دیں، اپنی کوششوں اور تدبیروں ہی کو سب کچھ نہ سمجھ لیں:

الاوان نفسًا تموت حتی تستکمل رزُقها فاجملوا فی الطلب وتوکلوا علیه۔

"خوب جان لو کہ کوئی متنفس اس وقت تک مر نہیں سکتا یہاں تک کہ اپنا پورا رزق حاصل نہ کر لے۔ پس رزق کے اچھے ذرائع اختیار کرو اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرو۔"

توکل کی اصل حقیقت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک سے بھی روشنی پڑتی ہے جو آپؐ نے ایک بدو کو جو "**متوکلا علی اللّٰه**" اپنی اونٹنی باہر چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، مخاطب کر کے فرمایا تھا:

اعقلها ثم توکل

"پہلے اس اونٹنی کو باندھ لو پھر اللہ پر بھروسا کرو۔"

بہ ہر حال توکل کے غلط تصورات بھی دور ہونے چاہییں کیوں کہ ان کی وجہ سے یہ عقیدہ بہ جائے عزم و حوصلہ اور جوش عمل پیدا کرنے کے آج بہتوں کے لیے بے عملی و جمود کا سبب بن گیا ہے۔

(د) مسلمانوں کی موجودہ پریشانیوں میں کچھ دخل ان کی اس خام خیالی کو بھی ہے کہ وہ نوکری کو تو سرمایہ عزت سمجھتے ہیں لیکن تجارت، زراعت اور حرفت وغیرہ کو وہ عزت وقار کے منافی سمجھتے ہیں اور پھر انھوں نے پیشوں پیشوں میں بھی اپنے خود ساختہ معیار عزت و شرافت کی بنا پر مختلف درجے ان کے جائز و ناجائز یا مستحسن و قبیح ہونے کی بنا پر قائم کر لیے ہیں۔ یہ سب جاہلانہ تصورات ہیں جن کو چھوڑنا ضروری ہے۔ ہمیں اپنی ضروریات زندگی ہر اس ذریعے سے حاصل کرنی چاہیے جو شریعت میں جائز ہو خواہ اس سے سوسائٹی میں آپ کی ناک ہی کیوں نہ کٹ جائے اور آپ کا مرتبہ دنیا داروں کی نگاہ میں پست ہی کیوں نہ ہو جائے۔

موجودہ حالات میں ان خود ساختہ تصورات عز و شرف کے ساتھ واقعی عزت کی زندگی گزار لے جانا بہت دشوار ہے اس لیے یا تو اس زندگی سے دست برداری دے دیجیے یا ان تصورات کو خیر باد کہیے، ان دونوں کو بیک وقت نبھایا نہیں جا سکتا۔

یہ تبدیلیاں جو دیکھنے میں بہت معمولی ہیں اگر واقعی طور سے عمل میں لائی جائیں تو ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کو بہت کچھ غموں سے فوری طور سے نجات مل سکتی ہے۔ رہا سوال ان سے بالکلیہ نجات کا تو یہ صحیح معنوں میں اسی وقت ممکن ہے جب انسانی ذہن کا موجودہ بگاڑ دور ہو اور نظام حکومت میں جو بنیادی خرابیاں مادہ پرستانہ افکار وتصورات کی اشاعت سے پیدا ہو گئی ہیں ان کو دور کر کے اسے پھر سے خدا پرستی کی صحیح بنیادوں پر استوار کیا جائے، ہاں تھوڑی بہت تبدیلی کے لیے وہ ذرائع مفید ہو سکتے ہیں جو تعصب وفرقہ پرستی وغیرہ کے ازالہ کے ضمن میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں اور صحیح بات تو یہ ہے کہ

قیدِ حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

البتہ یہاں ایک غم دوسرے غم سے بدلا جا سکتا ہے مثلاً غم روزگار غم عشق میں تبدیل ہو سکتا ہے اسی بنا پر کہنے والے نے کہا۔

غم گرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

اور یہ غم عشق اگرچہ ایک درد بے دوا ہے لیکن ہزاروں دردوں کی دوا بھی یہی ہے بلکہ حقیقت زیست یہی ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

اور یہ انسان کی اپنی بلندی وپستی فکر وخیال پر موقوف ہے کہ وہ اپنے عشق ومحبت کا محور کس چیز کو بناتا ہے، مال ودولت، عزت وشہرت، خدمت نفس، خدمت قوم، خدمتِ ملک کو؟ یا اس ہستی کو جو خزائن السمٰوات والارض کی مالک ہے، عزت ذلت جس کے ہاتھ میں ہے، جو نفس قوم اور ملک سب سے بڑی ہے اور سب سے زیادہ انسان پر اپنا حق رکھتی ہے اور جس سے تعلق انسان کے ہر غم اور ہر دکھ کا علاج ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ (الرعد:۲۸)

''جان لو اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو سکون ہوتا ہے۔''

اور اسی بنا پر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (البقرہ:۱٦۵)

''ایمان والے سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرتے ہیں۔''

کیا ترک وطن علاج ہے

آیئے اب اس بحث کے دوسرے جز ـــــ یعنی کیا ترک وطن ہماری مجبوریوں کا علاج ہے ـــــ پر کچھ غور کریں۔

اس مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ اس وقت افراد و ذات کا معاملہ زیر غور نہیں ہے، بہت سے ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جن کی پریشانیاں ممکن ہے ترک وطن کے ذریعے رفع ہو سکیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا کر کے وہ اپنی زندگی کو زیادہ بہتر اور شان دار بنا سکیں اور ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، بہت سے لوگوں کے لیے بہت سے حالات میں شرعاً بھی ترک وطن کی پوری گنجائش ہے لیکن یہ مسئلہ پوری قوم و ملّت سے متعلق ہے اس کے مجموعہ یا کم از کم اس کی اکثریت کو سامنے رکھ کر اس مسئلے پر غور کرنا ہے اور اس کے ضمن میں ہمارا خیال یہ ہے کہ ترک وطن ہمارے مسائل کا کوئی حل نہیں ہے بلکہ یہ ان کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دینے کے مترادف ہے۔ اور اس کے وجوہ مختصراً درج ذیل ہیں:

(الف) یہ ممکن نہیں ہے کہ ہندستان کے تمام مسلمان ترک وطن کر سکیں۔

(۱) ان میں کتنے ایسے ہیں جو اپنی جائداد و املاک کسی طرح چھوڑنے پر راضی نہیں ہیں، ان کے لیے ان کو چھوڑنے کے مقابلے میں خود اسلام کو چھوڑ دینا زیادہ آسان ہے۔

(۲) کتنے ہیں جن کو اپنے بزرگوں کے مقابر و آثار اتنے عزیز ہیں کہ وہ شدید خطرات برداشت کر کے بھی یہیں رہنا چاہتے ہیں۔

(۳) کتنے ہیں جن کو یہاں رہنے پر نہ مذہبی حیثیت سے کوئی تردد ہے اور نہ معاشی حیثیت سے کوئی پریشانی درپیش ہے، وہ خواہ مخواہ یہ مصیبت کیوں مول لیں۔

(۴) کتنے ہیں جو خالص دینی اغراض کے لیے یہاں رہنا چاہتے ہیں اور وہ اس کے لیے ہر قسم کا خطرہ اس وقت تک برداشت کرنا چاہتے ہیں جب تک خود دین ہی ان کو ترک وطن پر مجبور نہ کرے۔

(۵) کتنے ہیں جو امید پرورانہ نقطۂ نظر کے مالک ہیں اس لیے وہ موجودہ مشکلات کو عارضی سمجھتے ہیں اور مستقبل کی امید پر وہ یہاں ہر صورت میں رہنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔

(۶) کتنے ہیں جو ترک وطن کے لیے بے تاب ہیں لیکن وہ **لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّلَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا** میں داخل ہیں۔

اور اس طرح کے اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ ایسی صورت میں جو لوگ ترکِ وطن کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں ان کو سوچنا چاہیے کہ ان کے ترک وطن کا انجام کیا ہوگا۔ حصہ پاکستان سے ہر قسم کے تعلقات منقطع ہو جانے کے بعد مسلمانوں کی مجموعی قوت یوں ہی بہت کم ہو گئی تھی پھر عین مصیبت میں ان کے لیڈروں نے جس طرح ان کا ساتھ چھوڑا ہے اس نے ان کے حوصلوں کو اور بھی زیادہ پست کر دیا ہے، اب اگر جانے کا سلسلہ ایسے ہی قائم رہا تو یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ پوری قوم یک دم اُٹھ کر پاکستان منتقل ہو جائے، مذکورہ اسباب کے تحت یہاں بہ ہر حال بہت کافی تعداد میں مسلمان رہ جائیں گے پھر اس کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو لوگ کل مرتد ہونے والے ہیں وہ آج ہو جائیں اور جو لوگ اس کے لیے تیار نہیں ہیں وہ یہاں قیام یا خدمتِ دین کے سلسلے میں مزید مشکل و پریشانی سے دوچار ہو جائیں۔ ہر جانے والا خواہ وہ اپنی جگہ کتنی ہی حقیر حیثیت کیوں نہ رکھتا ہو وہ اپنی حیثیت کے بہ قدر یہاں مسلمانوں کی باقی ماندہ قوت میں کمی کا باعث ہوتا ہے اس لیے جو لوگ واقعی ترک وطن پر کسی سبب سے مجبور نہ ہو گئے ہوں، ان کے ماسوا جو لوگ بھی ترک وطن کرتے ہیں وہ بحالات موجودہ ایک شدید ترین ملّی و مذہبی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ہر مسلمان جسد ملّت کا ایک جز ہے اس لیے اسے ترک وطن کرتے وقت بہ ہر حال سوچنا چاہیے کہ اس کے اس فیصلے کا بقیہ اعضاء جسم پر جو یہاں رہ جائیں گے کیا اثر پڑے گا۔ اس طرح کے مواقع پر ذاتی مفاد کو عمومی ملّی مفاد پر ترجیح دینا انتہائی خود غرضی کی بات ہے۔

پھر اس عمومی نقصان کے ماسوا ترک وطن کے اور بھی متعدد نقصانات ہیں، مثلاً بہت

سے لوگ ایسے ہیں جو خود ترک وطن کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے لیکن دوسروں کو جاتے ہوئے دیکھ کر گھبراہٹ میں خود جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں یا کم از کم اپنے قیام کے سلسلے میں متردد ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بے شمار اشخاص اپنی جائداد و اشیاء اونے پونے بیچ کر گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور پھر یا تو سرحد کو اپنے لیے بند پا کر پوری طرح لٹ لٹا کر اپنے اسی آشیانہ میں واپس آنے پر مجبور ہوتے ہیں جسے اپنے ہاتھوں برباد کر کے روانہ ہوئے تھے یا پاکستان جا کر در بدر ٹھوکریں کھاتے ہیں اور جو لوگ اس حد تک نہیں جاتے وہ اپنے تردد کی بنا پر اس حال میں زندگی گزارتے ہیں کہ کسی کام میں ان کا جی نہیں لگتا، ان کی صلاحتیں و قوتیں اور اگر سرمایہ والے ہیں تو ان کا سرمایہ ششں و پنج کی نذر ہونے لگتا ہے۔ اس طرح آج ان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ، غیر یقینی اور تذبذب کی حالت میں مبتلا ہونے کی بنا پر خود اپنا بھی نقصان کر رہا ہے اور اپنے اس طرز عمل کی بنا پر دوسرے غریب اور محنت کش مسلمانوں کو بھی انھوں نے سخت مصیبت میں ڈال دیا ہے کیوں کہ مسلمان جو مزدور یا سرمایہ دار ہیں ان کو کام یا کام کرنے والے نہیں ملتے، غیر مسلم ان کے ساتھ بغض برتتے ہیں اور خود اپنے یہ احتیاط کہ معلوم نہیں وہ کس وقت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان کا قصد کر لیں۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے نقصانات کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ترک وطن، ہماری کتنی مصیبتوں کی جڑ ہے۔ اس کے بعد اس سوال پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا واقعی پاکستان جا کر ان تمام مصیبتوں سے نجات مل جائے گی جو ہندستان میں پیش آ رہی ہیں؟ اگر ترک وطن کا محرک مذہبی نقطۂ نظر ہے تو اس وقت اس حیثیت سے پاکستان کا جو حال ہے اس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے کہ اس پہلو سے وہاں بھی کچھ زیادہ اطمینان کا سامان نہیں مل سکتا بجز اس کے کہ ایک قرارداد مقاصد پاس کر لی گئی ہے جس سے زیادہ سے زیادہ ان کے آئندہ عزم کا اظہار ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ سر دست عملاً وہاں بھی قریب قریب وہی صورت حال ہے جو ہندستان میں درپیش ہے۔

ابھی تک وہاں کتنی ہی محرمات شرعی علانیہ نافذ ہیں جن کی شریعت میں مطلقاً گنجائش نہیں ہے اور تمام کاروبار اسی انداز میں چل رہے ہیں گویا اب بھی وہاں کے لوگ برطانوی

حکومت کے تحت ہی زندگی گزار رہے ہیں پس جب حالت یہ ہو تو اس کے سوا اور کوئی بات اطمینان بخش نہیں ہوسکتی کہ یہ سب کچھ اپنوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ رہی یہ بات کہ وہاں جا کر آپ اپنے دینی نقطۂ نظر کے تحت حالات میں تبدیلی کی کوشش کریں گے تو ہندستان اس کا زیادہ سے زیادہ مستحق ہے کیوں کہ یہاں اس قسم کی جدوجہد کی ضرورت زیادہ شدید ہے اور اس کے لیے راہیں ابھی تک بند نہیں ہیں۔ کم از کم تجربہ سے پہلے اس کی طرف سے مایوس ہو جانا کوئی صحیح بات نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات میں آپ کے مذہبی حس کو نسبتاً کچھ زیادہ مجروح کرنے والی باتوں کا سامنا کرنا پڑے لیکن جب آپ کے یہاں قیام کا مقصد مذہبی ہوگا تو اس قسم کی باتیں سہنے کی مذہباً گنجائش نکل سکتی ہے اور ممکن ہے آپ اس پر زیادہ اجر وثواب پانے کے مستحق قرار پائیں۔ ان حالات میں آپ کیوں یہ فیصلہ نہ کریں کہ کم از کم اس وقت تک یہاں رہ کر آپ کو دین کی خدمت بجالانی ہے جب تک دین ہی آپ کو مجبور نہ کردے کہ اس ملک کو خیر باد کہہ دینے کا وقت آ گیا۔ اس وقت آپ کا ترک وطن کا فیصلہ بالکل حق بہ جانب ہوگا اور ہمیں یا کسی کو اس پر معترض ہونے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

(ب) اور اگر آپ کے اس فیصلے کا محرک یہاں کی معاشی مشکلات ہیں تو اس پر بھی چند پہلوؤں سے غور کر لینے کی ضرورت ہے۔

(۱) معاشی پریشانیوں کے ضمن میں ہم نے متعدد ایسے اسباب کا ذکر کیا ہے جو ہندستان ہی کے لیے خاص نہیں ہیں بلکہ وہ پاکستان اور دنیا کے دوسرے حصوں کے لیے بھی عام ہیں بلکہ ان میں سے چند اسباب تو ایسے ہیں کہ وہ پاکستان میں نسبتاً زیادہ وسعت وشدت کے ساتھ اپنا اثر دکھلا رہے ہیں۔ ان اسباب کی موجودگی میں یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ ان اسباب کی حد تک آپ پاکستان جا کر اپنی موجودہ مصیبتوں سے نجات پا جائیں گے۔

(۲) پاکستان جانے والوں کا جو حال ہے وہ کسی پر چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس کی ہولناک اور عبرت انگیز داستانیں خود پاکستانی اخبارات ورسائل میں دیکھی جاسکتی ہیں، جو لوگ کچھ وسائل وذرائع رکھتے ہیں یا جن میں ہر طرح کے حالات کو مفید مقصد بنانے کی صلاحیت ہے ان کو چھوڑ دیجیے کیوں کہ اس قسم کے لوگ ہندستان میں بھی کچھ گھاٹے میں نہیں ہیں لیکن ان کے علاوہ عام

طور سے جو لوگ ترک وطن کر کے وہاں گئے ہیں وہ ہر حال میں اچھے ہی نہیں ہیں، ان کی اکثریت اس جنت میں پہنچ کر بھی پریشاں حال ہی ہے۔ شروع شروع میں تو ایسا ضرور ہوا تھا کہ مہاجرین کے لیے لوگ اپنا دیدہ و دل فرشِ راہ بنا رہے تھے اور حکومت بھی ان کی خدمت و اعانت کے لیے ہر طرح مستعد تھی لیکن یہ کیفیت چند روز کے بعد ہی بدلنی شروع ہو گئی اور اب تو وہاں خود غرضیوں، نفس پرستیوں، نسلی گروہ بندیوں اور صوبہ جاتی عصبتیوں کا زور شور ہے جس میں مہاجرین کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ خود حکومت کا حال یہ ہے کہ وہ ان مہاجرین کو دوبارہ ہندستان واپس بھیجنے کے لیے بے قرار ہے اور ان کی مزید آمد کو ہر قیمت پر روک دینا چاہتی ہے۔ جہاں تک اس کے اختیار میں ہے وہ خود اس کے لیے تدبیریں کر رہی ہے۔ اور مزید برآں اس سلسلے میں متعدد بار حکومت ہند سے امداد کی خواہش کر چکی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے۔ اس کا رقبہ اور اس کی پیداوار زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کے لیے کافی ہو سکتی ہے جو اس ملک کے رہنے والے ہیں یا کھینچ تان کر چند لاکھ مہمانوں کا اس میں بندوبست ہو سکتا ہے لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہاں کے مسلمان اپنا حصہ یہاں چھوڑ کر منتقل ہو جائیں اور پاکستان سب کے لیے جگہ اور روزی فراہم کرے؟ اس کا انجام یہی ہو سکتا ہے کہ سب تنگی میں مبتلا ہو جائیں اور خاص اس وجہ سے اس کے لیے نئے نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں یا پھر پاکستان ان مہاجرین کا حصہ ہندستان سے طلب کرے جس کا تصفیہ بہ حالاتِ ظاہر جنگ کے بغیر ممکن نہیں ہے جو دونوں ملکوں کے لیے تباہ کن چیز ہے اور ان باتوں کو بھی جانے دیجیے، ممکن ہے پاکستان کی زمین اللہ کی قدرت سے سونا اگلنے لگے اور مہاجرین اپنے حسنِ کار اور حسن تدبیر سے اسے ہر طرح مالا مال کر دیں لیکن موجودہ حکم رانوں کا دل وہ کس طرح بدل دیں گے جن کو یہاں کے مسلمانوں کا غم تو بہت زیادہ ہے چناں چہ وہ اکثر اپنی تقریروں میں ان پر آنسو بہایا کرتے ہیں لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہ ناخواندہ مہمان بن کر وہاں پہنچیں اور ان کے سکون و راحت میں خلل انداز ہوں۔ برقبہ اور پیداوار کی وسعت و فراخی ایک ثانوی چیز ہے اس سے پہلے دل کی وسعت و فراخی درکار ہے اور موجودہ حکم رانوں سے اس کی توقع کرنا محض حماقت ہے۔ انصار کی صفت جو قرآن مجید میں مذکور ہوئی ہے:

وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر:۹)

''وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود فقر وفاقہ میں ہوں۔''

وہ یوں ہی پیدا نہیں ہو جاتی اس کے لیے بہت مضبوط عقیدہ و کردار کی ضرورت ہے اور جو لوگ اسلام سے زیادہ مغرب کے مادہ پرستانہ افکار ونظریات کے دل دادہ ہیں ان سے کسی بے غرض ہم دردی و دل سوزی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

ان حالات میں ہمارا خیال یہ ہے کہ ہندستان کے عام مسلمانوں کو پاکستان جانے کا خیال چھوڑ کر مضبوطی اور دل جمعی کے ساتھ یہاں رہنے کا فیصلہ کرنا چاہیے اور یہاں کے حالات کو سازگار بنانے کی پوری جدوجہد کرنی چاہیے جس کے لیے مواقع بہ ہر حال مفقود نہیں ہیں تا آں کہ خدانکردہ واقعی عمومی ہجرت کے دینی تقاضے پیدا نہ ہو جائیں۔ اس وقت یقیناً ان کو یہ فیصلہ کرنے کا حق ہوگا بلکہ یہ ضروری ہو جائے گا اور اس موقع پر کسی زحمت ومشقت یا فائدہ ونقصان کا خیال کرنا بھی ناجائز ہو جائے گا۔ لیکن یہ وقت ابھی نہیں آیا ہے اور ہم توقع کرتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنے فرض کو پہچانیں اور عزم وہمت سے کام لیں تو ان شاء اللہ یہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔

خوشامد ولجاجت

خوف و ہراس کا تیسرا نتیجہ خوشامد و لجاجت ہے۔ چوں کہ ہم آگے مسلمانوں کی زمانہ سازی پر مفصل گفتگو کرنے والے ہیں اس لیے اس بحث کو ہم اسی موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

مستقل امراضِ ملّی

اب تک ہم نے مسلمانوں کے عارضی امراض اور ان کے علاج کی تدابیر پر گفتگو کی ہے۔ اب اس سے فارغ ہو کر ہم مستقل امراض پر گفتگو کرنی چاہتے ہیں۔

یوں ظاہری طور سے اگر دیکھا جائے تو مسلمان مختلف قسم کے مستقل امراض ملی کا شکار ہیں مثلاً وہ تعلیمی حیثیت سے بہت پیچھے گرے ہوئے ہیں، ان کی قومی سیرت پست ہے، سیاسی شعور و بے داری کی ان میں بڑی کمی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن چوں کہ یہ تمام امراض بہ جائے خود مرض نہیں ہیں بلکہ ایک بہت بڑے مرض کی شاخیں ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سب پر الگ الگ گفتگو کرنے کی بہ جائے ہم اصل مرض پر گفتگو کریں اور اس کے سلسلے میں جو علاج ہم مناسب سمجھتے ہیں اسے یہاں پیش کر دیں۔

ہمارے نزدیک کسی قوم کی بقاء و ترقی کے لیے سب سے مقدم اور بنیادی چیز یہ ہے کہ:

(الف) اس قوم کے سامنے کوئی واضح اور روشن مقصد اور نصب العین ہونا چاہیے جو اس کے حوصلوں کو بلند کر سکے، اس کے افراد کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کر سکے اور ان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کر سکے۔

(ب) اس مقصد و نصب العین کے ساتھ اس کا اتنا گہرا عشق اور لگاؤ ہونا چاہیے کہ وہ اس قوم کے ہر ہر فرد یا اس کی اکثریت کے رگ و ریشہ میں سما جائے اور وہ اس کے لیے اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی جان بھی قربان کر دینے پر آمادہ ہو جائے۔ جب تک یہ کیفیت پیدا نہیں ہوگی، محض مقصد کی تعین یا اس کا نام لیتے رہنا اس قوم کے لیے کچھ سود مند نہ ہوگا۔

(ج) مقصد جس طرح کا بھی ہو اس کو اپنانے سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا کیوں کہ یہ مقصد و نصب العین کا خاصہ ہے لیکن وہی مقصد حقیقی زندگی کا ذریعہ بن سکتا ہے جو بہ حیثیت مجموعی کائنات کے مجموعی نظام سے ہم آہنگ ہو ورنہ قدم قدم پر اس کا کائنات کی اصل کارفرما طاقتوں سے تصادم شروع ہو جائے گا جس میں اس مقصد کا دامن بہت جلد ہاتھ سے چھوٹ جائے گا یا وہ قوم ان طاقتوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ اور کم از کم مقصد کی صفت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اس قوم کے اصلی مزاج و افتادِ طبع اور اس کے حقیقی داعیات و مقتضیات کے مطابق ہو ورنہ وہ زیادہ دنوں تک اس قوم کے لیے موجبِ کشش نہیں رہے گا اور اگر حالات و اسباب کے تحت وہ اس کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے ہی پر مجبور ہو جائے تو تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنی تمام ملی خصوصیات کھو بیٹھے گی اور پھر اگر وہ اس مقصد کے تعلق کے طفیل میں کچھ تھوڑی سی زندگی حاصل بھی کر لے تو وہ اس قوم کی زندگی نہیں ہوگی بلکہ اس کی موت کے مترادف ہوگی اور وہ اپنی اصل حیثیت میں بالکل مردہ ہو چکی ہوگی۔

یہ تین باتیں جیسا کہ عقلاً سمجھ میں آ سکتا ہے اور زمانہ کے حالات و واقعات گواہی دیتے ہیں، قومی بقاء وارتقا کے لیے ضروری اوصاف ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایک عرصہ دراز سے مسلمانوں میں یہ تینوں باتیں، افسوس ناک حد تک مفقود رہی ہیں۔ ان کے سامنے کوئی واضح مقصد نہیں رہا ہے یا رہا ہے تو وہ ایسے مقاصد رہے ہیں جن کی ان کی اصل حیثیت سے کوئی مناسبت نہیں رہی ہے اور مقصد کا عشق تو کہنا چاہیے کہ بالکل ہی مفقود رہا ہے چناں چہ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا جسد ملی ان تمام امراض کا گھر بن گیا ہے جن کی طرف ہم نے اس فصل کی شروع میں اشارہ کیا ہے اور جن کا ذکر عارضی امراض کے ذیل میں اوپر گزر چکا ہے، آیئے اس موقع پر ہم اس پہلو سے اپنی حالت کا کچھ مختصر جائزہ لے لیں تاکہ علاج سے پہلے اپنے اس مرض کی صحیح نوعیت سے ہم آگاہ ہو سکیں۔

ملی انتشار کا جائزہ

۱۹۵۷ء سے پہلے مسلمان ان ضروری اوصاف کے لحاظ سے کتنے کم زور ہو چکے تھے

اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ انقلاب بہ جائے خود اس کی ایک عبرت انگیز داستان ہے کیوں کہ اگر ان میں یہ اوصاف کسی معمولی درجے میں بھی موجود ہوتے تو یہ انقلاب رونما ہی نہ ہوا ہوتا لیکن افسوس و حیرت تو اس بات پر ہے کہ اتنا بڑا انقلاب بھی ان کو خواب غفلت سے بے دار نہ کرسکا۔ یہ موقع تھا کہ وہ اپنی پچھلی کم زوریوں کی اصلاح کرتے، جو غلطیاں ان کے پچھلے اب تک کرتے آرہے تھے ان کی تلافی و تدارک کی تدابیر عمل میں لاتے اور زندگی کے ایک اعلیٰ نصب العین اور اس کو حاصل کرنے کے تازہ ارادہ و عزم کے ساتھ وہ میدان عمل میں اترتے لیکن اس موقع پر انھوں نے کچھ کیا تو یہ کیا' کہ ان کے پچھلے جو غلطیاں کرتے چلے آرہے تھے ان میں وہ اور زیادہ پختہ ہو گئے۔

ہمارے اسلاف کا عام وتیرہ اپنے دور اقتدار میں یہ رہا ہے کہ اسلام سے زیادہ ان کو اپنے حکومت و اقتدار کے بقاو تحفظ سے دل چسپی رہی ہے۔ چناں چہ وہ اس بات کی تو پوری کوشش کرتے رہے کہ اپنی فوجی طاقت اور سیاسی و معاشی دباؤ سے لوگوں کی گردنیں اپنے سامنے جھکواتے رہیں لیکن ان کو اس بات کی توفیق نہیں ہوتی کہ خود اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں، اپنے اخلاق و معاملات اور اپنی سیاست و حکم رانی میں اسلامی ہدایات کی پابندی کریں اور اپنی طاقتوں کو اسلام کی سچائی پھیلانے میں صرف کریں جس سے جسموں کے ساتھ لوگوں کے دل بھی فتح ہو سکتے تھے، ان باتوں کی طرف سے خال خال افراد کو چھوڑ کر ہمارے عام حکم راں اور مذہبی پیشوا اور دوسرے اہل ملّت افسوس ناک حد تک غفلت اختیار کرتے رہے، اسی طرح انقلاب ۱۹۵۷ کے بعد بھی عام طور سے یہ باتیں مسلمانوں کا مرکز توجہ نہیں بن سکیں لیکن چوں کہ اب اقتدار رخصت ہو چکا تھا اس لیے اس کے تحفظ و بقا کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ اس کے حصول کی کوشش جس حد تک ممکن تھی اس پر وہ اپنی کوشش صرف کرنے لگے اور اب فوجی و سیاسی قوت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی اس لیے اس کی بہ جائے انھوں نے غیر ملکی حکم رانوں سے مصالحت کی پالیسی اختیار کرلی اور اس طریقے سے وہ ہمسایہ اکثریت کے مقابلے میں اپنے سیاسی مطالبے اور دعوے منواتے رہے۔ اس طرح اس تمام مدت میں ان کو جو زندگی کی مہلت ملی تھی اس میں اپنی اخلاقی اصلاح کرنے اور اپنے بزرگوں کی غلطیوں کی تلافی کرنے کے بہ جائے محض معاشی اور سیاسی

فائدوں کے لیے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ کش مکش کر کے بظاہر یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے جینے کا سامان کرر ہے ہیں لیکن دراصل وہ اپنے ہاتھوں خود اپنی قبر کھود رہے تھے، جیسا کہ بعد کے واقعات نے ظاہر کردیا۔ انگریزوں کی حکومت بہ ہر حال ایک عارضی چیز تھی اسے کسی نہ کسی دن رخصت ہی ہونا تھا اور اسی طرح غیر مسلم اکثریت کے مقابلے میں کش مکش کر کے کسی فائدے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، چناں چہ جب ۱۹۳۵ء کا آئین نافذ ہوا تو اس وقت ان کو اپنی پچھلی غلطیوں کا دوبارہ شدید احساس پیدا ہوا اس سے یہ حقیقت نہایت عیاں شکل میں سامنے آ گئی کہ انگریز اپنا بوریا بستر لپیٹنے کی فکر میں ہے اور مسلمانوں کی قسمت اب انھیں لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہونے والی ہے جن کے خلاف وہ اب تک کش مکش کرتے رہے ہیں چناں چہ اس موقع پر خطرات کا احساس کرتے ہوئے انھوں نے ایک معمولی جھرجھری بھی لی جسے عام طور سے مسلمانوں کی نئی بے داری کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ہمارے نزدیک وہ جھرجھری محض خواب غفلت کی کروٹ تھی اور اس وقت بھی ان کا حال۔ ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا کیوں کہ اب بھی وہ اپنی اصلاح حال کی طرف متوجہ نہیں ہوئے بلکہ اس موقع پر انھوں نے بغیر نتائج پر کچھ دھیان دیے ہوئے اپنی سابقہ روش کو اور زیادہ تیز کردیا۔ ایک طرف انگریز کی زیادہ منت وسماجت کی جانے لگی جو اس وقت اپنے اقتدار کو خطرات میں گھرا ہوا دیکھ کر خود بھی مائل بہ کرم نظر آ رہا تھا اور دوسری طرف قومی کش مکش کی رفتار تیز کردی گئی جس نے بالآخر مطالبہ پاکستان کی شکل اختیار کرلی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور اس خطرناک روش کے جو خطرناک نتائج برآمد ہوئے وہ کوئی دور کی بات نہیں ہے ہمارے سامنے کے واقعات ہیں اور ہر شخص ان کے نتائج سے خود آشنا ہے اس لیے ہمیں ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

بہ ہر حال انقلاب ۱۸۵۷ء سے لے کر آخری انقلاب ۱۹۴۷ء تک کے حالات وواقعات اگر نگاہ کے سامنے رکھے جائیں تو ان سے یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ جائے گی کہ یہ طویل زمانہ مسلمانوں کی انتہائی غفلتوں اور کوتاہیوں کا زمانہ رہا ہے، اس پوری مدت میں ان کے سامنے کوئی واضح اور یقینی مقصد نہیں رہا ہے اور اگر کوئی چیز بہ طور مقصد ان کے سامنے رہی ہے تو

وہ چند نہایت حقیر قسم کے دنیاوی فائدے تھے جو بدقسمتی سے پوری طرح حاصل بھی نہیں ہوئے
بلکہ ان کے پیچھے مسلمانوں نے اپنے ہاتھ کی بھی بہت سی چیزیں کھودیں اور ان کے نتیجہ میں اپنے
لیے طرح طرح کی نئی مشکلات پیدا کرلیں جیسا کہ ظاہر ہے۔ان حالات میں یہ توقع نہیں ہوسکتی
کہ وہ اپنی غفلتوں کے نتائج بھگتے بغیر جلد اور آسانی کے ساتھ اپنے صحیح راستے کی طرف لوٹ
آسکتے ہیں بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ان کو اپنے آخری دور کی غلطیوں کا جو خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے، ان میں
ان کو اس کا ہوش بھی نہیں آسکا ہے کہ وہ کیا ہیں اور ان کی منزل مقصود کیا ہے، انتہائی بات جو وہ
سوچ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی طرح وہ اپنی زندگی دستبرد زمانہ سے بچالے جاسکیں مقصد و
نصب العین وغیرہ کا سوال تو بعد کی چیز ہے۔چناں اس وقت مسلمانوں کی عام روش یہ ہورہی ہے
کہ وہ گویا بھیڑوں کا گلہ ہے جس میں کوئی خوف ناک بھیڑیا گھس آیا ہو اور بھیڑیں اس کے ڈر
سے اِدھر ادھر جان بچاتی پھر رہی ہوں، کوئی کانگریس کی خوشامد میں لگا ہوا ہے، کوئی سوشلسٹوں
کے دامن میں پناہ ڈھونڈھ رہا ہے، کوئی کمیونسٹوں کا سہارا چاہ رہا ہے اور کچھ تو عقل وحواس کھوکر
انہی کے دامن میں سر چھپانے کی کوشش کررہے ہیں جن سے علانیہ ان کو خطرہ درپیش ہے یعنی
ہندومہا سبھا وغیرہ جیسی جماعتوں میں جو کھلم کھلا مسلمانوں کی دشمن ہیں، داخل ہورہے ہیں۔حد یہ
ہے کہ بعض نادان اپنی سب سے قیمتی متاع۔ایمان کو بھی ایک بار دوش سمجھ کر پھینکتے جارہے ہیں
گویا ان کی مصیبتوں کا اصل باعث یہی رہا ہے۔

غرض عام مسلمان اس وقت سخت انتشار وتشویش میں مبتلا ہیں، ان کا کوئی مطمح زندگی باقی ہی
نہیں رہ گیا ہے اور یہی حال ہماری بڑی بڑی انجمنوں اور اداروں کا بھی ہورہا ہے، ان کے
سامنے بھی کوئی واضح مقصد ونصب العین نہیں ہے وہ خود اسی انتشار ذہن کا شکار ہیں۔ابھی حال
میں ہماری سب سے بڑی دینی وملّی جمیعۃ کا ایک اجتماع، خاص اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے
منعقد ہوا تھا کہ الیکشن کے مسئلہ میں مسلمانوں کو کیا روش اختیار کرنے کا مشورہ دے۔لیکن وہ اس
کے سوا اور کچھ نہیں کرسکی کہ مسلمان اس وقت جس انتشار وتشتّت میں مبتلا ہیں اس کو سند جواز دے
کر ان کو اپنی اس حالت پر مطمئن کردے چناں چہ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ مسلمان فرقہ وارانہ
جماعتوں کو چھوڑ کر جس پارٹی میں چاہیں شامل ہوجائیں یہاں تک کہ وہ کمیونسٹ پارٹی میں بھی

شامل ہو سکتے ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود ہمارے رہنماؤں کے سامنے یا تو کوئی واضح اور متعین نصب العین نہیں ہے یا وہ اپنے پیروؤں سے اتنے مایوس و بددل ہیں کہ ان کے سامنے کوئی متعین راہ پیش کر کے وہ اپنی قیادت کو رسوا نہیں کرنا چاہتے۔ اور یہ بات بھی بہ ہر حال اسی حقیقت کی ترجمان ہے کہ مسلمانوں کی حیثیت اس وقت ایک بے سری فوج کی ہے جو کمان سے باہر ہو کر جو چاہے کرتی پھر رہی ہے۔ ذیل میں ہم ایک سنجیدہ اور موقر مسلم اخبار کے ایک ادارتی نوٹ کا کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں اس سے آپ کو جمعیۃ العلماء کے اس تازہ فیصلے کا پس منظر بھی معلوم ہو جائے گا اور اس سے آپ یہ بھی اندازہ کر سکیں گے کہ جو لوگ اس وقت مسلم قوم کی رہنمائی کا کام انجام دے رہے ہیں وہ خود کس طرح کے انتشار و سرگشتگی میں مبتلا ہیں۔

> ''ہندستان بھی ایک جمہوری ملک ہے، یہاں بھی مختلف جماعتیں ہیں، جو اصول، مقاصد اور طریقہ ہائے کار میں باہم اختلاف رکھتی ہیں، اس لیے جمعیۃ نے مسلمانوں کو اپنے ووٹ کے لیے اپنے آپ فیصلہ کرنے کا اختیار دے کر جمہوریت کی خدمت انجام دی ہے۔ ہاں اس نے کچھ بنیادی اصول بتا دیے ہیں اور ہر وہ جماعت جو ان اصول کی حامل ہے مسلمانوں کا ووٹ طلب کرنے کی مستحق ہے، جمعیۃ اگر ایسا نہ کرتی تو ایک طرف وہ مسلمانوں کی انفرادی آزادیِ رائے پر پابندی عائد کرتی اور دوسری طرف خود اس کی صفوں میں انتشار پیدا ہو جاتا اس لیے کہ خود جمعیۃ کے ارکان میں بعض حضرات کانگریسی ہیں، بعض سوشلسٹ پارٹی میں ہیں اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے پرجا پارٹی کی رہنمائی قبول کر لی ہے اس لیے جمعیۃ اپنے ارکان اور ہم دردوں سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ تم فلاں پارٹی کا ساتھ دو اور فلاں پارٹی کی مخالفت کرو، اس قسم کا فیصلہ غیر دانش مندانہ ہوتا اور اس کے اس رزولیوشن کے خلاف ہوتا جس میں وہ پالیمنٹری سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کر چکی ہے۔''

یہی اخبار آگے چل کر لکھتا ہے:

> ''مسلمانوں کو یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ اب روز بہ روز سیاست سے جذباتیت کا

عنصر الگ ہوتا جارہا ہے اب زمانہ ہے عقل وفہم کی روشنی میں ٹھوس فیصلوں کا ہم اوروں کی طرح انھیں سودے بازی کی تلقین نہیں کرتے۔ ہم ان سے یہ نہیں کہتے کہ آج پارٹیوں سے وعدہ لو کہ وہ تمھارے مذہبی اور تمدنی حقوق کا پاس رکھیں گی اور جو تمھیں اس پائیداری کا یقین دلا دے اس کے ساتھ بھیڑوں کے گلہ کی طرح ہولو، اس قسم کے مشورے سیاسی بصیرت کی کوتاہی کے باعث دیے جارہے ہیں مسلمانوں کو ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہنا چاہیے کیوں کہ جس تیزی سے آج وعدہ کیا جاسکتا ہے اسی تیزی سے کل انتخابات کے بعد اس وعدہ کو بھلایا بھی جاسکتا ہے ہاں کچھ جمہوری اور دستوری اصول ہوتے ہیں اور کچھ طریقے ہوتے ہیں کام کرنے کے عملی اور تجرباتی اعتبار سے جو جماعت ان اصولوں اور طریقوں کی حامل ہو ووٹ اس قومی جماعت کی امانت ہے۔"

ان سطور سے جو باتیں مترشح ہورہی ہیں ان سب پر یہاں تبصرہ کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت، البتہ زیر بحث عنوان سے متعلق حسب ذیل باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) ایک مسلمان کے لیے الیکشن میں حصہ لینا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ یہ کوئی قابلِ غور مسئلہ ہی نہیں ہے "ووٹ اس قومی جماعت کی امانت ہے جو کچھ جمہوری اور دستوری اصولوں کی حامی ہو" اس لیے اس سے قطع نظر کہ وہ اصول اسلامی نقطۂ نظر سے کیسے ہیں، اپنا ووٹ بے تکلف اس طرح کی کسی جماعت کے حوالہ کردینا چاہیے۔

(۲) مسلمانوں کے خود اپنے کچھ اصول نہیں ہیں، اس لیے انھیں بہ ہر صورت ملک کی موجودہ پارٹیوں ہی میں سے کسی پارٹی کا ساتھ دینا ہے۔

(۳) مسلمانوں کو کسی متعین راہ پر چلنے کا مشورہ دینا جمہوریت کے منافی ہے، اس لیے ان کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جس جماعت میں چاہیں داخل ہوجائیں۔ اگرچہ خود ان جماعتوں کا حال یہ ہو کہ وہ انھیں کو قبول کرسکتی ہیں جو ان کے متعین اصولوں کو صدق دل سے اپنائیں اور وہ اپنے ہر رکن کو اس کا پابند بھی دیکھنا چاہتی ہیں کہ وہ اپنی پارٹی کے سوا کسی دوسری پارٹی سے واسطہ وتعلق نہ رکھیں (گویا یہ سب جماعتیں غیر جمہوری ہیں)۔

(۴) مسلمانوں کے ضمن میں کوئی فیصلہ کرتے وقت معیار فیصلہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کہاں تک صحیح اور مسلمانوں کے لیے مفید ہوسکتا ہے بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ ارکان جماعت یا عام مسلمانوں پہ اس کا ردِّ عمل کیا ہوگا، اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ اس کی خلاف ورزی کریں گے تو کوئی فیصلہ ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ انھیں اپنی مرضی پر چلنے کا اختیار دینا چاہیے تا کہ اس جمعیۃ کا نظم منتشر نہ ہو جائے۔ خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ امت کا انتشار اور زیادہ بڑھ جائے اور خود ارکان فیصلہ کے پنڈال سے باہر آ کر ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہو جائیں جیسا کہ عملاً مختلف پارٹیوں میں شرکت کے نتیجہ میں لامحالہ ہوگا۔ کیا ان نتائج بحث کو سامنے رکھتے ہوئے بھی مسلمانوں کے انتشار و پراگندگی کے کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے! اور یہ واضح رہے کہ اوپر جس اخبار کا اقتباس نقل کیا گیا ہے وہ اپنی پختگی رائے اور اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کی ایک طویل تاریخ اور شہرت رکھتا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے اخبارات کیا گل کھلا رہے ہیں!

علاج کی دشواریاں

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہوچکی ہوگی کہ ملّی انتشار و پراگندگی یعنی کسی صحیح نصب العین کا فقدان ہونا بہت پرانا مرض ہے اور یہ خاص طور سے تقسیم کے بعد کے حالات میں پہلے سے بھی زیادہ شدت اختیار کر چکا ہے اس لیے یہ قاعدہ کی بات ہے کہ مسلمانوں کے تمام امراض میں اس مرض کا علاج سب سے زیادہ دشوار ہو، اس مرض نے ایک طرف تو اس طویل مدت میں بہت سے نئے نئے امراض پیدا کر دیے ہیں اور دوسری طرف حالات زمانہ نے جن کے پیدا ہونے میں ان کے ان امراض کا کچھ کم دخل نہیں ہے، اس مرض کو اور زیادہ بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دے دیا ہے، چناں چہ ہمارے بہت سے رہنماؤں کا تو حال یہ ہو رہا ہے کہ یہ شدت و وسعت دیکھ کر اس کے علاج ہی سے مایوس ہو چکے ہیں اور اس بنا پر انھوں نے اس کی فکر میں سر کھپانے کی بہ جائے یہ زیادہ مناسب سمجھا ہے کہ وہ اپنی راہ اسلام اور مسلمانوں سے ہٹ کر متعین

کریں اور ہو سکے تو وہ مسلمانوں کو بھی گھسیٹ کر اسی راہ پر لے آئیں تاکہ مسلمان بھی ان کی طرح اس اضطراب و پریشانی سے نجات پائیں جو کبھی کبھی اسلامی نقطۂ نظر کے تحت غور کرنے سے وہ محسوس کرتے ہیں اور پھر پوری طرح یکسو ہو کر اپنی دنیاوی ترقی کے حصول میں سرگرم ہو جائیں، ہمارے نزدیک یہ مایوسانہ نقطۂ نظر بھی غلط ہے اور اس کے تحت وہ مسلمانوں کو جس روش پر چلانا چاہتے ہیں وہ غلط ہی نہیں بل کہ ان کی دین و دنیا دونوں کی تباہی کا موجب ہے۔ اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ قبل اس کے ہم مقصد و نصب العین کے بارے میں کچھ عرض کریں اس روش اور اس کے نتائج کی کچھ تفصیل عرض کر دیں تاکہ مسلمان دھوکے میں نہ رہیں اور محض یہ سمجھ کر کسی غلط چیز کو اختیار نہ کرلیں کہ اس کے پیش کرنے والے مسلمان ہیں اور جو کچھ وہ پیش کرتے ہیں بسا اوقات اس کے ضمن میں اسلام کا بھی نام لیتے ہیں اس تفصیل سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اس خاص مرض کے علاج و دوا کے سلسلے میں رکاوٹیں کتنی شدید ہیں اور اس کے ازالہ کے لیے آپ کو کتنی ہوشیاری و بے داری اور ساتھ ہی کتنے عزم و ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

۱- زمانہ سازی

مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کا نصب العین اس وقت محض زمانہ سازی ہے یعنی وہ ہندستان کے بدلے ہوئے حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں پاتا کہ:

زمانہ با تو نسازد تو باز مانہ بسار

کے مشورے پر عمل کیا جائے، چناں چہ یہ لوگ خود بھی اس بات کے لیے کوشاں ہیں اور دوسروں کو بھی وہ اس کا درس دے رہے ہیں کہ یہاں کی اکثریت کے لیے ہماری جو باتیں بھی وجہ شکایت ہو سکتی ہیں ان کو خاموشی کے ساتھ چھوڑ دیا جائے بلکہ اتنے سے بھی کام نہ چلے تو ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی پسند کی بہت کچھ باتیں مصلحتاً یا بہ طور تقیہ کے اختیار کر لی جائیں چناں چہ آئے دن اس کے مطابق ان کے عجیب عجیب مشورے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے بعض مسلمان لیڈروں نے ہندو مسلم ازدواج تک کا مشورہ دیا ہے اور بعض علماء نے مصلحتاً مشرکانہ رسوم اور گیت وغیرہ میں شرکت کے جواز کا بھی فتویٰ صادر فرما دیا ہے۔ لیکن کیا یہ مصلحت پرستی اور زمانہ

سازی مسلمانوں کا مقصود بن سکتی ہے؟ اگر مسلمان کوئی ایسی قوم ہوتے جس کے پاس خود زندگی کا کوئی اعلیٰ سطح نظر نہ ہوتا یا اس کا پتا لگانے کا ذریعہ مفقود ہو چکا ہوتا اور اب اس کا کام صرف اتنا ہی رہ جاتا کہ وہ زندگی کسی ڈھب سے بھی ہو گزار لے جائے تو یقیناً یہ زمانہ سازی اس کے لیے جائز و مناسب ہو سکتی تھی لیکن جب ایسا نہیں ہے تو ہم اس کے سلسلے میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کرنا چاہتے کہ:

حدیثِ بے خبراں است با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

اور جو بے خبر لوگ اس قسم کے مشورے دے رہے ہیں وہ غالباً یہ جانتے نہیں ہیں کہ قرآن نے مقصد کی وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کو اس بات کی شدت کے ساتھ تاکید کی ہے کہ ان کا دھیان کبھی اپنے اصلی کام و مقصد سے ہٹنا نہیں چاہیے اور نہ اس سے سرِمو انحراف کا ان کے دل میں کوئی رجحان پیدا ہونا چاہیے۔ چناں چہ اسی بنا پر مومن کی ضروری صفات میں یہ بات داخل کی گئی ہے کہ:

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح:۲۹)

''وہ اہلِ کفر کے مقابلے میں سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔''

اور ان کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر وہ زمانہ سازی کے خاطر اپنے اصل مقصد و نصب العین سے غافل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کو اس سے بھی باک نہیں ہوگا کہ وہ ان کی بہ جائے کوئی دوسری قوم کھڑی کر دے۔ سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یوں خطاب فرمایا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ؕ۞ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ

اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ (المائدہ:۵۱-۵۳)

''اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ باہم ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان کو دوست بنائے وہ انہی میں سے ہے، بے شک اللہ ظلم کرنے والوں کو ہدایت نہیں بخشتا، تو تم دیکھو گے کہ جن کے دلوں میں کھوٹ ہے وہ ان (کفار) میں دوڑ دوڑ کر گھستے ہیں، کہتے ہیں ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر کوئی مصیبت نہ آن پڑے۔ تو امید ہے کہ اللہ فتح لائے یا اپنے پاس سے اور کوئی حکم تو جو کچھ انھوں نے اپنے دلوں میں چھپا رکھا ہے اس پر پچھتاتے پھریں۔ اور اہل ایمان کہتے ہیں کیا یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے پورا زور لگا کر اللہ کی قسمیں کھا کر کہا کہ وہ تمھارے ساتھ ہیں، ان کے اعمال ضبط ہو گئے اور یہ دیوالیہ ہو گئے۔''

اور اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ (المآئدۃ:۵۴-۵۶)

''اے ایمان والو، تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھرے) اللہ عنقریب ایسے لوگ (میدان میں) لائے گا جو اسے محبوب ہوں گے اور جو اللہ کو محبوب رکھتے ہوں گے جو مومنین کے لیے نرم اور اہل کفر کے لیے سخت ہوں گے۔ جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے ملامت کا خوف نہ کریں گے اور اللہ وسعت والا اور ہر چیز جاننے والا ہے۔ تمھارے دوست تو اللہ، اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے، زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو اس کے آگے جھکے ہوئے

ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو دوست بنائیں گے تو وہ اللہ کی پارٹی والے ہیں جو ضرور غالب ہوں گے۔"

ان آیات میں جو اصولی باتیں حزب اللہ کی علامات کے ضمن میں بتائی گئی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان سے غفلت اختیار کرنے پر جو دھمکی دی گئی ہے کیا ان کے بعد بھی ہمارے لیے اس طرح کی زمانہ سازی کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے جس کا آج ہمیں علانیہ مشورہ دیا جارہا ہے۔ یہ معاملہ تو اتنا سخت ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں خطاب فرمایا ہے:

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ (القلم:۸،۹)

"جھٹلانے والوں کا کہنا مانیے، یہ چاہتے ہیں کہ اگر آپ کچھ نرمی برتیں تو وہ بھی نرمی برتنے لگیں۔"

ایک دوسرے موقع پر ہے:

وَ لَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل:۷۴،۷۵)

"اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو یقیناً آپ ان (مخالفین) کی طرف کچھ نہ کچھ جھک سے جاتے، تب ہم آپ کو دنیا وآخرت کا دگنا عذاب چکھاتے پھر آپ ہمارے خلاف اپنا کوئی مددگار نہیں پاتے۔"

بہ ہر حال یہ زمانہ سازی دین کے قطعی منافی چیز ہے جس کو اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے دین سے اپنا حقیقی تعلق منقطع کرلیا۔ ہاں ہمارے نزدیک بھی یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے اور نہ اس میں شرعاً کوئی قباحت ہے کہ کسی مقصد تک پہنچنے کے لیے اس کے مناسب اسباب و وسائل اختیار کیے جائیں اور اس میں حالات وظروف کی زیادہ سے زیادہ رعایت کی جائے لیکن یہ طریق کار اس طریق کار سے بالکل مختلف چیز ہے جس میں اپنے اصل مقصود کو یا تو بالکلیہ نظر انداز کردیا گیا ہو اور اس کی جگہ محض دنیاوی مفاد نے لے لی ہو یا وہ دوسرے ضمنی مقاصد سے بالکل

مغلوب ہو۔کر رہ گیا ہو یہ دوسری چیز بعینہٖ وہی ہے جس کی مذمت اوپر کی آیتوں میں کی گئی ہے اور جس کی مذمت سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے۔

ہمارے لیے اس وقت اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمان نامی قوم یا اس کے افراد ہندستان میں زندہ کس طرح رہ سکتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ مسلمان رہتے ہوئے زندہ رہنے کی کیا تدبیر ہوسکتی ہے۔ جو لوگ اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں ان کو حق حاصل ہے کہ وہ مصلحت کے لیے اپنا نام اور کام سب کچھ بدل ڈالیں لیکن جو لوگ مسلمانوں کی زندگی کے ساتھ اسلام کی زندگی بھی چاہتے ہیں یا زیادہ صحیح لفظوں میں جو لوگ اسلام کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں جس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی کوئی زندگی ہی نہیں ہوتی، انھیں اچھی طرح غور کر لینا چاہیے کہ آج انھیں جس ترک و اختیار کا مشورہ دیا جا رہا ہے وہ ان کے اس مقصد سے کہاں تک مطابقت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں ذیل کی باتیں خاص طور سے پیش نظر رکھیں۔

(۱) دین نے مصالح کی رعایت کی جو حد مقرر کی ہے اس سے آگے قدم بڑھانے کا حق اس شخص کو حاصل نہیں ہے جو اسلام کا نام لیتا ہو۔ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کی پابندی کی جائے۔ ہاں اس کو ترک کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے سب کچھ جائز ہوسکتا ہے۔

(۲) اسلام اور مسلمان ہر صورت میں ایک نہیں ہیں ورنہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ جو کچھ مسلمان کرتے ہیں وہی اسلام ہے، حالاں کہ یہ بداہۃً غلط ہے۔ اور نہ ان دونوں کے مفاد ہر صورت میں ایک ہیں، کتنی ایسی چیزیں ہیں، جن کو قومی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے حالاں کہ وہ اسلام کے بالکل منافی ہیں۔ پس اس اعتماد پر کہ ہر وہ چیز جو مسلمانوں کی دنیاوی زندگی کے لیے مفید ہوسکتی ہے اس کی بہ ہر حال مذہباً اجازت ہوگی، کوئی قدم اٹھانا اصولاً غلط ہے۔ یہ غلط روی مسلمانوں میں پہلے سے موجود رہی ہے لیکن اب اس کی جو صورت ہوتی جا رہی ہے اس کے پیش نظر یہ اندیشہ قوی ہو گیا ہے کہ اگر یہی روش برقرار رہی تو آئندہ تھوڑے ہی دنوں میں مفاد اسلام کے تحفظ کی فکر، دنیاوی مفاد کے آگے بالکل ختم ہو کر رہے گی اور یہ ملی حیثیت

سے ایک نہایت زبردست سانحہ ہوگا۔

(۳) یہ روش ان کے لیے دنیاوی حیثیت سے بھی کسی خیر کی موجب نہیں ہوسکتی۔ خدا کو راضی رکھنے کے ساتھ غیر خدا کو خوش رکھنے کی تمنا زندگی کا ایک کھلا ہوا تضاد ہے جو اول تو نباہا نہیں جاسکتا کیونکہ

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ (الاحزاب:۴)

''خدا نے کسی انسان کے اندر دو دل نہیں رکھے۔''

اور دوسرے اس تضاد کو کوئی شخص کسی حال میں چھپا نہیں سکتا، خدا سے اس لیے نہیں کہ وہ علیمٌ بذات الصّدور ہے اور خلق سے اس لیے نہیں کہ متضاد خواہشات کہیں نہ کہیں ضرور ٹکراتی ہیں اور اس وقت اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

و مهما تكن عند امرء من خليفةٍ
و ان خالها تخفى على الناس تعلم

اور اس وقت تو اس کا چھپانا اور دشوار ہوجاتا ہے جب اس تضاد کو پالینے کے لیے بے شمار بدگمان پرشوق نگاہیں کرید میں لگی ہوئی ہوں۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس وقت ہر طرح کے اظہار وفاداری کے باوجود ہر مسلمان حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو اس وقت حکومت کے ذمہ دارانہ عہدوں پر ہیں شک کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور بسا اوقات ان پر علانیہ فقرے کسے جاتے ہیں۔؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پس یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ محض کچھ چیزوں کو ترک کر کے یا کچھ چیزوں کو اختیار کر کے ان کو مطمئن کرسکیں دراں حالیکہ آپ اسلام اور مسلمانوں سے اپنا تعلق کلیۃً ختم کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ اور یہاں یہ بات بھی پیش نظر ہونا چاہیے کہ مسلمانوں سے غیر مسلموں کی نفرت و مخالفت کچھ مذہبی عقائد و اعمال کی بنا پر نہیں ہے، غیر مسلم عمومی طور سے مذہب کے اثرات سے کورے ہیں اور مغربی تعلیم نے اس کے رہے سہے اثرات کو بھی دھو دیا ہے اور یہی حال عام طور

سے مسلم عوام الناس کا رہا ہے اس لیے مذہبی حیثیت سے دونوں میں تفاوت بہت تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ رہیں وہ ظاہری علامات جو مسلمانوں کو غیر مسلموں سے ممتاز کرتی ہیں تو ان میں بہت کم ایسی ہیں جن پر ان کو مذہباً اعتراض ہوتا ہو اور جن پر اعتراض ہوتا بھی ہے وہ کچھ اس لیے نہیں ہوتا کہ فی الواقع ان باتوں پر اعتراض کرنا مقصود ہوتا ہے بلکہ اعتراض کی وجہ کچھ اور ہوتی ہے اور وہ چیزیں محض بہانہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں اسی لیے وہی چیزیں وہ دوسروں کے ضمن میں آسانی سے برداشت کر لیتے ہیں اور مسلمانوں کو وہ ان کو چھوڑ دینے پر بھی نہیں بخشتے۔ درحقیقت ان کی نفرت ومخالفت کی اصل بنیاد قوم پرستی کا جذبہ ہے جس نے ایک قومی مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پس جب حالت یہ ہے تو مصلحت پرستی کی روش اختیار کرتے وقت یہ بہ ہر حال سوچنے کی ضرورت ہے کہ اپنی ضروری ضروری چیزوں کو چھوڑ کر اور ہندو مذہب وتہذیب کی بہت سی چیزیں اختیار کر کے بھی ہم کس طرح ان کو خوش کر سکتے ہیں، اس کی بس ایک ہی صورت ممکن ہے کہ آپ اپنا سب کچھ چھوڑ کر ان کے اس نئے قومی دین یعنی ہندو قومیت کا جز بن جائیں۔ اس کے بغیر آپ کی یہ روش آپ کو ان کی نگاہوں میں ذلیل وخوار تو کر سکتی ہے لیکن عزیز ومقبول نہیں بنا سکتی اور یہی انجام ہمیشہ سے ان لوگوں کا ہوتا رہا ہے جن کی نگاہ میں اپنی کوئی عزت نہ ہو، اور عزت بہ ہر حال اپنے اصولوں پر مضبوطی کے ساتھ جمنے ہی میں ہے۔

(۴) اور آخری بات اس سلسلے کی یہ ہے کہ اسلام محض روزے نماز کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک باقاعدہ نظام زندگی ہے جس کو نہ صرف ماننا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے بلکہ اس کا پیغام دوسروں تک پہنچانا بھی ضروری ہے۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ اس کی اس حیثیت سے زمانہ سازی کا کوئی ربط جوڑا نہیں جا سکتا۔

ان وجوہ سے ہمارا خیال ہے کہ زمانہ سازی مسلمانوں کا مقصد زندگی نہیں بن سکتی اور نہ اس سے ان کو دینی یا دنیاوی حیثیت سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ ہاں اگر وہ زمانہ سازی میں اتنے آگے بڑھنے کے لیے تیار ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں سے اپنا رشتہ کلیۃً منقطع کر لیں تو یقیناً بہت سے فوائد سے متمتع ہو سکتے ہیں لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی مسلمان جس کو اسلام کی ہوا بھی لگی ہو وہ اس کا تصور کس طرح کر سکتا ہے۔ اسلام جہاں اور سب کچھ ہے وہاں وہ دل کا سکون وقرار بھی ہے

اور خاص اس پہلو سے بھی وہ دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے، اس لیے ایک شخص جو معمولی درجے میں بھی اس کی سمجھ بوجھ رکھتا ہے، وہ اسے تو برضا و رغبت قبول کرسکتا ہے کہ وہ آگ میں جھونک دیا جائے، آروں سے اس کا جسم چیر ڈالا جائے، اسے دار پر چڑھا دیا جائے لیکن وہ یہ ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کرسکتا کہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے فائدہ کے لیے وہ اس دولت بے بہا سے اپنے کو محروم کرلے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ ایمان کی حلاوت سے جو دل آشنا ہوگیا ہے اس کے لیے ایمان چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کرنا ایسا ہی ہے جیسے آگ میں ڈالا جانا۔

لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ یہ کیفیت محض اسلام کا نام لینے سے پیدا نہیں ہوسکتی اس کے لیے قلب کے مشورہ و احساس کی ضرورت ہے اور بدقسمتی سے مسلمانوں میں اسی چیز کی بڑی کمی ہے۔ اسی لیے ہمارے ناصحین بھی ہمیں ایسے مشورے دے رہے ہیں جو اختیار کفر کے مشورے کے ہم معنی ہیں اور اسی لیے بہت سے لوگ ان مشوروں کو کھلے دل کے ساتھ قبول بھی کرتے جارہے ہیں۔

پرفریب زمانہ سازی

جیسا کہ معلوم ہے زمانہ سازی کی کوئی متعین راہ نہیں ہے بلکہ زمانہ سازی نام ہی ہے اس بات کا کہ آدمی کسی ایک راہ کا متبع نہ ہو بلکہ ہر اس راستے پر چل پڑے جس پر چلنے سے اس کو کوئی چھوٹا بڑا فائدہ پہنچ سکے، اسی لیے آپ دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے اپنا شیوہ زمانہ سازی قرار دیا ہے وہ صبح و شام بدلتے رہتے ہیں۔ آج وہ ایک پارٹی میں شریک ہیں کل کسی دوسری پارٹی میں، آج ان کے عقائد کچھ ہیں اور کل کچھ اور، اور یہ تبدیلیاں اتنی تیز اور ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوتی ہیں کہ بسا اوقات ایک شخص ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ انسان اپنے مفاد کے لیے کیا کچھ نہیں کرسکتا، وہ اس کے پیچھے اپنی عزت و وقار کا بھی کچھ پاس و لحاظ نہیں کرتا۔

لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ تمام زمانہ ساز ایسے نہیں ہوتے یہ صرف ان زمانہ سازوں کا خاصہ ہے جو حرص و طمع تو زیادہ رکھتے ہیں لیکن سمجھ بوجھ ان کی تھوڑی ہے، ورنہ ان میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جن کی زمانہ سازی کبھی عقل سے بیگانہ نہیں ہوتی، وہ خوب سوچ سمجھ کر قدم

اٹھاتے ہیں اور بڑی مشکل سے پہچانے جاسکتے ہیں۔یعنی وہ چلتے تو زمانہ کے رُخ ہی پر ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس پر وہ استدلال ومنطق کا اتنا گہرا پردہ ڈال لیتے ہیں کہ ہر شخص آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ ان کے ذہن میں زمانہ سازی کا کوئی شائبہ بھی پایا جاتا ہے۔ایسے لوگ مسلمانوں کے لیے پہلی قسم کے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ خطرناک ہیں کیوں کہ ان کی زمانہ سازی کھلی ہوئی ہوتی ہے اس لیے وہ جس حد تک اسلام کے خلاف ہوتی ہے، آسانی سے معلوم ہوسکتی ہے لیکن یہ لوگ استدلال ومنطق کے پردے میں زمانہ سازی کرتے ہیں اور استدلال ومنطق بھی ایسی کہ اکثر اس کا رشتہ اسلام سے جڑا ہوا ہوتا ہے اس لیے اس کو پہچاننے کے لیے بڑی دیدہ وری کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے اس قسم کی پرفریب کارسازیوں سے بہت ہشیار رہنے کی ضرورت ہے۔اس غرض کے تحت ذیل میں اس کی دوایک نمایاں مثالیں پیش کرتے ہیں جو ہماری نگاہ میں اتنی خطرناک ہیں کہ اگر خدانخواستہ ان کو مسلمانوں میں جڑ پکڑنے کا موقع مل گیا تو ہندستان میں مسلمانوں کا وجودِ معنوی ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا۔

وحدتِ ادیان

ہندستان میں وحدت ادیان یعنی ''سب مذاہب برحق ہیں'' کا چرچا ایک عرصہ سے سننے میں آرہا تھا لیکن تقسیم سے کچھ زمانہ پہلے تک اس کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں تھی، اس قسم کی باتیں سن کر سننے والے عام طور سے یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ کچھ مذہبی قسم کے لوگوں نے اپنے غلط تصورات مذہب کے تحت ایک غلط بات کہنی شروع کردی ہے، اس وقت کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ اس بات کی تہ میں کوئی بڑا مقصد چھپا ہوا ہے، زیادہ سے زیادہ اس کو جو سیاسی معنی پہنائے جاسکتے تھے وہ صرف یہ تھے کہ اس قول کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی وہ باہمی نفرت و کش مکش دور کرنا مقصود ہے جو آزادی کی راہ میں اس وقت ایک زبردست روڑا بنی ہوئی تھی اور یہ کوئی برا مقصد نہیں تھا چناں چہ اہل سیاست میں سے بعض لوگ اگر کبھی اس قول کو دہراتے تھے تو وہ اس کے ساتھ ہی اپنی تان رواداری ومصالحت کی تلقین پرآ کر توڑتے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا مقصود اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

لیکن اب اس چرچے نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے اور ہمیں یہ اندیشہ ہو رہا ہے کہ اب اس تلقین کا مقصد رواداری و مساحمت ہی پیدا کرنا نہیں رہا ہے بلکہ اس سے بھی آگے مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ پہلے مسلمانوں کا رشتہ ان کے مذہب سے ڈھیلا کیا جائے اور پھر رفتہ رفتہ ان کو اس سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے جو ذہن میں پہلے سے تیار کرلیا گیا ہے اور جس میں ان کا مذہب بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

تقسیم سے پہلے یہاں مسلمان کسی حیثیت سے اپنے کو کم زور محسوس نہیں کرتے تھے اور جہاں تک مذہب کا معاملہ ہے اس بارے میں تو خاص طور سے ان کا تصور بہت اونچا تھا۔ یعنی وہ اس قسم کی کسی تلقین پر کان بھی نہیں دھر سکتے تھے جس سے ان کے مذہبی احساس برتری میں کوئی فرق آ سکتا ہو، اس لیے اس وقت اولاً تو ان سے اس قسم کی باتیں کہی بہت کم جاتی تھیں اور کہی بھی جاتی تھیں تو اس میں ان کے جذبات کی انتہائی رعایت ملحوظ رکھی جاتی تھی چناں چہ اس بات کو مبہم اور غیر واضح شکل میں بیان کر کے جھٹ رواداری و اتحاد کا وعظ شروع کر دیا جاتا تھا اور بس اسی پر بات ختم کر دی جاتی تھی۔ یہ اس وقت مسلمانوں کے مخصوص حالات و جذبات کی رعایت کی بنا پر کیا جاتا تھا لیکن اسی کے ساتھ ایک اور بات بھی قابل لحاظ تھی اور اس کا بھی تقاضا یہی تھا کہ اس وقت یہ باتیں اسی انداز میں کہی جائیں اور وہ خود ہندوؤں کی اس وقت کی مخصوص حالت تھی، اس وقت اگر اس تحریک پر زور دیا جاتا اور اس کے وہ معنی یا تقاضے بیان کیے جاتے جو اس وقت بیان کیے جاتے ہیں تو اس سے اس بات کا بھی اندیشہ ہو سکتا تھا کہ نفرت و تعصب کی وہ دیوار منہدم ہو جائے جو ہندوؤں کو مسلمانوں کے طویل دور حکومت میں ضم ہونے سے انھیں بچائے ہوئے تھی اور اس وقت کے حالات کے لحاظ سے اس کا فائدہ ان سے زیادہ مسلمانوں کو پہنچ سکتا تھا چناں چہ اس وجہ سے بھی اس وقت اہل ملک اور بالخصوص اہل سیاست کی طرف سے کوئی خاص ہمت افزائی نہیں ہوئی۔ لیکن آزادی کے بعد جہاں اور بہت سے انقلابات آئے ہیں وہاں ایک انقلاب یہ بھی ہے کہ یہاں کا مسلمان انتہائی احساس کہتری میں مبتلا ہو گیا ہے اس لیے اس قسم کی باتیں سن لینا اس کو نہ صرف گوارا ہے بلکہ ان کو وہ خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہے، وہ اپنی جان بچانے کے لیے مذہب کا قلادہ بھی اتار پھینکنے پر آمادہ ہے اس لیے اس کے لیے یہ تو بہ ہر حال

مقابلۃً ہلکی بات ہے کہ وہ دوسرے ''مذاہب حقہ'' کی صف میں اپنے مذہب کو بھی رکھ سکے۔ اس سے کچھ تو اس کے مذہبی حس کو تسکین حاصل ہوسکتی ہے۔ ایک طرف یہ انقلاب حال ہوا ہے اور دوسری طرف دوسرا انقلاب یہ ہوا ہے کہ آزادی کے بعد ہندوؤں کے حوصلے غیر معمولی طور سے بڑھ گئے ہیں اس لیے اس وقت اس تحریک کے فروغ سے جو اندیشہ ہوسکتا تھا وہ بالکل ختم ہوگیا ہے اور اب اس سے ان کو صرف فائدہ ہی فائدہ پہنچنے کی توقع ہے کیوں کہ ہندوؤں پر اول تو اس تحریک کا مذہبی حیثیت سے کوئی اثر نہیں پڑسکتا، احساس برتری اس کے لیے زبردست مانع ہے بالخصوص جب کہ ان میں سے ہر شخص یہ بھی سمجھ رہا ہو کہ سیاسی حیثیت سے اس کے کیا فوائد مطلوب ہیں یا ہوسکتے ہیں اور دوسرے اگر اس کا کوئی اثر ان پر مرتب بھی ہو سکے تو وہ چنداں لائق اعتناء نہیں ہے، کیوں کہ ہندوؤں کو اپنے مذہب سے زیادہ دل چسپی اب اپنے جدید مذہب قوم پرستی سے ہے اور اس کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ فائدہ ہی کی شکلیں پیدا ہورہی ہیں، اس کا اثر جو کچھ ہوگا وہ مسلمانوں پہ ہوگا اور وہ بہ ہر حال ان کے لیے مفید ہے۔ ان وجوہ سے دیکھا جارہا ہے کہ آزادی کے بعد وحدت ادیان کا پرچار بڑی شدت کے ساتھ شروع ہوگیا ہے اور اب اس کا دائرہ رواداری و مسامحت کی تلقین ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اب کھل کر اس کے وہ معنی بتائے جارہے ہیں جن سے مسلمانوں کی مذہبی حیثیت کو سخت خطرہ پیش آسکتا ہے اور پہلے تو اس میں زیادہ تر مذہبی قسم کے لوگ حصہ لیا کرتے تھے لیکن اب اہل سیاست کی ہم دردیاں اور کھلی ہوئی حمایت بھی اس کو حاصل ہوگئی ہے۔ ابھی حال میں سیکولر اسٹیٹ کے وزیر داخلہ شری راج گوپال اچاریہ جی کشمیر تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے سیکولر اسٹیٹ کے وزیر اعظم کی موجودگی میں کشمیر یونی ورسٹی کے طلبہ کو جن کی اکثریت یقیناً مسلمانوں کی رہی ہوگی خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ:

> ایک دوسری بات یہ کہ کشمیر یونیورسٹی کی یہ قابل فخر خصوصیت ہونی چاہیے کہ یہاں نوجوان کسی اور مقام کے مقابلے میں اس حقیقت کو زیادہ سے زیادہ اپنے اندر جذب کریں کہ خدا کی نظر میں تمام انسان یکساں طور سے اس کے محبوب ہیں۔ یہ سمجھنا نِرا حماقت ہے کہ خدا کسی انسان کو جو کوئی خاص عقیدہ رکھتا ہو خصوصیت سے محبوب رکھتا

ہے۔آپ چاہے عیسائی ہوں، یہودی ہوں، ہندو ہوں، مسلمان ہوں، سکھ ہوں یا پارسی ہوں اگر آپ نے یہ خیال کیا کہ خدا کسی مخصوص عقیدہ یا مخصوص طریقۂ عبادت ہی کے ساتھ محبت رکھتا ہے تو سمجھ لیجیے آپ قطعاً غلطی کا شکار ہیں۔خدا کے ساتھ ایسی جانب داری کو منسوب کرنے سے زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ آپ خدا کو سرے سے مانیں ہی نہیں، میں یہ بات اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ہمارا قومی مفاد اور ہماری سیاست اس رویہ کے متقاضی ہیں بلکہ میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہی حقیقت ہے اور اس کے خلاف کچھ ماننا صرف حماقت ہے۔آپ کی یونی ورسٹی کی تاریخ کو یہ خدمت انجام دینی چاہیے کہ وہ اسی طرز فکر اور عقیدہ کو اپنے فارغ التحصیل طلبہ کے تمدن کا مضبوط سنگ بنیاد بنائے۔ (ہندستان ٹائمنر ۲رستمبر ۱۹۲۵)

اور اسی طرح کی باتیں، ہمارے بہت سے ممتاز مسلم زعماء وعلماء بھی محض اپنی مرعوبیت کی بنا پر یا دوسروں کو خوش کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً ارشاد فرماتے رہتے ہیں۔

اس وقت موقع نہیں ہے کہ ہم اس تحریک کی علمی غلطیوں اور اس کے خطرناک علمی نتائج پر کوئی تفصیلی بحث کریں لیکن ہم مسلمانوں کو متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ میٹھا گھونٹ جو اکثر خود ان کے ہی ہاتھوں سے ان کو پلایا جا رہا ہے یہ ان کے حق میں زہر سے کم نہیں ہے۔اس کے تسلیم کر لینے کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ مسلمان مسلمان باقی نہ رہیں۔

ایک مسلمان کا بنیادی عقیدہ جس کے بغیر وہ مسلمان نہیں ہو سکتا یہ ہے کہ خدا کی ذات و صفات کا مجمل علم تو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہوا ہے لیکن اس کے بارے میں تفصیلی معلومات وہ محض اپنی عقل سے معلوم نہیں کر سکتا اور نہ اس کی صحیح تعبیر کر سکتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ہر زمانہ میں انبیاء و رسل بھیجے ہیں جن کو بہ راہ راست ان چیزوں کا علم دیا گیا اور انھوں نے خلق کو ان سے آگاہ فرمایا:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (الشوریٰ:۵۱)

"کسی انسان کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے بہ راہ راست کلام کرے بہ جز وحی کے یا

حجاب کے پیچھے سے یا رسول بھیجے تو اپنے اذن سے جو چاہے وحی بھیجے۔"

اور جہاں تک اس کی مرضی معلوم کرنے کا سوال ہے اس کا تو اس کے سوا کوئی ذریعہ ہی نہیں ہے کہ اس کے بارے میں ہم ان لوگوں کی اتباع کریں جو اس کی طرف سے خاص اسی کام کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (آل عمران:۳۱)

"کہہ دیجیے، اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔"

اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ خدا کا قرب حاصل کرنے کا کوئی متعین ذریعہ نہیں ہے اور اس سے اس کی مراد یہ ہو کہ ہم اپنی عقل سے بھی اس کا راستہ متعین کر سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ رسالت و نبوت کا عقیدہ جو ایمان کا ضروری جز ہے اس کے نزدیک غیر ضروری ہے اور یہ اسلام کی اصطلاح میں خالص کفر ہے۔

اور اگر اس کی مراد یہ ہے کہ عقل تو اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے البتہ مختلف زمانوں میں جو مذاہب آتے رہے ہیں اور انھوں نے خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے عبادت وغیرہ کے جو طریقے بتائے ہیں وہ سب اپنی جگہ صحیح ہیں اور ان میں سے جس کسی کو اختیار کر لیا جائے وہ انسان کی نجات کے لیے کافی ہے جیسا کہ بہ ظاہر راجہ جی کا منشاء معلوم ہوتا ہے، تو ہم اس کے بارے میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اگر یہ بات اسلام اور مذاہب کی موجودہ حیثیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے کہی جا رہی ہے تو یہ مذہباً وعقلاً دونوں لحاظ سے غلط ہے۔ قرآن جو ہمارے عقیدہ کے مطابق خدا کا آخری کلام ہے اس میں نہایت صراحت کے ساتھ اعلان کر دیا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:۱۹)

"یقیناً اللہ کے نزدیک صحیح دین اسلام ہی ہے۔"

اور یہی اس کا آخری مکمل دین ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المآئدہ:۳)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے پسند کرلیا۔''

اور اسی کے ساتھ اس بات کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ اسلام کے سوا اسے کوئی دین پسند نہیں ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ (آلِ عمران:۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے سوا اور کوئی دین چاہے گا تو وہ قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگا۔''

کیا اِس صراحت کے بعد بھی کوئی مسلمان جو قرآن کو خدا کا کلام سمجھتا ہو یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ مذاہب اور ان کے ماننے والے خدا کے نزدیک یکساں درجہ رکھتے ہیں؟

اور عقلی حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو یہ بات انتہائی مہمل نظر آئے گی۔ جن لوگوں کو موجودہ مذاہب کی تعلیمات کا تفصیلی علم ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں بہت سے ایسے بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں،... کہ وہ ایک دوسرے کے بالکل ضد معلوم ہوتے ہیں[(۱)]۔ تو ایسی صورت میں کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ سب مذاہب اپنی موجودہ شکل میں خدا کے بھیجے ہوئے ہیں اور خدا نعوذ باللہ اتنا جاہل یا ظالم ہے کہ وہ ان متضاد و متخالف عقائد و اعمال اختیار کرنے والوں کو یکساں سلوک کا مستحق قرار دے گا؟

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ

---

(۱) قرآن کی سب سے مختصر سورہ سورۂ اخلاص ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''کہہ وہ اللہ بے ہمہ (سب سے نرالا اکیلا) ہے اللہ با ہمہ (سب کا مقصود سب کا ملجا) ہے نہ وہ باپ ہے نہ وہ بیٹا ہے نہ کوئی اس کی برابری کا ہے۔''

ان مختصر فقروں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں جن باتوں کی تلقین کی گئی ہے ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی مذہب کے بنیادی عقیدۂ باطل کی تردید ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پورا قرآن اس پہلو سے کیا حیثیت رکھتا ہے۔

دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ۚ۬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾ (الرعد:۱۶)

''پوچھو، کون ہے آسمان اور زمین کا رب؟ کہہ دو اللہ! تو کیا تم نے اس کے سوا ایسے کارساز بنا رکھے ہیں جو خود اپنے لیے بھی نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے، کہو، کیا نابینا اور دیکھنے والا برابر ہوسکتا ہے یا کیا تاریکیاں اور روشنی برابر ہوسکتی ہے یا کیا انھوں نے اللہ کے ایسے شریک بنائے ہیں جنھوں نے اللہ کے پیدا کرنے کی طرح پیدا کیا ہو تو پیدائش انھیں مشابہ معلوم ہو رہی ہو، کہہ دو (نہیں بلکہ) اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، وہی اکیلا (معبود و فرماں روا) ہے اور وہی (سب پر) پورا غلبہ رکھتا ہے۔''

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ؕ مَا لَكُمْ ٚ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ۚ

(القلم:۳۵،۳۶)

''کیا ہم مسلمین کو مجرمین کے برابر کر دیں گے؟ یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔''

پھر اس قول کی غلطی نفس اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ اسلام کا جب ظہور ہوا ہے تو اس وقت دنیا کے تمام قابل ذکر ادیان موجود تھے لیکن ان کی موجودگی کو خدا نے کافی خیال نہیں کیا بلکہ اس نے ایک نئی کتاب اور نئی شریعت بھیجی اور سب کو مع اہل کتاب صرف اس کی اتباع کی دعوت دی۔ اور اس کو ان کی نجات کے لیے ضروری ٹھہرایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ࣙالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ (الاعراف:۱۵۸)

''اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں جس کے لیے آسمان اور

زمین کی بادشاہی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں، وہی زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔
پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول اُمّی پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور اس کے کلمات پر اور اس کی اتباع کرو اور اس طرح امید ہے تم ہدایت پاؤ گے۔‘‘

اگر یہ سب مذاہب بعد کے زمانوں میں بھی نجات کے لیے کافی ہوتے تو ایک نیا دین بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی، صرف ان کی اتباع کی تلقین و تاکید کافی ہوتی! اور اگر فی الواقع یہ سب ادیان اپنی موجودہ حیثیتوں اور شکلوں میں بھی ایک ہوتے تو وہ ذہنی و فکری کش مکش کیوں پیدا ہوتی جو ان مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان ظہور اسلام کے وقت پیدا ہوئی اور جس نے بعد کو اکثر مقابلہ و مقاتلہ کی بھی صورتیں اختیار کر لیں جن کے ذکر سے تاریخ کے صفحات بھرے ہوئے ہیں اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ سب واقعات محض بے جا جوش و خروش یا غلط مذہبیت کا نتیجہ رہی ہے۔ بے شک مذہب اسلام اور دیگر مذاہب میں بہت سی باتیں مشترک بھی ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ فروعی مسائل میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کو بہ ذاتِ خود کوئی بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے، زمان و مکان کے اختلاف کے ساتھ یہ اختلافات ناگزیر ہیں لیکن کچھ باتوں میں اشتراک اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ حقیقتاً ایک ہی ہیں۔ دو خالص ضدوں میں بھی بہت سی باتیں مشترک ہوتی ہیں پھر بھی وہ ایک دوسرے کی ضد ہی رہتے ہیں۔ یہی بات ان مذاہب کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ البتہ یہ بات کہی جا سکتی ہے اور قرآن نے بھی یہی بات کہی ہے کہ سارے آسمانی مذاہب بنیادی طور سے اصلاً ایک ہی تھے اس لیے ان میں اصل کے اعتبار سے بنیادی طور سے کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا، اختلاف جو کچھ ہے وہ ان کی موجودہ حیثیتوں میں ہے جن میں اصل کے ساتھ بہت سی غیر اصلی باتوں کی آمیزش ہو گئی ہے اور وہی عملاً اصل دین بن گئی ہیں۔

وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ (یونس:۱۹)

’’تمام لوگ ایک ہی امت تھے پس ان میں اختلاف واقع ہو گیا۔‘‘

اور اسی بنا پر قرآن مجید کے نزدیک خود ان مذاہب کی صحیح پیروی بھی قرآن ہی کے اتباع پر موقوف ہے۔ چناں چہ اسی بنا پر قرآن کی ایک صفت مہیمن قرار دی گئی ہے:

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (المآئدہ:۴۸)

''اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری حق کے ساتھ جو عین مطابق ہے ان کتابوں (کی پیشین گوئیوں) کے جو ان سے پہلے سے موجود ہیں اور یہ کتاب ان سب کی محافظ ہے۔''

باقی رہی یہ بات کہ ہر مذہب کے لوگ اگر اس قسم کا عقیدہ رکھیں تو اس سے مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے یا یہ عقیدہ اس رواداری کے خلاف ہے جس کو اس زمانہ میں شرافت یا عقلی بلوغ کا معیار سمجھا جاتا ہے تو اس کے سلسلے میں ہم اتنا ہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ نہایت بے عقلی کی بات ہے کہ کسی بہتر سے بہتر مقصد کے لیے بھی حقیقتوں کا انکار کیا جائے اور مصنوعی توجیہات سے خواہشات کو حقیقت کا جامہ پہنایا جائے، ان مذاہب کی موجودہ حیثیتوں میں جب بنیادی اختلافات موجود ہیں تو ان کو ماننا ہی پڑے گا اور چاہے ہم مانیں یا نہ مانیں ان کے اثرات عملی زندگی میں نمایاں ہو کر رہیں گے۔ پھر اس ضمن میں یہ مسئلے بھی حل طلب ہیں کہ کیا مذہب کوئی گھر کی چیز ہے کہ ہم اپنی یا زمانہ کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر آئے دن اس میں تبدیلیاں کرتے ہیں یا اس کے لیے اللہ کی سند کی بھی ضرورت ہے؟ تو کیا ان متضاد باتوں کو جمع کرنے کے لیے کوئی خدائی سند پیش کی جا سکتی ہے اور خود خدا کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جا سکتا ہے کہ وہ متضاد باتوں کو جمع کرنے کا حکم دے سکتا ہے اور اس کو پسند کرتا ہے اور یہ کہ ان متضاد باتوں کو جمع کرنے کی عملی شکل کیا ہوگی۔ کیا کوئی سمجھ دار انسان اس کا ارادہ بھی کر سکتا ہے کہ مثلاً وہ توحید و شرک دونوں کو اکٹھا کر لے اور کیا اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ جو لوگ تضاد کو تضاد محسوس کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں وہ سب نفس مذہب سے ہی بیزار ہو جائیں اور مذہب صرف نافہموں کے لیے خاص ہو کر رہ جائے۔ اس صورت میں دنیا کا کیا حشر ہوگا کیا اخلاق و معاشرت کی کوئی معمولی بنیاد بھی باقی رہ جائے گی؟ کیا انسانیت و شرافت کا صرف نام ہی نام نہیں رہ جائے گا اور اس کی حقیقت بالکل مٹ نہیں جائے گی۔ رہا رواداری کا سوال تو رواداری یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی عقل و ضمیر کو کسی مصلحت پر قربان کر دے یہ یا تو حماقت ہے یا انتہائی نکماپن۔ اگر رواداری کے یہی معنی ہوں تو دنیا سے حق و باطل کا امتیاز ہی اٹھ جائے۔ رواداری یہ ہے کہ اختلافات کو حدود کا

پابند بنایا جائے اور زبردستی کسی سے اپنی بات منوانے کی کوشش نہ کی جائے اور یہ بات مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اپنے مذاہب کو مانتے ہوئے بھی ممکن ہے اور ہم اسلام کے بارے میں تو دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے خود

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۗ (البقرہ:۲۵۶)

''دین میں کوئی زبردستی نہیں''

اور

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ

(الانعام:۱۰۸)

''اللہ کے سوا جن کو یہ پوجتے ہیں انھیں برا نہ کہو۔ یہ دشمنی میں بے جانے اللہ کو برا کہیں گے۔''

وغیرہ احکام کے ذریعہ اس رواداری کا مسلمانوں کو پابند بنا دیا ہے اور یوں بھی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ واقعی مذہب غیر رواداری یا فرقہ وارانہ اختلاف وغیرہ پیدا کرنے کا موجب ہے۔ یہ چیزیں مذہب کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ لا مذہبیت یا غلط مذاہب کا نتیجہ ہیں۔ انسان اگر مذہب کی بنیادی باتوں کا پابند ہو جائے تو ہر مذہب میں خدا و خلق، نیکی و تقویٰ اور جزا و سزا کے بارے میں ایسی ہدایات موجود ہیں جو اس کو فرقہ پرستی وغیرہ سے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ پس اگر ان سے بچنا ہی مقصد ہے تو اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ مذہب کو مٹا کر خود کوئی خود ساختہ مذہب ایجاد کیا جائے یا ایسی رواداری کی تلقین کی جائے جس سے مذاہب کا امتیاز جاتا رہے بلکہ اس کی صحیح تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کو اصل مذہب اختیار کرنے کی دعوت دی جائے اس سے یہ مقصد خود بہ خود حاصل ہو جائے گا۔ اختلافات پھر بھی باقی رہ سکتے ہیں لیکن ان کا الجھنا مشکل نہیں ہوگا، صحیح مذہبی جذبات ان کے حل کرنے میں معاون ہوں گے اور کیا عجب اس کے بعد ان اختلافات کی جڑ ہی کٹ جائے۔ قرآن مجید میں اہل کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کے باہمی اختلافات اس بات کا نتیجہ ہیں کہ وہ اصل تعلیم ان کے پاس محفوظ نہیں رہ سکی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس بھیجی تھی، اس لیے اگر وہ ان سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس کا علاج قرآن میں تلاش کرنا چاہیے جو ان تعلیمات کا مستند ترین تازہ ایڈیشن ہے۔

وَ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَ سَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۭ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾ (المآئدہ: ۱۴-۱۶)

''اوران لوگوں سے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں ہم نے عہد لیا تھا تو جن باتوں کی انھیں یاددہانی کی گئی تھی ان میں سے ایک حصہ بھلا بیٹھے تو ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے عداوت و بغض کو بھڑکا دیا۔ اور عنقریب اللہ ان کو ان کاموں سے باخبر کردے گا جو وہ کرتے رہے تھے، اے اہل کتاب یقیناً تمھارے پاس اللہ کا رسول آیا ہے جو بہت سی وہ باتیں جو تم چھپایا کرتے تھے تم پر واضح کررہا ہے اور بہت سی باتوں کو معاف بھی کردیتا ہے۔ یقیناً تمھارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آئی ہے۔ جس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہوں کی طرف ہدایت کرتا ہے جو اس کی رضا کے پیرو ہیں اور وہ انھیں راہ راست پر لگاتا ہے۔''

یہی بات عمومی طور سے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے ضمن میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

متحدہ قومیت

وحدت ادیان سے ملتا جلتا ایک اور فتنہ متحدہ قومیت کا ہے بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ بڑا اور سخت ہے۔ وحدت ادیان کے سیاسی پہلو جو کچھ بھی ہوں پھر بھی وہ اصلاً ایک مذہبی نوعیت کا مسئلہ ہے اس لیے اس کے ساتھ اس زمانہ میں کوئی عمومی نوعیت کی دل چسپی نہیں ہوسکتی اور خاص کر اہل سیاست تو اس میں زیادہ کھل کر اس لیے حصہ نہیں لے سکتے ہیں کہ انھیں سیکولرزم کی لاج رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ حتی الوسع مذہبیات سے دامن کو بچائے رکھیں اور یوں بھی اگر مذہب

شخصی حدود سے باہر قدم نہ نکالے اور سیاست میں دخل انداز ہونے کی کوشش نہ کرے تو انھیں اس سے کوئی خواہ مخواہ کا بیر نہیں ہے کہ لوگ اپنے طور سے کسی مخصوص مذہب پر عقیدہ رکھیں بلکہ وہ اس کو کافی حد تک گوارا کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں، کیوں کہ اختلافات مذاہب کی رنگارنگی ہی سیکولرزم کی جان ہے اور اس کی بہ دولت ہی اس کی ''برکتیں'' اپنی نمود کا موقع پا سکتی ہیں لیکن متحدہ قومیت کا معاملہ ایسا نہیں ہے، اس کا پرچار وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اس لیے اس ضرورت کو ہر حال میں پورا ہی کرنا ہے خواہ اس کے لیے کسی مذہب کے کچھ حدود توڑنے ہی کیوں نہ پڑیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ مذہب کے رائج الوقت محدود تصور کے ساتھ اس میں اور قوم پرستی میں عام طور سے کوئی ایسا کھلا ہوا تضاد بھی محسوس نہیں کیا جاتا ہے۔ اس لیے مذہب کی پاس داری بھی کسی احتیاط کی طالب نہیں ہے، بلکہ ہندستان میں تو مذہبی قوم پرستی نے تمام مذاہب پر فوقیت حاصل کر لی ہے اور خود اہل مذاہب نے اس کی فوقیت کو تسلیم کر لیا ہے، اس لیے احتیاط کی فکر کرنا کیسا، اس میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینا نیک نامی کا موجب ہو سکتا ہے۔

ہندستان کے ہر چھوٹے بڑے کو اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہے کہ ملک کی تمام پچھلی بدبختیوں کا بڑا سبب یہاں کا انتشار و اختلاف رہا ہے۔ ایک طرف ملک کی وسعت کا حال یہ ہے کہ ڈاکٹر ٹیگور کے بہ قول یہ ایک ایسا جغرافیائی ظرف ہے جس میں کئی ملک بھر دیے گئے ہیں (بہ خلاف یورپ کے جو فی الواقع ایک ملک ہے لیکن اسے کئی ملکوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے) اور دوسری طرف یہاں ایک دو نہیں، متعدد قومیں رہتی ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ مذہب، زبان، تہذیب اور رسم و رواج میں زبردست اختلاف رکھتی ہیں، یہاں تک کہ خود ہندو دھرم کے ماننے والے بھی درجنوں قوموں میں منقسم ہیں، ایسی حالت میں ملک کے سیاست دانوں کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ کس طرح ان سب کو ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کیا جائے تا کہ ہندستان دوبارہ کسی نئی بدبختی کا شکار نہ ہو اور متحد ہو کر ترقی کر سکے، اس غرض کے لیے مختلف لوگ مختلف باتوں کا نام لیا کرتے تھے اور اب بھی ان کی نمائندگی کرنے والے موجود ہیں۔ مثلاً ایک بڑے طبقہ کا خیال یہ تھا کہ مذہب اس رشتہ جامعہ کا کام دے سکتا ہے کیوں کہ قومیت کے تمام عناصر میں یہ سب سے طاقت ور عنصر ہے۔ اس لیے اس کی عملی ترویج کے لیے کوشش ہونی چاہیے لیکن چوں کہ

سیاست دانوں کی اکثریت ان لوگوں کی تھی جو مغربی تعلیم و تربیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے، جہاں پر کہ مذہب کو تقریباً خارج البلد قرار دیا جا چکا ہے اور اس کی جگہ قوم پرستی نے لے لی ہے اور ساتھ ہی وہ جس مذہب کے نام سے آشنا تھے اس میں یہ صلاحیت نہیں پاتے تھے کہ وہ اس ضرورت کو رفع کر سکے، کیوں کہ وہ نسل و نسب کے امتیازات کا داعی تھا جو بجائے خود اس انتشار و تشتت کا موجب[1] ہے اور اس کے علاوہ دوسرے مذہب پر نہ ان کی نگاہ تھی اور نہ وہ اپنی قومی غیرت کی بنا پر اور قومی مفادات کی خاطر اس پر نگاہ ڈالنا پسند کرتے تھے اس لیے اس خیال پر اتفاق نہیں ہو سکا اور سوچ بچار کے بعد یہاں کے رہنماؤں نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ قومی لادینی جمہوریت کا قیام ہمارا مدعا ہونا چاہیے۔ اس سے ایک طرف انتشار و کم زوری کا وہ خطرہ بھی پیش نہیں آئے گا جو مذہب کی بنیاد پر پیش آ سکتا تھا اور دوسری طرف ملک میں یک قومی نظریہ فروغ پائے گا جو اتحاد کا اعلیٰ ترین زینہ ہے اور جمہور کی اکثریت چوں کہ ہندو ہی ہے اس لیے وہ اپنی اصل سے بھی دور نہیں ہو سکے گی۔ ان وجوہ سے قومی لادینی جمہوریت کا قیام ملک کی سب سے بڑی اور طاقت ور جماعت کانگریس کی سیاست کا اصل محور رہا ہے۔ اس کی تمام کوششیں، اپنی تحریک آزادی کے دور میں اسی کے لیے وقف رہی ہیں اور اب جب کہ اس کو نظم مملکت کے کلی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں وہ اپنے اسی مقصود و مدعا کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے۔ اردو کو مٹانا اور ہندی کو قومی زبان قرار دے کر زبردستی لوگوں پر مسلط کرنا، اقلیتوں کے تعلیمی نظام کو درہم برہم کرنا اور اس کے بہ جائے ان میں ایک قوم ہونے کا احساس پیدا کرنا وغیرہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی کی مختلف کڑیاں ہیں اور جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے وہ اپنے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے اتنے

---

(۱) ٹنڈن جی نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:

> ''جو سیاست داں اس دیش کے شاشن کو فرقہ وارانہ نظریہ سے چلانے کی باتیں سوچتے ہیں انھیں اپنے دیس کے مختلف رسم و رواج (پرمپراؤں) اور وچار دھاراؤں کو آنکھ سے اوجھل نہیں کرنا چاہیے کسی ایک خیال یا دھرم گرنتھ کو پکڑ کر ہمارا راج سپھل نہیں ہو سکتا، اس طرح سوچنا بھی ہمارے آپسی جھگڑوں کو بڑھائے گا اور حکومت کو کم زور کر دے گا۔''

بے تاب ہیں کہ تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے اس کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں اور بقیہ مراحل بھی وہ جلد سے جلد طے کرنے کے لیے تیز تیز قدم بڑھا رہے ہیں۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ملک کی حکومت اور یہاں کے سیاست داں آج جس تخیل کے تحت کام کر رہے ہیں وہ یہاں کی اکثریت کے لیے کتنا ہی نفع بخش کیوں نہ ہو لیکن، ہندستان میں جو دوسری قومیں رہتی ہیں بالخصوص مسلمان، ملی نقطۂ نظر سے یہ ان کی کامل تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ کیوں کہ متحدہ قومیت کے جز بننے کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ مسلمان تہذیب وتمدن، اخلاق، معاشرت، زبان، ادب اور جذبات ومیلانات، غرض ہر لحاظ سے یہاں کی اکثریت کے ہم رنگ ہو جائیں اور یہ ظاہر بات ہے کہ ایسا کرنے کے بعد وہ سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن مسلمان باقی نہیں رہ سکتے۔ یہ کتنی حیرت کا مقام ہے کہ متحدہ قومیت کے اس کھلے ہوئے نتیجے کے باوجود آج ہمارے بہت سے نامی گرامی اکابرین ملت اسی سر میں اپنا سر ملا رہے ہیں اور خود آگے بڑھ کر اسی کا گھونٹ مسلمانوں کو پلا رہے ہیں اور مسلمان انجام پر غور کیے بغیر اس زہر کو مزے کے ساتھ حلق کے نیچے اتار لے جا رہے ہیں۔

بہ ہر حال مسلمانوں کو اس بارے میں بھی اپنا ذہن اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے۔ ہندستان میں ان کے لیے جتنے خطرات بھی درپیش ہیں ان میں سب سے بڑا خطرہ یہ متحدہ قومیت ہی کا ہے۔ اس لیے اگر وہ اپنے وجود معنوی کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنا چاہیے اور اس سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی تدابیر عمل میں لانی چاہئیں، لیکن یہ یاد رکھیے کہ یہ معاملہ کوئی آسان معاملہ نہیں ہے جو سرسری طور سے حل کر لیا جا سکے اس کے لیے نہایت احتیاط اور تدبیر کے ساتھ اپنی راہ عمل متعین کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ ایک طرف تو اس کا یہ خطرناک پہلو ہے کہ یہ ان کے حق میں زہر سے کم نہیں ہے اور دوسری طرف یہ خطرہ بھی ہے کہ موجودہ زمانہ میں اپنی الگ قومیت کا نام لینا، ہندستان میں اپنے مقام کو نہایت نازک بنا لینا ہے، ہندستان کے موجودہ حالات میں کسی ایسی قوم کا وجود گوارا نہیں کیا جا سکتا جو یہاں کی قومیت سے اپنا کچھ مختلف وجود رکھتی ہو اور ان کے لیے کسی امتیازی حق کی خواہاں ہو، اس کے ساتھ دو ہی سلوک ہو سکتے ہیں۔ اس قوم کو بہ رضا و رغبت اپنی جداگانہ قومیت کا رشتہ چھوڑنے پر آمادہ کیا

جائے اور اگر وہ اس پر راضی نہیں ہوتی ہے تو اس کو قومی حیثیت سے بالکل ناکارہ اور پست بنا کر چھوڑ دیا جائے تاکہ اس کا وجود اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ بن سکے۔ چناں چہ اس وقت یہ دونوں کوششیں ساتھ ساتھ شروع کر دی گئی ہیں تاکہ دونوں کے مل جانے سے جلد نتیجہ برآمد ہو سکے۔

اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کی ایک تدبیر تو یہ ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں میں شدت کے ساتھ اپنے ایک جداگانہ قوم ہونے کا احساس پیدا کرایا جائے اور اس حیثیت سے ان کو اتنا مضبوط بنایا جائے کہ وہ اپنی اس حیثیت کو دوسروں سے منوا سکیں اور خود ان میں ایک مضبوط و مستحکم مرکزیت پیدا ہو جائے جو ان کو اس خطرہ کا شکار ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔

لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر حالات پر گہری نگاہ رکھی جائے تو یہ تدبیر موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے مفید ہونے سے زیادہ مضر ثابت ہوگی۔

ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ عرف عام میں قومیت کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے اس کے لحاظ سے یہاں کے مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں منطقی طور سے غلط قرار نہیں دیا جاسکتا اور اس لحاظ سے یہ ان کا جائز حق ہوسکتا ہے جو آئین ہند میں بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے جداگانہ تشخص و امتیاز کو برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن اور مناسب تدبیر عمل میں لائیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہم ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ بھی کہنے کے لیے تیار ہیں کہ وہ ایک جداگانہ قوم ہونے کی حیثیت سے یہ مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ان میں اپنے مخصوص مذہب و تمدن وغیرہ کی حفاظت کے لیے اپنے جداگانہ انتظام کی سہولتیں اور آسانیاں فراہم کی جائیں اور آئینی و عقلی کسی لحاظ سے ان کا یہ مطالبہ غلط نہیں ہوگا کیوں کہ جب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندستان یہاں کی تمام قوموں کا مشترک وطن ہے اور ان سب کو اپنے تشخصات و امتیازات کو برقرار رکھنے کا پورا حق ہے تو اس کی جو عملی شکلیں کارآمد ہوسکتی ہیں ان کو منظور کیے بغیر چارہ نہیں بالخصوص جب کہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ زبان اور رسم و رواج وغیرہ کے اختلافات کو یہ حیثیت دی گئی ہے کہ ان کی بنیاد پر اندرونی طور سے خود مختار صوبے قائم کیے جا رہے ہیں اور اس چیز کو ملکی وحدت کے منافی نہیں سمجھا جاتا تو اس طور سے مختلف قوموں کا بھی یہ حق ہوسکتا ہے کہ وہ نظام حکومت کے اندر رہتے ہوئے اپنے مخصوص مسائل کا اپنے طور سے بندوبست کر سکیں۔

لیکن جب فی الواقع مسلمان کوئی قوم نہیں ہیں جس کی کھلی ہوئی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص محض کسی مسلم گھرانے میں پیدا ہو جانے سے مسلمان نہیں ہوتا بلکہ اس کا مسلمان ہونا ان عقائد و اعمال کے تسلیم و اتباع پر موقوف ہے جن کی تلقین اسلام نے کی ہے تو یہ رویہ ان کے لیے اصولی طور سے بھی غلط ہوگا اور اس کے نتائج بھی ان کے حق میں اچھے نہیں ہوں گے، خاص طور سے موجودہ حالات میں جب کہ قوم پرستانہ نقطۂ نظر پورے ملک پر چھایا ہوا ہے اور خود مسلمانوں کی پچھلی قومی تحریکات نے مسلمانوں کو ایک نہایت نازک مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جس میں آئین و دستور کے تحفظات سے فائدہ اٹھانا بھی ان کے لیے سخت ترین خطرات کا موجب ہے اس لیے ہمارے نزدیک مسلمانوں کو اس تدبیر کا سہارا چھوڑ کر اپنی اصلی حیثیت کو اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس کا ذکر آئندہ آئے گا وہ ان کا مذہبی فریضہ بھی ہے اور ساتھ ہی اس سے ان کے دنیاوی مفادات کو وہ خطرات بھی پیش نہیں آ سکتے ہیں جو بہ حالات موجودہ مسلم قوم پرستانہ ہر تدبیر کے ساتھ ناگزیر طور سے پیش آ سکتے ہیں، سب سے بڑا خطرہ ہندوؤں کے قوم پرستانہ نقطۂ نظر کی جانب سے ہے لیکن اصولی پارٹی کی حیثیت اختیار کر لینے کے بعد غیر مسلموں کا رویہ بھی بدل سکتا ہے اور خود مسلمانوں کی دل چسپیوں کے نقطۂ نظر میں بہت کچھ تبدیلی واقع ہو جائے گی، جس کی وجہ سے موجودہ بہت سے فرقہ وارانہ مفادات کی جگہ دوسرے اہم اسلامی مفادات لے لیں گے اور یہ ان میں گونا گوں اہم اور خوش آئندہ تبدیلیوں کا پیش خیمہ ہوگا۔

اس وقت ہندستان میں مسلمانوں کے لیے سب سے اہم سوال یہی ہے کہ وہ دو مختلف حیثیتوں کے مالک ہیں، ایک حیثیت ان کے مسلمان ہونے کی ہے اور دوسری حیثیت ان کے ہندستانی ہونے کی ہے اور ان کو ان دونوں میں نہایت ،چا تلا توافق پیدا کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ اس توافق میں فرق آنے کا نتیجہ یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان مسلمان نہ رہیں یا پورے ملک کو اپنا دشمن بنا لیں، اور یہ توافق پیدا کرنا کسی قوم پرستانہ تدبیر کے ساتھ ممکن نہیں ہے کیوں کہ اس نقطہ نظر کے چھا جانے کے بعد اولاً تو اسلامی حیثیت سے خود مسلمانوں میں ایسی کم زوریاں پیدا ہو جائیں گی جو ان کے مسلمان ہونے کی حیثیت کو کم زور کر دیں جس کی بنا پر وہ عمل و کردار کی مضبوطی نہ دکھلا سکیں جو حالات سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے اور دوسرے اس کا جو ردِ عمل

ہندو ذہنیت پر پڑے گا اس کے نتیجے میں آئے دن یہ توافق درہم برہم ہوتا رہے گا اور اس کے برعکس اپنی صحیح اسلامی حیثیت یعنی ایک اصولی پارٹی کا مقام اختیار کر لینے کے بعد فرقہ وارانہ مسائل ازخود ختم ہو جائیں گے اور اب ان کو جو مشکلات پیش آئیں گی وہ ہندو مسلم سوال کی بنیاد پر نہیں ہوں گی بلکہ بعض ان اصولوں کی بنیاد پر ہوں گی جن کی تائید و حمایت میں بہت ممکن ہے خود بہت سے غیر مسلم بھی آپ کے شریک حال ہوں۔ اور یہ تو قطعی بات ہے کہ اگر تمام مسلمان نہیں صرف ان کا ایک تہائی حصہ بھی اس حیثیت کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو وہ حالات پر اتنا قابو پا سکتے ہیں کہ وہ اسلامی حیثیت سے ان کے لیے وجہ پریشانی نہ بن سکیں اور اگر بنیں تو وہ ان کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں۔

حقیقی نصب العین

پچھلے صفحات سے غالباً یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ اس وقت مسلمانوں کی اہم ترین ضرورت، مقصد و نصب العین کی تعین ہے اور اس ضمن میں یہ بھی معلوم ہو چکا ہوگا کہ مقصد اور نصب العین کے نام سے آج جو باتیں ان کے سامنے پیش کی جارہی ہیں وہ فی نفسہ نہ مقصد بنائے جانے کے قابل باتیں ہیں اور نہ مسلمانوں کی فطرت و مزاج سے ان کو کوئی مناسبت ہے۔ ان مباحث سے فارغ ہونے کے بعد اب صرف اس سوال پر غور کرنا باقی رہ گیا ہے کہ ہمارا واقعی مقصود کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے؟

یہ سوال ظاہر ہے، ایک نہایت اہم سوال ہے، بلکہ یہ ایک طرح سے یہاں خلاصۂ بحث کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ہم یہاں اس کی زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے اول تو قلت فرصت بھی اس سے مانع ہے دوسرے ہم اپنے گزشتہ مباحث میں بار بار مسلمانوں کے حقیقی مقصد و نصب العین کی طرف اشارہ بھی کرتے آئے ہیں جو ایک حد تک مقصد و نصب العین کی توضیح کے لیے کافی ہیں اور ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ فی نفسہٖ مقصد و نصب العین کی توضیح و تفصیل کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہماری اصل کمزوری یہ نہیں ہے کہ بہ حیثیت مسلمان فی الواقع ہمارا کوئی مقصد و نصب العین متعین نہیں ہے، یا ہم اس سے سرے سے ناواقف ہیں، بلکہ یہ ہے اور حقیقتاً یہ نہایت ہی افسوس ناک بات ہے کہ ایک نہایت اعلیٰ اور روشن مقصد زندگی رکھتے ہوئے بھی جس سے کم و بیش ہر مسلمان واقف ہے کیوں کہ ہمارے واعظین اور مصنفین نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں بار بار اس کو دھرایا ہے اور اتنی کثرت اور اتنی وضاحت کے ساتھ دھرایا

ہے کہ اس کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہ گیا ہے —— ہم عملاً اس سے بہت دور ہیں، اتنے دور کہ ہماری عملی حالت کو دیکھ کر ہمارے بارے میں اس کے سوا اور کچھ سمجھا ہی نہیں جا سکتا کہ گویا ہم سرے سے کوئی مقصد اور نصب العین رکھتے ہی نہیں ہیں، جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اس لیے اس بات کی تو یقیناً ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ اعمال اور سرگرمیوں کا جائزہ لے کر ان کو یہ بتایا جائے کہ ان کی زندگی مقصد کے تصور سے کس طرح خالی ہے، لیکن اس بات کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ عملی طور سے ان کے سامنے ان کے متعین اور واضح مقصد کی توضیح و تفصیل میں کچھ زیادہ وقت صرف کیا جائے، اس لیے اس موقع پر ہم تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے، اس کے بارے میں چند سرسری اشارات کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کا ذہن ایک خاص نقطہ پر مرکوز ہو جائے۔ جو لوگ ان اشارات کو زیادہ تفصیل کی روشنی میں سمجھنا چاہتے ہیں ان کو جماعت اسلامی کے لٹریچر کی خاص اس موضوع سے متعلق کتابوں مثلاً دعوتِ دین اور شہادتِ حق وغیرہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف قسم کی قوتیں اور صلاحیتیں مثلاً وجدان اور عقل وغیرہ عطا فرمائی ہیں جن سے کام لے کر وہ بلا شبہ ایک حد تک خیر و شر کی معرفت حاصل کر سکتا اور اچھے بُرے راستوں میں تفریق و امتیاز پیدا کر سکتا ہے، لیکن اول تو انسانی زندگی کی جملہ ضروریات ان قوتوں سے پوری نہیں ہو سکتیں کیوں کہ وہ ناپیدا کنار اور حد درجہ پر پیچ ہیں اور ان کے مقابلے میں ان قوتوں کا دائرۂ عمل نہایت محدود اور مختصر ہے اور دوسرے ان کو کچھ ایسی قوتیں اور صلاحیتیں بھی عطا ہوئی ہیں جن کا اکثر اوقات اس پہلی قسم کی قوتوں اور صلاحیتوں سے ٹکراؤ بھی ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ان کا کام غلط اور ناقابل اعتماد ہو جایا کرتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان قوتوں کے ساتھ ہی ان سے زیادہ مضبوط اور قابل اعتماد ایک اور ذریعہ معلومات کا بھی انتظام فرمایا ہے اور وہ ہے انبیاء و رسل کا سلسلہ بعثت۔ چناں چہ، جس وقت حضرت آدم علیہ السلام کو اس خاک دانِ ارضی میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا اس وقت اس کا اعلان کر دیا گیا تھا۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٨﴾ (البقرہ:۳۸)

''پس اگر تمھارے پاس میری جانب سے ہدایت آئے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا اسے خوف اور غم لاحق نہ ہوگا۔''

اور اس کے مطابق مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کے اندر برابر رسول آتے رہے۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ (المؤمنون: ۴۴)

''پھر ہم نے پے در پے رسول بھیجے۔''

تا آں کہ انسان کی ہدایت و رہنمائی کی بنیادی ضرورت رفع ہوگئی، دین اپنی کامل شکل میں نمودار ہوگیا۔ خیر و شر ایک دوسرے سے ممتاز ہوگئے اور جان بوجھ کر اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے سوا جس کا اختیار انسان کو ہر حال میں حاصل ہے شر میں مبتلا ہونے کی تمام راہیں بند ہوگئیں۔

لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّ یَحْیٰى مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ ؕ

(الانفال: ۴۲)

''تا کہ جو ہلاک ہو کھلی ہوئی دلیل کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ کھلی ہوئی دلیل پا کر زندہ رہے۔''

اس لیے آں حضرت صلی الہ علیہ وسلم پر یہ سلسلہ ہدایت ختم کر دیا گیا۔

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ (المآئدۃ: ۳)

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔''

(۲) ان انبیاء کرام نے دنیا میں آ کر جو کام انجام دیا وہ یہ تھا کہ وہ اپنے قول و عمل کے ذریعے لوگوں پر حق واضح کر دیں تا کہ قیامت کے دن کسی کو یہ عذر کرنے کا موقع نہ مل سکے کہ ہم حق سے ناآشنا تھے اس لیے ہم نے اس کی پیروی نہیں کی تھی۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۱۶۵﴾ (النسآء: ۱۶۵)

''رسول بشارت دینے والے اور ڈرانے والے تا کہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے

اللہ پر حجت نہ رہے اور اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔''

اسی بنا پر قیامت کے دن یہ انبیاء اپنی اپنی امت پر اپنی تبلیغ حق کی گواہی دیں گے۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝ (النسآء: ۴۱، ۴۲)

''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے بلائیں گے شہادت دینے والے کو اور تجھ کو ان لوگوں پر شہادت کے لیے بلائیں گے اس دن جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور رسول کی نافرمانی کی تھی، خواہش کریں گے کہ کاش زمین ان کے اوپر برابر کر دی جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہیں سکیں گے۔''

(۳) ان انبیاء کرام کی دعوت پر جو لوگ ایمان لائے تھے وہ بھی شہادت حق کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اور ان کی یہ شہادت درحقیقت انبیاء کرام کی شہادت ہی کا ایک جز تھی یعنی ان کے ذریعے اُن کے کام کو قائم رکھنا اور آگے بڑھانا مقصود تھا۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۫ (آل عمران: ۱۸۷)

''اور جب کہ اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ تم کتاب الٰہی کو لوگوں پر ضرور واضح کرتے رہو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔''

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ (المآئدۃ: ۴۴)

''بے شک ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے، اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے اللہ کے وہ نبی جو اس کے فرماں بردار تھے ان لوگوں کے لیے جو یہودی تھے اور (اسی طرح سے) رہبان اور احبار بھی، (کتاب الٰہی کے مطابق ہی فیصلے کرتے تھے) کیوں کہ وہ اللہ کی کتاب کے نگراں ٹھہرائے گئے تھے اور اس کے گواہ تھے۔''

اور اسی بنا پر اگر ان لوگوں نے اپنی اس ذمہ داری کو ادا نہیں کیا تو وہ ملامت و سرزنش کے مستحق ٹھہرائے گئے۔

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

(المآئدہ:۷۹)

''وہ جو بُرے کام کر رہے تھے اس سے ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے، کیا ہی برا کام وہ کرتے تھے۔''

لَوْ لَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ (المآئدہ:۶۳)

''کیوں نہیں منع کرتے ان کو ربانی اور احبار گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے، بہت برا ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

اور جن لوگوں نے اپنی ذمہ داری کو ادا کیا وہ مستحق توصیف قرار دیے گئے۔

لَيْسُوْا سَوَاۗءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (آلِ عمران:۱۱۳، ۱۱۴)

''سب اہل کتاب برابر نہیں ہیں۔ ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ دین پر قائم ہے یہ لوگ اللہ کی آیات راتوں کو پڑھتے ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم کرتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں، نیکیوں میں آگے بڑھتے ہیں۔ ایسے لوگ صالح ہیں۔''

(۴) اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چوں کہ کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں تھا اس لیے امت مسلمہ پر یہ فرض خاص طور سے عائد کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اس فرض کی ادائیگی ہی پر لوگوں کے اس عذر کا خاتمہ ہوسکتا ہے جس کو رفع کرنے کے لیے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، انبیاء کرام تشریف لائے تھے، بالفاظ دیگر اس فرض کی کوتاہی کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ

اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ ان لوگوں کی گمراہی اور غلط کاری کی بھی مسئول ہوگی جن پر حق واضح کرنے کی یہ ذمہ دار تھی لیکن اس نے ان پر حق واضح نہیں کیا۔

تبلیغ حق کی یہ نازک ذمہ داری مسلمانوں کے وجود میں آنے سے پہلے متعین ہوچکی تھی۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖ (الحج:۷۸)

’’وہی ہے جس نے تمھارا نام مسلم اس سے قبل رکھا تھا اور اس کتاب میں بھی تمھارا یہی نام ہے تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔‘‘

اور ان کے وجود میں آنے کے بعد اللہ اور اس کے رسول سے بار بار نہایت وضاحت کے ساتھ ان کی اس ذمہ داری کو بیان فرمایا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ (آلِ عمران:۱۱۰)

’’تم بہترین گروہ ہو جو تمام انسانوں کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم معروف کا حکم کرتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ (البقرہ:۱۴۳)

’’اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی گروہ بنایا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔‘‘

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انتم شهداء الله فى الارض

’’تم زمین میں اللہ کے شہداء (دین کے گواہ) ہو۔‘‘

اور اس میں کوتاہی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

والذى نفسى بيده لتامرن بالمعروف والتنهون عن

المنکر اولیو شکن اللّٰہ ان یبعث علیکم عذاباً من عندہ ثم لتدعُنّہٗ ولا یستجاب لکم۔ (ترمذی)

''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور ضرور معروف کا حکم کرتے اور منکر سے روکتے رہو، ورنہ یہ بات کچھ دور نہ ہوگی کہ اللہ تم پر اپنے پاس سے عذاب بھیج دے۔ پھر تم دعائیں مانگو گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔''

(۵) یہ شہادت حق پوری امت مسلمہ کی مشترک ذمہ داری ہے۔ اس لیے اس کے اہتمام کے لیے بہ حیثیت مجموعی پوری امت مخاطب کی گئی ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آلِ عمران: ۱۰۴)

''تم میں سے ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے، معروف کا حکم کرے، منکر سے روکے اور یہی لوگ کام یاب ہیں۔''

لیکن اس کے ساتھ ہر ہر فرد اپنے دائرہ کے اندر اور اپنی استطاعت کے مطابق اپنی انفرادی حیثیت میں بھی مکلّف ہے۔

من رای منکم منکراً فلیغیّرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ۔ وذالک اضعف الایمان۔ (مسلم)

''تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے مٹادے اور اگر ایسا نہ کرسکے تو اپنی زبان سے مٹانے کی جدوجہد کرے اور یہ بھی نہ کرسکے تو دل سے مٹانے کے لیے تڑپے اور یہ ایمان کا سب سے کم زور درجہ ہے۔''

الاکلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ فالامام الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیتہٖ والرجل راعٍ علی اھل بیتہٖ وھو مسئول عن رعیّتہ والمرآۃ راعیۃ علی بیت زوجھا وولدہٖ وھی مسئولۃ عنھم وعبدالرجل راعٍ علی مال سیدہ وھو مسئول عنہ الا فکلکم راعٍ وکلکم

مسئول عن رعیتہ۔ (بخاری و مسلم)

''سن رکھو! تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور ہر ایک سے اس کی نگرانی میں دی ہوئی چیزوں اور انسانوں کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ پس وہ شخص جو تمام انسانوں کا امیر ہے وہ نگراں ہے اور اس سے اس کے بارے میں باز پرس ہوگی، مرد اپنے گھر والوں کا نگراں ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگراں ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا اور انسان کا غلام اپنے آقا کی دولت کا نگراں ہے اور اس سے اس کے بارے میں باز پرس ہوگی، تو تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور ہر شخص کو اس نگرانی میں دی ہوئی چیزوں اور انسانوں کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔''

ان آیات و احادیث سے یہ بات پوری طرح آشکارا ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کا اصل کام اللہ کا سپاہی بن کر اپنے قول و عمل کے ذریعہ اس حق کی شہادت دینا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے دنیا کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے اور یہی ان کی زندگی کا حقیقی مقصد و نصب العین ہے۔ لیکن یہ کیسے رنج و افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان بہ حیثیت عمومی اس کام سے اتنے غافل ہو چکے ہیں اور اس کو چھوڑ کر مختلف قسم کے قومی و شخصی اغراض و مقاصد میں پوری طرح منہمک ہو گئے ہیں، حتیٰ کہ آج ان کی عملی حالت کو دیکھتے ہوئے ہر شخص یہ سوال کرنے پر مجبور ہے کہ ان کا مقصد و نصب العین کیا ہے؟ اور اس سوال پر بحث و فکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ غفلت و مدہوشی کی کیا اس سے بڑی کوئی مثال ہوسکتی ہے۔

لیکن بہ ہر حال اب اس حالت پر ماتم کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا ہمیں صرف اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ آئندہ ہم اپنی حالت درست کریں اور پھر سے اپنے جادہ منزل کو پہچاننے کی کوشش کریں، یقیناً ہماری پچھلی غفلتیں بڑی شدید رہی ہیں اور ان کے نتیجے میں بلاشبہ ہم اپنی اصلی راہ اور منزل سے بہت دور جا پڑے ہیں لیکن یہ غنیمت ہے کہ ہم نے اپنے پیچھے جو نقوش قدم چھوڑے ہیں وہ ابھی مٹے نہیں ہیں اور ساتھ ہی ہماری غلط روی کے ہر موڑ پر اب بھی ہماری کچھ ایسی یادگاریں موجود ہیں جن سے بہ آسانی پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے انحراف کی راہیں

کہاں کہاں سے پھوٹی ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان نقوش اور ان یادگاری علامتوں کی مدد سے آسانی کے ساتھ اپنی صحیح راہ ومنزل کی طرف لوٹ سکتے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اگرچہ ہم نے اپنے اس طویل دور غفلت میں اپنی بہت سی قیمتی چیزیں ضائع کردی ہیں اور بسا اوقات مشکلات راہ سے گھبرا کر ہم نے خود ہی اپنا باردوش ہلکا کرنے کے لیے اپنی بہت سی قیمتی چیزیں کندھے سے اتار پھینکی ہیں لیکن یہ غنیمت ہے کہ دنیا کی غفلتوں اور پریشانیوں میں کبھی ہم اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوئے کہ اپنی اس کتاب ہدایت کو ہمیشہ کے لیے خیرآباد کہہ دیں جو دنیا میں اتاری ہی اس لیے گئی ہے کہ وہ سفر حیات میں ہماری مدد کرے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کتاب کو ہم نے محض گلے کا تعویذ بنا کر رکھا اور اس کا جو حقیقی مقصد ہے۔ اس کی طرف کچھ توجہ نہیں کی ورنہ جس حالت میں ہم مبتلا ہیں اس کی نوبت ہی نہیں آتی بہ ہر حال اس کتاب کا منشا خود اللہ تعالیٰ کے الفاظ میں موجود ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ (ابراہیم:۱)

''یہ کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے تا کہ لوگوں کو ان کے رب کے اذن سے تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئیں، یعنی زبردست اور مستحق حمد ہستی کی راہ پر۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جامع پیرایہ میں اس کی حقیقت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔

ضرب الله مثلاً صراطًا مستقيماً وعن جنبى الصراط سوران فيهما ابواب مفتحة وعلى الابواب ستور مرفاة وعندراس الصراط داعٍ يقول استقيمواعلى الصراط ولاتعوجّوافوق ذالک داعٍ يدعوكلّما هم عبدان يفتح شيئًا من تلک الابواب۔قال ويحک لا تفتحه فانک ان تفتحه تلجه ثم فسره فاخبران الطراط هو الاسلام وان الابواب المفتحة محارم الله وان الداعى على راس الصراط هوالقرآن وان الداعى من فوقه هوواعظ الله فى

قلب کل مومن۔

''اللہ نے ایک مثال بیان کی ہے۔ایک سیدھی راہ ہے۔ایک سیدھی راہ ہے۔اس کی دونوں جانب دو دیواریں ہیں جن میں دروازے لگے ہوئے ہیں اور وہ کھلے ہیں، دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں اور راستے کے ایک سرے پر ایک داعی ہے جو کہہ رہا ہے کہ راستے پر سیدھے چلو اور کجی اختیار نہ کرو۔اور اس کے سوا ایک داعی اور ہے جو اس وقت پکارتا ہے جب کوئی بندہ کسی دروازہ کو کھولنا چاہتا ہے، وہ کہتا ہے افسوس تجھ پر! اسے نہ کھول، کیوں کہ اگر تو نے اسے کھولا تو اس میں داخل ہو جائے گا۔ پھر آپؐ نے اس مثال کی تشریح فرمائی اور خبر دی کہ راستہ تو اسلام ہے اور کھلے ہوئے دروازے وہ چیزیں ہیں جنھیں اللہ نے حرام کر دیا ہے اور لٹکے ہوئے پردے اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور راستے کے سرے پر کھڑا ہونے والا داعی قرآن ہے اور جو داعی اس کے سوا ہے وہ اللہ کی جانب سے نصیحت کرنے والا ضمیر ہے جو ہر مومن کے دل میں ہے۔''

ضرورت ہے کہ ہم اس کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیں اور اس کو اپنی زندگی کا رہنما بنا کر اس کی ہدایت کے تحت اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کریں، ہماری پچھلی تمام کامیابیاں اسی کتاب ہدایت کی رہین منت تھیں اور آئندہ بھی ہم اگر کام یابی چاہتے ہیں تو اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

لن يصلح اخر هٰذه الامة الابما صلح به اولها

''اس امت کے بعد والوں کی حالت بھی اسی چیز سے سدھر سکتی ہے جس سے شروع کے لوگوں کی۔''

اور صرف اپنی ہی کام یابی نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کی کام یابی اسی کی اتباع پر منحصر ہے، کیوں کہ آج دنیا میں جو کچھ فتنہ وفساد برپا ہے اور خود ہندستان میں جو طرح طرح کی خرابیاں سر اٹھا رہی ہیں، ان کا حقیقی سبب یہی ہے کہ انسانوں نے اپنے پیدا کرنے والے کے بتائے ہوئے حقیقی سرچشمۂ ہدایت سے منہ موڑ لیا ہے اور اس کی بہ جائے وہ محض اپنی ناقص عقل خرد کے بندے بن گئے ہیں۔اس لیے صرف اپنے بقاء وتحفظ اور اپنی کام یابی کے مقصد ہی کے

پیش نظر نہیں بلکہ پوری دنیا اور خاص طور سے اپنے وطن اور ابناء وطن کی فلاح و بہبود کے لیے بھی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں خود اس کتاب ہدایت کو اپنائیں اور اس کی دعوت کو اپنے قول وعمل کے ذریعے دنیا میں عام کردیں۔ یہ ان کا ایک مذہبی فریضہ بھی ہے اور ساتھ ہی ایک زبردست انسانی وملکی خدمت بھی۔ بلکہ ایک ایسے وقت میں جب کہ دنیا اس ہدایت کی ہمیشہ سے زیادہ محتاج ہورہی ہے۔ اور اس کو اس کی طلب بھی ہے کیوں کہ وہ مختلف قسم کے خوش نما ازموں کو آزما کر ہار تھک چکی ہے، اس کام سے غفلت برتنا ایک زبردست معصیت ہے۔ ؎

اگر بینم کہ نا بینا و چاہ است
اگر خاموش بہ نشینم گناہ است

شہادتِ قولی اور شہادتِ عملی

اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ دنیا میں مسلمانوں کا اصلی کام، شہادت حق ہے۔ اب آیئے اس بات پر غور کریں کہ یہ اہم کام ہمیں کس طرح انجام دینا ہے۔

شہادتِ حق کا عام، متداول اور عرفی طریقہ تو یہی ہے کہ ہم اپنے قول سے حق کی شہادت دیں اور بلاشبہ یہ مفید ہے۔ آج کتنے لوگ ہیں جو محض اس لیے گم رہی اور غلط روی کا شکار ہیں کہ ان کے کانوں نے حق کی صدائے دل کش سنی ہی نہیں ہے۔ اگر وہ حق سے ایک بار آشنا ہوجائیں تو چوں کہ ہر انسان کو فطرتاً حق کے ساتھ ایک خاص لگاؤ ہوتا ہے اس لیے یقینی طور سے ان کے فکر وعمل میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوسکتی ہیں ایسے لوگوں کے لیے ہماری قولی شہادت یقیناً نفع بخش چیز ہے اور جو لوگ اس کام میں لگ جائیں وہ اس پر اجر وثواب پانے کے بھی مستحق ہوسکتے ہیں، جیسا کہ

من دعی الی ھدی کان لہ من الاجر مثل اجور من تبعہ لا ینقص ذلک من اجورھم شیئا۔

”جو کوئی کسی ہدایت کی طرف بلائے تو اس کو اس ہدایت پر چلنے والوں ہی کی طرح اجر

ملے گا اور اس سے عمل کرنے والوں کے اجر میں کمی نہیں ہوگی۔"

اور

من احییٰ سنة من سنتی قدامتیت بعدی فان له من الاجرمثل اجورمن عمل بها من غیر ان ینقص من اجورهم شیئا

"جو کوئی میری کسی ایسی سنت کو زندہ کرے گا جو مردہ ہو چکی ہو تو عمل کرنے والوں کے اجر میں کمی کیے بغیر اس شخص کو بھی انہی کی طرح اجر ہوگا۔"

وغیرہ احادیث سے واضح ہے لیکن اصل یہ ہے کہ جب تک قول کے ساتھ عمل کی شہادت نہ ہو اس وقت تک نہ تو انسان اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہوسکتا ہے اور نہ اس کی اس قولی تبلیغ کے اچھے نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہر مسلمان تبلیغ سے پہلے اس بات کا مکلّف ہے کہ اس کی عملی پابندی میں پوری طرح کوشاں ہو۔ کیوں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا کام بہ ہر حال ثانوی ہے اور اولین ذمہ داری خود اپنی اصلاح کی ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں دوسروں سے پہلے خود اپنی اصلاح کا حکم دیا گیا ہے:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا الخ۔ (التحریم:۶)

"ایمان والو، اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو اس آگ سے بچاؤ۔ الخ"

اور ان لوگوں کو ملامت کی گئی ہے جو دوسروں کو تو نیکیوں کا حکم دیتے ہیں لیکن خود اپنے کو اس کا مخاطب نہیں گردانتے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ:۴۴)

"کیا تم دوسروں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔"

اور اسی بنا پر انبیاء کرام کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جن باتوں کی طرف دوسروں کو بلاتے تھے یا جن باتوں سے منع فرماتے تھے پہلے خود ان کے پابند بن جاتے تھے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ (البقرہ:۲۸۵)

''رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اتاری گئی اور اہل ایمان۔''

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾ (الانعام:۱۶۲،۱۶۳)

''کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہی مجھ کو حکم ہوا ہے اور میں سب سے پہلے فرماں بردار ہوں۔''

وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ (ہود:۸۸)

''اور میں نہیں چاہتا کہ بعد کو خود وہ کام کروں جس سے تم کو روکتا ہوں۔''

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ ۚ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا وَ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءَ ۚ (المآئدہ:۴۴)

ہم نے نازل کی توریت جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اس کے مطابق پیغمبر جو کہ اللہ کے حکم بردار تھے، یہود کو حکم دیتے تھے اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم کیوں کہ وہ اللہ کی کتاب کے نگراں ٹھہرائے گئے تھے اور وہ اس کے گواہ تھے۔''

دوسری بات یہ ہے کہ تبلیغی نقطۂ نظر سے قول بلا عمل کا فائدہ بس زیادہ سے زیادہ ان لوگوں تک محدود ہوگا جن کی حق پسند فطرت زنگ آلود بالکل نہ ہوئی ہو اور وہ صرف قول دیکھتے ہوں، قائل کی شخصیت اور حالت سے کوئی سروکار نہ رکھتے ہوں لیکن یہ معلوم بات ہے کہ اس طرح کے لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے، اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے جو قول کے ساتھ قائل کی شخصیت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں اور اس وقت تک اس سے متاثر نہیں ہوتے جب تک خود اس کی زندگی میں اس کا پرتو نہ دیکھ لیں، کیوں کہ اگر کسی شخص کی عملی زندگی اس کی دعوت سے گہری مطابقت نہ رکھتی ہو تو ظاہر بینوں کی نگاہ میں یہ چیز اس کی دعوت کی صداقت و حقانیت کے خلاف ایک دلیل بن جاتی ہے پھر وہ اس طرف دھیان دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ آج ہماری تبلیغی کوششیں اسی بنا پر کوئی خاص اثر پیدا نہیں کرتیں کہ ہم اسلام کے فضائل و محاسن پر جو لمبی لمبی

تقریریں کرتے یا کتابیں تصنیف کرتے ہیں ان کو دیکھنے اور سننے کے بعد دنیا خود ہماری عملی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ان خوبیوں کو تلاش کرتی ہے اور جب یہاں اس کو ان کا نشان نہیں ملتا ہے تو وہ ہماری باتوں کو خیالی باتیں سمجھ کر نظر انداز کر دیتی ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو وقت کی اہم ترضرورت یہ ہے کہ ہماری زبانوں کے ساتھ ہی ہمارا عمل بھی اسلام کی حقانیت کا گواہ بن جائے۔ اس کے بغیر سب کچھ ہوتا رہے گا، لیکن لوگوں پر حق پھر بھی مخفی ہی رہے گا۔

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو
پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا بن جا

اور اس سلسلے کی تیسری آخری بات یہ ہے کہ تبلیغ وشہادت کا کام کوئی پیشہ ورانہ کام نہیں ہے جسے آدمی بس سیکھ کر بہ طور پیشہ انجام دینے لگے۔ یہ درحقیقت دل کا ایک اندرونی جذبہ ہے جس کا ظہور تبلیغ وشہادت کی کدوکاوش کی شکل میں نمایاں ہوتا ہے۔ جب کسی شخص کو حق کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے مطابق اپنی نجات اور کام یابی کی باتیں تلاش کرے اور جب اس پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نجات وکام یابی کے لیے اپنی اصلاح اور اس کے ساتھ ہی دوسروں کی اصلاح کی فکر کرنی ضروری ہے اور خود حق آ گاہی اپنی فطرت کی بنا پر اسے مجبور کرنے لگتی ہے کہ وہ اسے لے کر دوسروں تک بھی پہنچے تو اس کے قدم خود بہ خود میدان شہادت کی مسافتیں طے کرنے لگتے ہیں اور پھر جب تک اس کی جان میں جان ہے وہ ہمہ تن اس میں مصروف رہتا ہے یہاں تک کہ اگر ضرورت پیش آتی ہے تو اپنی جان دے کر حق کے حق ہونے کی شہادت دیتا ہے اور یہ شہادت حق کا سب سے اونچا مقام ہے۔ چناں چہ اسی بنا پر جو لوگ اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد میں مارے جاتے ہیں وہ شہید کہلاتے ہیں کیوں کہ درحقیقت وہ اپنی جان دے کر یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ جس مقصد ونصب العین کے وہ داعی تھے اس کی صداقت و حقانیت پر خود ان کا یقین غیر متزلزل تھا۔ اس تفصیل کی روشنی میں اگر آپ غور کریں تو یہ معلوم ہوگا کہ اگر تبلیغ وشہادت کا کام صحیح جذبہ کے ساتھ شروع کیا جائے تو اس کے ضمن میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ داعی ومبلغ خود ان باتوں کا عامل ہوگا اور اس کے بعد دوسروں کو دعوت دے گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کے معنی یہی سمجھے جاسکتے ہیں کہ ابھی خود اس میں حق کی معرفت یا اس کی

گرویدگی صحیح معنوں میں پیدا نہیں ہوئی ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کچھ مواقع کی بنا پر حق آگاہی کا یہ تقاضا اپنی کامل شکل میں نمایاں یا ظہور پذیر نہ ہوسکے لیکن اس کی طلب وتمنا سے اس کا دل خالی نہیں ہوسکتا اس لیے دیر سویر یہ ظاہر ہوکر رہے گا اور اگر کوئی شخص اس جذبہ سے بھی خالی ہے اور وہ شہادت حق کا کام انجام دیتا ہے تو اوّل تو اس کا زیادہ دنوں تک برقرار رہنا دشوار ہے اور اگر برقرار رہ بھی سکے تو ایسے شخص کی کوششیں تبلیغی نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ سودمند نہیں ہوسکتیں، یہ اور بات ہے کہ اس کی نیت میں کوئی فتور نہ ہو تو وہ اللہ کے یہاں اس کا کچھ اجر وثواب بھی پا جائے۔

فرار کی راہیں

اوپر کی فصل میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے عملی شہادت کی اہمیت اچھی طرح نمایاں ہے لیکن ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ قول وعمل کی مطابقت کے ضمن میں کسی قدر غلو سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے عملاً قولی شہادت کی اہمیت ہی سرے سے ختم ہوگئی ہے اور اس کی بنا پر بہت سے لوگ شہادت وتبلیغ کی ذمہ داریوں ہی سے اپنے کو سبک دوش سمجھنے لگے ہیں اس لیے اس ضمن کے بعض شبہات کا ازالہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انسان کے لیے سب سے مقدم کام یہ ہے کہ وہ پہلے اپنی اصلاح کرے، پھر جب وہ اپنے کو اچھی طرح سنوارے تب کہیں جاکر اسے شہادتِ حق کی جرأت کرنی چاہیے۔ وہ اپنے اس خیال پر بالعموم دو طرح کے استدلال کرتے ہیں۔

(الف) جب تک انسان خود عیوب ونقائص سے پاک نہ ہو اس کی باتیں دوسروں پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔

(ب) شرعاً اپنی اصلاح کا کام مقدم ہے اس لیے اس کے بغیر دوسروں کی اصلاح یا نصیحت کا کام شرعی ترتیب کے لحاظ سے غلط ہے بلکہ ان کے خیال کے مطابق یہ گناہ کا کام ہے کیوں کہ ان کے نزدیک قرآن مجید کی آیات

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (المآئدہ:۱۰۵)

''اے ایمان والو! تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کی، جب تم راہ راست پر ہوئے تو جو کوئی گم راہ ہوا وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔''

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ (الصّف:۲)

''اے ایمان لانے والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے کرتے نہیں ہو۔''

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ:۴۴)

''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔''

اور اسی طرح کی دوسری آیات کا منشا یہ ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کی جائے اور اس سے فراغت حاصل کیے بغیر امر بالمعروف و نہی عن المنکر یا شہادت حق کے کام کو ہاتھ نہ لگایا جائے چناں چہ یہ لوگ اپنے اس مفروضے کی بنا پر نہ صرف یہ کہ خود اس ذمے داری کی ادائیگی سے پہلوتہی کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں کو ملامت کرتے ہیں جو ان کے معیار تقویٰ پر پورے اترے بغیر اس کام کو کر رہے ہوتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ دونوں استدلال نظر کا دھوکا ہیں یا شیطان اور نفسِ امارہ کا فریب، جن میں مبتلا ہو کر آدمی راہِ حق سے بھٹک جایا کرتا ہے۔

جہاں تک پہلے استدلال کا تعلق ہے اس کی غلطی بڑی آسانی سے یوں سمجھی جاسکتی ہے کہ تاثیر و تاثر کا تمام تر دارومدار محض کہنے والے کی شخصیت پر منحصر نہیں ہے، ورنہ اس کے بہ موجب یہ ہونا چاہیے کہ انبیاء کرام جو صالح ترین اور مقدس ترین مخلوق تھے، ان کے وعظ و تلقین کا وار کبھی خالی نہ جاتا حالاں کہ سب جانتے ہیں، یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ اس لیے اصل یہ ہے کہ اس تاثیر و تاثر کا بڑا مدار خود سننے والوں کی اپنی صلاحیت و استعداد پر ہوتا ہے، جن دلوں میں قبولیتِ حق کی صلاحیت ہوتی ہے وہ حق کسی کی زبان سے بھی سن کر قبول کر لیتے ہیں اور جو اس سے محروم ہوتے ہیں وہ اپنے وقت کے نبی کی زبانِ مبارک سے بھی سن کر اُسے ٹھکرا دیتے ہیں اسی بنا پر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی و تشفی دیتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ

(القصص:۵۶)

''بے شک تم ہدایت نہیں بخش سکتے جس کو چاہو، بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔''

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۙ۝۹ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۙ۝۱۰ وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۙ۝۱۱ (الاعلیٰ: ۹-۱۱)

''پس یاد دہانی کرو، اگر یہ یاد دہانی نفع دے جو خدا سے ڈرتا ہے وہ ضرور یاد دہانی حاصل کرے گا اور جو سخت بد بخت ہے وہ اس سے پرہیز کرے گا۔''

پھر اس ضمن میں یہ خاص بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ شہادت حق کے سلسلے میں انسان اس بات کا مکلّف نہیں ہے کہ اس کی باتیں لوگوں پر اثر انداز بھی ہوں، ورنہ اس کی شہادت عبث سمجھی جائے گی۔ اس کی ذمہ داری محض اتنی ہے کہ اس پہ حق بات کہنے کی جو ذمے داری ڈالی گئی ہے اس کو وہ ادا کرتا رہے اور نتائج کو خدا کے حوالے کر دے، چناں چہ بہت سے مفسرین کے نزدیک آیت لایضرک۔ الخ کی تفسیر یہی ہے کہ انسان اگر اپنی شہادت حق کی ذمے داری ادا کرتا ہے تو وہ خود راہ راست پر ہے اس لیے اس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا کہ دوسرے لوگ اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔

رہا دوسرا استدلال تو یہ پہلی غلطی سے بھی بڑی غلطی ہے کیوں کہ اس میں قرآن کی آیات کو بھی توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر شہادت حق کی ادائیگی کے لیے یہ بات بہ طور شرط کے ہو کہ خود مکمل طور سے فلاح یافتہ ہوئے بغیر یہ کام نہ کیا جائے تو اس کام کی انجام دہی کے لیے انسانوں کی بہ جائے فرشتے مامور کیے گئے ہوتے حالاں کہ اس کے مخاطب انسان ہی بنائے گئے ہیں۔ کوئی خود فریب انسان ہی ہوسکتا ہے جو موت سے پہلے تک اپنے کو اصلاح یافتہ سمجھ سکے ورنہ ہوتا یہ ہے کہ نفس جتنا زیادہ اصلاح یافتہ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا زیادہ احساس ستانے لگتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو گویا اس نے اپنی اصلاح نفس کا پہلا زینہ بھی طے نہیں کیا ہے۔ یہ کوئی نہیں جان سکتا کہ اللہ کے یہاں اس کی کوششیں مقبول ہوئی ہیں یا مردود، اس لیے اللہ کے بتائے بغیر اپنے کو مزکی سمجھ لینا، انتہائی سفاہت وخود فریبی ہے یا اللہ کی جناب میں بہت بڑی گستاخی، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے طبقہ کو جو اپنی پاکیزگیِ نفس کے پُر فریب پندار میں مبتلا تھا مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝۳۲ (النجم:۳۲)

''اپنے آپ کو پاکیزہ نفس نہ ٹھیراؤ وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ اگر ہمارے سلف نے کسی کو کوئی ایسی بات کہتے سنی جس میں اس خام خیالی کا کوئی شائبہ بھی پایا جاتا ہو تو انھوں نے برملا اس کی تردید فرمائی۔ حضرت حسنؒ نے مطرف بن عبداللہ کی زبان سے یہ جملہ سنا کہ

لا اقول مالا افعل

''میں ایسی بات نہیں کہتا جس پر خود عامل نہ ہوں۔''

تو انھوں نے ان کو ٹوکتے ہوئے فرمایا:

و اینا یفعل ما یقول و الشیطان لو ظفر بھذہ منکم فلا یامر احد بمعروف و لا ینھیٰ عن منکر۔ (کشاف جلد اوّل ص:۲۲۵)

''ہم میں کون ہے جو وہی کرتا ہو جو وہ کہتا ہے۔ شیطان کی بڑی کام یابی یہی ہے کہ وہ تمھیں اس (خام خیالی) میں مبتلا کر دے تا کہ کوئی شخص نہ کسی معروف کا حکم دے سکے اور نہ کسی منکر سے روک سکے۔''

بلکہ لوگوں نے تو یہاں تک صراحت کی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی منکر میں مبتلا ہو تو بھی وہ اس منکر سے دوسروں کو باز رکھنے کی تلقین کر سکتا ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسروں کو روکتے ہوئے اپنی پاک دامنی کا نہ اظہار کرے، نہ اس کا کوئی تصور دل میں ہو، بلکہ

من نہ کردم شما حذر بکنید

پر اس کا عمل ہو۔ علّامہ زمخشر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

فان قلت ھل یجب علٰی مرتکب المنکران ینھی عما یرتکبہ۔ قلت نعم یجب علیہ لان ترک ارتکابہ وانکارہ واجبان علیہ فترکہ احدالواجبین لا یسقط عنہ الواجب الآخروعن السلف مروا بالخیروان لم تفعلوا۔ (حوالہ سابق)

''اگر تم سوال کرو کہ جو شخص منکر میں خود مبتلا ہو کیا اس پر اس منکر سے دوسروں کو منع کرنا

واجب ہے؟ تو اس کا جواب ہے کہ ہاں ایسا کرنا اس پر واجب ہے۔ کیوں کہ اس منکر سے باز رہنا اور دوسروں کو اس سے روکنا دونوں اس پر واجب ہیں اس لیے اگر وہ ایک واجب کو چھوڑ رہا ہے تو اس سے دوسرا واجب اس سے ساقط نہیں ہوسکتا۔ سلف کا قول ہے کہ نیکی کا حکم دو اگر چہ تم خود اس کے عامل نہ ہو۔''

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے شیطان کی جس تمنا کا تذکرہ فرمایا تھا آج اس میں وہ بڑی حد تک کام یاب ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو اصلاح نفس اور کامل بننے کے فکر و اہتمام میں اس فریضہ کو بھلا ہے بیٹھے ہیں۔ وہ زندگی بھر نفس کی صیقل گری میں لگے رہتے ہیں اور اس سے کام لینے کی نوبت آنے ہی نہیں دیتے حالاں کہ خود نفس کی اصلاح کا بھی بہت بڑا ذریعہ یہی ہے کہ آدمی حق کی شہادت کے لیے آمادہ ہو اور اس راہ میں جو مشقتیں اور زحمتیں پیش آتی ہیں ان کو رضاء الٰہی کے لیے برداشت کرے، اول تو آدمی اگر بالکل ہی بے غیرت و بے حمیت نہ ہو تو دوسروں پر نکتہ چینی کر کے خود اس کا نفس اسے چین نہیں لینے دے گا تا آں کہ وہ خود اپنے کو ان عیوب سے پاک نہ کرلے جن پر وہ دوسروں کے سلسلہ میں نکتہ چینی کرتا ہے، برائی کے برائی ہونے یا تبلیغ امر کی ذمے داری کے احساس کے بغیر وہ یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔ اور یہی احساس اصلاح نفس کا پہلا زینہ ہے اور اگر اس کا نفس اس بارے میں کچھ ڈھیل بھی دکھائے گا تو لوگوں کی زبان طعن اسے مجبور کردے گی کہ یا تو وہ اس کام کی ہمت نہ کرے یا کرے تو خود اپنے کو بھی ان عیوب سے پاک کرے۔

دوسرے اس راہ میں، جو مصائب جھیلنے پڑتے ہیں وہ دل میں گداز اور تعلق باللہ کی وہ کیفیتیں پیدا کردیتے ہیں جو محض اذکار اور اصلاح نفس کے ٹھنڈے طریقوں سے پیدا نہیں ہوسکتیں، اسی بنا پر اس کام کی اہمیت شریعت میں دوسرے نیکی کے کاموں سے زیادہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر۔

''سب سے بلند مرتبہ جہاد وہ کلمۂ حق ہے جو کسی ظالم بادشاہ کے سامنے کہا جائے۔''

اور اسی بنا پر خود صوفیائے کرام نے جن کو اصلاح و تزکیہ کے باب میں اسوہ بتایا جاتا

ہے، اس کام کو دوسرے تمام کاموں پر ترجیح دی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:

بزرگ تریں خیرات، سعی در ترویج شریعت است واحیاء حکمے از احکام آں علی الخصوص در زمانیکہ شعائر اسلام منہدم شدہ باشند، کروڑ ہا درراہ خدائے عزوجل خرچ کردن برابر آں نیست کہ مسئلہ از مسائل شرعیہ را رواج دادن چہ دریں فعل اقتدا بانبیا است کہ بزرگ تریں مخلوقات اند علیہم الصلوٰۃ والسلام ومشارکت است باآں اکابر ومقرر است کہ کامل ترین حسنات باایساں مسلم فرمودہ اند وخرچ کردن کروڑ ہا غیر آں اکابر را نیز میسر است۔

''سب سے بڑی نیکی، شریعت کی ترویج اور اس کے کسی حکم کو زندہ کرنے کی کوشش ہے خاص طور سے ایسے زمانہ میں کہ اسلام کے شعائر منہدم ہوگئے ہوں۔ اللہ کی راہ میں کروڑوں روپیہ صرف کرنا اس نیکی کے برابر نہیں ہوسکتا کہ کسی مسئلہ شرعی کو رواج دیا جائے کیوں کہ ایسا کرنا انبیاء علیہم السلام کی مخصوص پیروی کرنا ہے جو مخلوق میں سب سے بزرگ ہیں اور یہ ان کے ساتھ مشارکت ہے اور یہ مسلم بات ہے کہ کامل ترین نیکیاں انہی حضرات کے حصے میں آئی ہیں اور کروڑوں روپیہ صرف کرنا تو دوسروں کے لیے بھی ممکن ہے۔''

ایک اور مکتوب میں حضرت خواجہ احرارؒ کا مقولہ نقل فرماتے ہیں:

اگر من شیخی کنم ہیچ شیخ درعالم مرید نیابد اتا مرا کار دیگر فرمودہ اند وآں ترویج شریعت وتائید ملت است۔

''اگر میں پیری مریدی کروں تو کسی شیخ کو دنیا میں کوئی مرید نہ ملے لیکن مجھے ایک دوسرے ہی کام کا حکم ملا ہے اور وہ ہے شریعت کو رواج دینا اور ملت کی تائید کرنا۔''

ایک مکتوب میں حضرت مجدد نے اس سوال سے بحث کی ہے کہ ایک شخص ذکر الٰہی میں مصروف ہے اسی اثناء میں ایک نابینا شخص سامنے آتا ہے جس کے آگے کنواں ہے اور جس میں وہ

گراہی چاہتا ہے، ایسی صورت میں ذکر بہتر ہے یا اس نابینا کو کنوئیں میں گرنے سے بچانا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

شک نیست کہ تخلیص نابینا بہتر است از ذکر گفتن او وجہ اوتعالیٰ غنی است از وواز ذکراو ونابینا بندہ است محتاج کہ دفع ضرر از وے ضرور است علی الخصوص کہ بہ این تخلیص مامور شود ایں زماں تخلیص اوذکرست کہ امتثال امراست ذکر اداء ایک حق ست کہ حق مولی باشد جل شا دور تخلیص کہ بہ امر واقع شود ادائے دوحق است حق عبدوحق مولی تعالیٰ بلکہ نزدیک است کہ ذکر گفتن دراں درآں وقت داخل ذنب نمودہ آید۔

''اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس نابینا کو بچانا ذکر کرنے سے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ اس سے اور اس کے ذکر سے بے نیاز ہے، اور نابینا ایک محتاج بندہ ہے جس سے ضرر کو رفع کرنا ضروری ہے بالخصوص جب کہ اس کو بچانے کا حکم بھی ہے ایسی حالت میں اس کو بچانا بھی ذکر ہی ہے کہ یہ اللہ کے حکم کی تعمیل ہے۔ ذکر تو ایک ہی حق یعنی مولیٰ کا حق ہے لیکن اس کو بچانا جب کہ وہ اسی کے حکم سے ہو رہا ہے دوحق کو ادا کرنا ہے، بندے کا حق اور اللہ تعالیٰ کا حق بلکہ کچھ بعید نہیں کہ ایسے وقت میں ذکر کرنا گناہ میں داخل ہو جائے۔''

خود اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

مدت ہا از علوم ومعارف واز احوال ومقامات دررنگ ابر نیساں ریختند وکارے کہ باید کرو لعنایت اللہ سبحانہ کردند الحال آرزوئے نمائندہ است الاحیاء سننے از سنن مصطفویہ علی صاحبا الصلوات والتسلیمات، نمودہ آید واحوال ومواجید مرارباب ذوق را سلم باشند؟

(مکتوب چہل وہشتم نمبر ۲۸ شیخ فرید)

''مدتوں علوم ومعارف اور احوال ومقامات ابر نیساں کی طرح برسے، اور جو کچھ کرنا تھا اللہ کی عنایت سے میرے حق میں انجام دیا گیا اب اس کے سوا کوئی آرزو باقی نہیں

رہی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے کسی سنت کا احیاء عمل میں آئے اور احوال ومواجید ارباب ذوق کو مبارک ہوں۔''

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ان ارشادات سے یہ بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ شہادت حق اور تبلیغ دین کا کام کتنا اہم اور مبارک کام ہے اور اس سے اس بات کا بھی پتا چل سکتا ہے کہ اس زمانے کے ارباب تصوف ''احوال ومواجید'' کے پیچھے پڑ کر اس کام سے جو غفلت برت رہے ہیں بلکہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں وہ کتنی سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مشہور حدیث کا بھی یہاں حوالہ دیا جائے۔ آپؐ نے فرمایا:

اوحی اللّٰہ الیٰ جبرئیل علیہ السلام ان اقلب مدینۃ کذاباھلھا فقال یارب ان فیھم عبدک فلان لم بصک طرفۃ عین قال، اقلبھا علیہ وعلیھم فان وجھہ لم یتمعرنی ساعۃ قط۔

''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کے پاس وحی بھیجی کہ فلاں شہر کو اس کے رہنے والے والوں کے ساتھ اُلٹ دو۔ انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے رب ان میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے تیری ایک لمحہ بھی نافرمانی نہیں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں! اس کے اور دوسرے بستی والوں کے سب کے سمیت الٹ دو کیوں کہ اس کے چہرے پر کبھی میرے لیے کوئی شکن نمودار نہیں ہوئی۔''

آیات کا صحیح مفہوم

اوپر کی تفصیل سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ اصلاح نفس کے نام پر شہادتِ حق سے غفلت برتنا کتنی بڑی غلطی ہے۔ اب اختصار کے ساتھ ان آیات کا بھی مطلب سمجھ لیا جائے جن کو لوگ اس بارے میں استعمال کرتے ہیں۔

(ا) پہلی آیت کا یہ مطلب محض خودساختہ ہے کہ انسان صرف اپنی اصلاح وتقویٰ کی فکر کرے اور دوسروں کی اصلاح کا خیال چھوڑ دے، یا اس کو مؤخر کر دے۔ اس مفہوم کی تردید

کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشہور حدیث یہاں نقل کردینی کافی ہے۔

یا ایھاالناس انکم تقرؤن ھذہ الایة یا ایّھا الذین اٰمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا ھتدیتم فانی سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول ان الناس اذارؤا منکرا فلم لغیروہ یوشک ان یعمھم اللّٰہ بعقابہ (بن ماجہ)

''لوگو! تم لوگ یہ آیت پڑھتے ہویا ایھا الذین آمنوا علیکم انفسکم الخ (اور اس کا غلط مطلب لیتے ہو) کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لوگ اگر کسی منکر کو دیکھیں اور اس کو دور نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کردے۔''

تعجب ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس صریح تردید کے بعد بھی لوگ اس کا مطلب وہی سمجھتے ہیں جس کی انھوں نے نفی فرمائی تھی، حالاں کہ ایسا سمجھنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ تمام ارشادات اور قرآن مجید کے وہ تمام احکام کالعدم ہوجاتے ہیں جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے سلسلے میں وارد ہوئے ہیں اور یہ کھلا ہوا تضاد ہے جس کی طرف صدیق اکبرؓ نے اشارہ فرمایا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس آیت کا اس مفہوم سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ اس آیت کا مطلب جیسا کہ سیاق کلام سے واضح ہے محض اتنا ہے کہ ''اگر لوگ باپ دادا کی اندھی تقلید میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تمھاری نصیحت وفہمائش سے متاثر نہیں ہوتے ہیں تو ان کی اس حالت پر غمگین نہ ہو، اگر تم خود گم راہی میں مبتلا نہ ہو تو دوسروں کی گم راہی سے تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس مفہوم کی آیتیں قرآن مجید میں متعدد ہیں۔ مثلاً:

وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ لٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾ (الانعام:۶۹)

''اور جو تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہیں ان پر ان (منکرین) کے حساب کی کوئی ذمے داری نہیں البتہ یہ ذمے داری ہے کہ یاد دہانی کرتے رہیں شاید وہ تقویٰ اختیار کریں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کومہر آمیز انداز عتاب میں خطاب فرمایا گیا ہے:

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ (طٰہٰ:۲،۳)

''ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ رنج و مشقت میں مبتلا ہوجائیں۔ یہ توان کے لیے یاددہانی ہے جوڈریں۔''

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (الشعراء:۳)

''شاید آپ اپنے آپ کوغم کے مارے ہلاک کردیں گے اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے۔''

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (فاطر:۸)

''آپ ان پر حسرتیں کر کے اپنے آپ کو پریشان نہ کیجیے۔''

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۝ (الغاشیہ:۲۲)

''آپ صرف یاددہانی کرنے والے ہیں ان پر داروغہ نہیں ہیں۔''

غور کیجیے کہاں یہ مفہوم اور کہاں وہ مفہوم، جوزبردستی اس آیت سے نکالا جارہا ہے۔ دونوں میں کیا نسبت ہے؟

اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ متعدد علماء کے نزدیک ''**علیکم انفسکم**'' سے اپنی ذات مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مسلمانوں کی جماعت مراد ہے۔جس کے معنی یہ ہیں کہ اس آیت کا جومفہوم قرار دیا جارہا ہے اس کے بالکل برعکس اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح وتربیت واجب ہے، چناں چہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا قول ہے کہ یہ آیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے واجب ہونے کے بارے میں سب سے زبردست آیت ہے۔لیکن اگر کوئی ''**انفسکم**'' سے یہ مراد نہ بھی لے تو بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''**اذا اهتديتم** کی جوشرط یہاں بیان کی گئی ہے کیا اس کے مفہوم سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خارج ہے؟ اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ نعوذ باللہ، اللہ اور اس کے رسول کے اقوال باہم متعارض ہیں کہ ایک طرف امر بالمعروف کی اتنی تاکید ہے کہ اس کے ادا نہ کرنے پر شدید ترین وعیدیں بیان کی گئی ہیں اور دوسری طرف پھر خود ہی اس کا بوجھ اٹھالیا گیا ہے، اور بس اپنی اصلاح میں لگ جانے کو کافی قرار دے دیا گیا ہے۔

اس بات کو بھی جانے دیجیے یہ دیکھیے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی کیا توضیح فرمائی ہے۔ حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

اماواللّٰہ لقد سألت عنھا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال بل امروا بالمعروف و تناھواعن المنکر حتیٰ اذارائیت شقامطاعًا وھوی متبعًا و دنیا موثرۃ واعجاب کل ذی رای برایہ ورائیت امرالا بدالک منہ فعلیک نفسک و رع امرالعوام فان وراء لم ایاما الصبرفیھن کقبض علی الجمر للعامل فیھن اجر خمسین رجلا یعملون مثل عملہ (ترمذی،ابن ماجہ)

''خدا کی قسم میں نے اس آیت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا نہیں، ایک دوسرے کو نیکی کا حکم دو اور منکر سے روکو یہاں تک کہ جب تم دیکھو کہ حرص کی پیروی ہو رہی ہے۔ ہوا و ہوس کا اتباع ہو رہا ہے، دنیا کو (آخرت پر) ترجیح دی جا چکی ہے اور ہر رائے والا خود رائی میں مست ہے اور حالات ایسے دیکھو جن کا تمھارے پاس کوئی چارہ کار نہ ہو تو اپنے آپ کی فکر کرو اور عوام کے معاملہ کو چھوڑ دو کیوں تمھارے بعد ایسے دن آنے والے ہیں۔ جن میں صبر و استقامت کی بہت ضرورت ہوگی۔ ان میں صبر کرنا ایسا ہے جیسے انگاروں کو مٹھی میں تھامنا ایسے دنوں میں عمل کرنے والوں کو پچاس آدمیوں کا اجر ملے گا جو اس جیسا عمل کریں۔''

اس حدیث سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آپ کے نزدیک آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ امر بالمعروف کا فریضہ ترک اور نظر انداز کر دیا جائے۔ البتہ جب حالات اتنے ابتر ہو جائیں کہ اس سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کی توقع نہ ہو تو اس وقت اس کی گنجائش ہے کہ آدمی دوسروں کی فہمائش اور اصلاح کا کام چھوڑ کر خود اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی متعین زمانہ ہے جس میں امت پر سے فریضہ امر بالمعروف ساقط ہو جائے گا ایسا سمجھنا ان بہت سی احادیث کی تردید کرنا ہے جن سے قیامت

تک کے لیے اس کا وجوب ثابت ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ وقت ہے جب کوئی شخص خود اپنے تجربہ سے اس فیصلے پر پہنچ سکے کہ حدیث مذکورہ بالا میں جو علامتیں، وجوب شہادت کے سقوط کے لیے بیان کی گئی ہیں، ظاہر ہوگئی ہیں۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ کسی خاص مقام پر اگر ہمیں یہ علامتیں دکھائی دینے لگیں تو ہم یہ اپنے طور سے فرض کرلیں کہ تمام دنیا کا حال یہی ہے اور کسی خاص مقام کے بارے میں یہ فیصلہ کرنے کے لیے بھی صرف ہمارا گھر میں بیٹھ کر کوئی فیصلہ کرلینا بھی ٹھیک نہیں ہے، اس کے لیے تجربہ شرط ہے جو کچھ کرنے کے بعد ہی حاصل ہوسکتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مثلاً ہندستان میں ہر جگہ اور ہر مقام پر اور ہر شخص کے لیے یہی حالات طاری ہوچکے ہیں۔ لیکن لوگوں کا حال عجیب ہے وہ اس حدیث کے صرف آخری ٹکڑے کو مفید مطلب سمجھ کر نگاہ میں رکھتے ہیں اور اس کا پہلا جز، بالکل نظر انداز کردیتے ہیں جس میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام اس وقت تک جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک یہ حالات ہر شخص کے تجربہ میں نہ آجائیں۔ اور اس بات کی طرف تو بہت کم لوگوں کا دھیان جاتا ہے کہ اس طرح کے مشکل حالات میں بھی کچھ کام کیا جائے تاکہ حدیث کے بہ موجب وہ اجر و ثواب حاصل ہوسکے جو ان سے مختلف حالات میں کام کرنے کے مقابلے میں پچاس گنا زیادہ ہوگا۔ رہی **معذرۃً الیٰ ربکم** اور **لعلّھم یتقون** کی تڑپ تو وہ تو گویا مفقود ہی ہے۔[1]

اسی طرح دوسری دو مذکورہ آیتوں کا مطلب بھی غلط سمجھا جاتا ہے۔ **لم تقولون مالا تفعلون** کا منشا یہ نہیں ہے کہ پہلے خود پختہ بن لو اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کا کام شروع کرو۔ اس آیت

---

(۱) یہ سورۂ الاعراف کی مشہور آیت

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ (الاعراف: ۱۶۴)

''اور جب کہ ان میں سے ایک جماعت نے کہا کہ ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جس کو یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا کم از کم سخت عذاب دینے والا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمارا عذر واضح ہوجائے اور ممکن ہے کہ وہ تقویٰ کی راہ اختیار کرلیں۔''

کی طرف اشارہ ہے۔

کے سیاق وسباق پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا ہے کہ کرنا کچھ نہ ہو لیکن باتیں لمبی چوڑی کی جائیں چناں چہ اس کے بعد ہی ارشاد ہوا ہے:

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (الصف: ۳)

"اللہ کو یہ انتہائی مبغوض ہے کہ تم ایسی باتیں کہو جن کو کرو نہیں۔"

اور اس کے بعد کے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاص طور سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو زبان سے تو جہاد وقتال کے لیے بڑے شوق اور جوش وخروش کا اظہار کر رہے تھے لیکن عملاً اس کے لیے کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

یہی حال آیت اتأمرون النّاسَ بالبّر الخ کا بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص خود کسی غلطی میں مبتلا ہو تو اسے امر بالمعروف نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی غلطی کی اصلاح بہ ہر حال واجب ہے لیکن جیسا کہ گزر چکا ہے اس کے ترک سے یہ لازم نہیں آتا کہ پھر وہ دوسرا گناہ بھی یعنی ترک امر اوڑھ لے۔[1] بلکہ اس میں اس بات پر زور دیا ہے کہ دوسروں کو "بر" کا حکم دیتے ہو تو خود بھی اس کو اختیار کرو۔ یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ دوسروں کو تو اچھی حالت پر دیکھنا چاہتے ہو اور اپنی حالت کی کوئی پروا نہیں ہے۔ غور کیجیے اس مفہوم کے ساتھ اس آیت سے وہ استدلال کس طرح کیا جاسکتا ہے جو اوپر مذکور ہوا ہے۔

ان باتوں سے اندازہ کیجیے کہ شہادت حق اور امر بالمعروف کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے جو حیلے تراش لیے گئے ہیں ان میں کتنا وزن ہے۔

---

(۱) اس ضمن میں جو بحث اوپر گزر چکی ہے اس کے ذیل میں یہ حدیث بھی پیش نظر رکھنی چاہیے:

عن انس قال قلنا یارسول اللّٰه لانامربالمعروف حتیٰ نعمل به کلّه ولا ننهی عن المنکر حتی نجتنبه کلّه فقال ﷺ بل مروا بالمعروف وان لم تعملوابه کله وانهوا عن المنکر وان لم تجتنبوا کلهٗ۔ (رواہ الطبرانی فی الصغیر الاوسط)

شہادتِ حق کی حقیقت

شہادت حق کے سلسلے میں جو مباحث اوپر گزر چکے ہیں وہ شہادت کی حقیقت سمجھنے کے لیے ایک حد تک کافی ہیں لیکن چوں کہ بد قسمتی سے ایک عرصہ دراز سے یہ لفظ زیادہ غلط مواقع پر استعمال ہورہا ہے اور اس کے یہی غلط استعمالات عام لوگوں کے قلب و ذہن میں راسخ ہوگئے ہیں۔ یہاں تک کہ بہتوں کے نزدیک ان سے ہٹ کر اس لفظ کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یہاں اختصار کے ساتھ اس کی اصل حقیقت کی طرف کچھ سرسری اشارات کردیے جائیں۔

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر یا شہادت حق کی جو ذمے داری امت مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے، یہ درحقیقت انبیاء کرام کی نیابت کا ایک منصب ہے جس کا مقصود اصلی یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد بھی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی اصل غرض:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (النسآء:۱۶۵)

”اور ہم نے بھیجے اپنے رسول خوش خبری دیتے ہوئے اور ہوشیار کرتے ہوئے تاکہ لوگوں کے پاس ان رسولوں کے بعد اللہ کے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔“

قیامت تک پوری ہوتی رہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ:۱۴۳)

’’اور اسی طرح ہم نے بنایا تم کو وسط شاہ راہ پر قائم رہنے والی امت تا کہ تم لوگوں پر (اللہ کے دین کی) گواہی دو اور رسول تم پر دین کی گواہی دے۔‘‘

اس بات کو ذہن میں رکھ کر غور کریں تو بہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اس لفظ کی اصل حقیقت سمجھنے کا صحیح ذریعہ صرف یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ انبیاء کرام دنیا میں کس مقصد کے لیے بھیجے گئے تھے اور انھوں نے کن طریقوں سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن چوں کہ تبلیغ و شہادت کے مروجہ طریقوں کو عام قلوب و اذہان پر غیر معمولی تسلط حاصل ہے اور انہی طریقوں کو عام طور سے انبیاء کرام کا طریقۂ دعوت سمجھا جاتا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ہم ان طریقوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرلیں کہ انبیاء کرام کے کام اور ان کے طریقوں کے بارے میں جو مجمل معلومات ہر مسلمان کو حاصل ہیں کیا ان کے مطابق یہ مروجہ طریقے ان کے طریقوں سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہم بہ راہ راست طور سے یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ انبیاء کرام کی اصل دعوت اور ان کے اختیار کردہ طریقے دراصل کیا تھے۔

۱۔ تقسیم سے پہلے یہاں شہادت حق کا سب سے زیادہ رائج و مقبول طریقہ یہ رہا ہے ——— جواب حالات زمانہ کی تبدیلی کے بعد عملاً برقرار تو نہیں رہ سکا ہے لیکن تبلیغ و شہادت کا نام لینے سے اس کا جو تصور سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے وہ یہی ہے ——— کہ تبلیغ و اشاعت اسلام کے نام سے کچھ انجمنیں قائم کی جائیں، ان کے تحت کچھ تنخواہ دار مبلغ مقرر کیے جائیں جن کی سب سے بڑی بلکہ واحد صفت یہ ہو کہ وہ بحث و گفتگو میں کسی سے بند نہ ہوں اور پھر ان کا کام یہ ہو کہ دوسرے مذاہب کے مناظرہ بازوں سے دن رات مناظرہ بازی کرتے پھریں اور اپنی حجت و استدلال سے یا بوقت ضرورت اپنی زبان درازی، چرب زبانی یا دھنگا مشتی سے ان پر فتح و غلبہ حاصل کریں اور اس طرح دنیا میں اسلام کا نام روشن اور اس کا بول بالا کریں۔

ہم سر دست اس بات سے بحث نہیں کرنا چاہتے کہ اس طریقۂ تبلیغ کی کچھ افادیت ہے یا نہیں لیکن جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہمارے نزدیک اس طریقۂ تبلیغ کو انبیاء کرام کی تبلیغ کا طریقہ ٹھہرانا اُن کی توہین کرنے کے مترادف ہے۔

نبی یا ان کے ساتھی، تبلیغ کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں فرماتے تھے کہ کچھ لوگ تو اس طرح اس کام کے لیے الگ کر دیے جائیں اور بقیہ لوگ ان کے لیے بہ وقت ضرورت چندہ فراہم کر دیں اور خود بہ دستور اپنے دنیاوی کاروبار میں لگے رہیں خواہ وہ کاروبار اس دین کے خلاف ہی کیوں ہوں جس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وہ چندہ دے رہے ہوں۔ ان میں کا ہر ایک ہمہ وقتی مبلغ ہوتا تھا اور بہ قدر استطاعت اس میں حصہ لیتا تھا خواہ براہ راست ہو یا اس طریقہ سے کہ معاشی ضروریات کے تحت وہ جو کام کرتے تھے وہ اسی حقیقت کے گواہ ہوتے تھے جسے وہ زبانی پیش کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ کام بھی نہیں تھا کہ وہ بس بحث و مناظرہ کرتے پھریں۔ موجودہ طرز کے مناظروں کے تو وہ قریب بھی نہ جاتے تھے، اپنی باتیں انتہائی نرمی و دل جوئی کے ساتھ نہایت دل نشیں انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور باتوں سے زیادہ اپنے عمل کو اپنے پیغام کی صداقت کی دلیل بناتے تھے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٦﴾ (یونس:۱۶)

''یقیناً میں اس سے قبل تمھارے اندر ایک عرصہ سے رہ رہا ہوں، تو کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟''

اسی انداز میں کہا گیا ہے اور:

مَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ (ہود:۸۸)

''جس چیز سے میں تمھیں روک رہا ہوں میں خود اسے ہرگز کرنا نہیں چاہتا۔''

کے یہی معنی ہیں کہ میں جو کچھ کرتا ہوں وہ کوئی زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ وہ ایک صداقت ہے جس پر خود میرا عمل گواہ ہے۔ اور اگر کبھی بہ تقاضائے ضرورت کسی سے بحث و حجت کرتے بھی تھے تو وہ:

جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ ۭ (النحل:۱۲۵)

''ان سے بحث کرو اس طریقہ سے جو بہتر سے بہتر ہو۔''

کا مصداق ہوتی تھی اور وہ ایسے امور سے متعلق ہوتی تھی جن کا بہ راہِ راست ان کے حقیقی مقصد اور نصب العین سے تعلق ہو۔ خواہ مخواہ دور از کار مباحث پر وہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔

وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ (الفرقان:۷۲)

''جب وہ بے ہودگیوں کے پاس سے ہوکر گزرتے ہیں تو شرافت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔''

وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ (الاعراف:۱۹۹، ۲۰۰)

''اور جھگڑالولوگوں سے اعراض کرواور اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ اندازی ہو تو شیطان رجیم کے وساوس سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ چاہو، وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔''

جیسی ہدایات پرعمل پیرا تھے، اگر ان کوکوئی اس قسم کے دوراز کار مباحث میں الجھانا بھی چاہتا تو وہ اس سے اپنا پہلو صاف بچا کر نکل جاتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے دربار میں پہنچ کر اس کے سامنے اپنی دعوت حق پیش کی تو اس نے عام مفسرین کے بہ قول ان کو الجھانے کے لیے جھٹ سوال کر دیا:

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾ (طٰہٰ:۵۱)

''پہلے کے لوگوں کا کیا حال ہے؟''

لیکن وہ اس الجھاوے سے یہ کہہ کر صاف کترا گئے:

عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَ لَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ [1] (طٰہٰ:۵۲)

''ان کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتہ میں ہے۔ میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔''

---

(۱) یہ بات آیت کی عام تاویل کے بہ موجب کہی گئی ہے اور اگر اس کا مدعا یہ قرار دیا جائے کہ فرعون نے فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى کہہ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر اس پہلو سے معارضہ کرنا چاہا کہ اگر یہ حق ہے تو کیا پچھلے تمام لوگ گم راہ تھے جیسا کہ اس قسم کے مواقع پر اہل باطل ہمیشہ کہا کرتے ہیں تو بھی اس آیت سے وہی ثابت ہوتا ہے جو یہاں مقصود ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بحث میں پڑنے سے قصداً احتراز فرمایا جیسا کہ اہل حق کا خاصہ ہے ان کے معاملے کو خدا کے حوالے کر کے ایک فضول بحث سے پچھا چھڑا لیا واللہ اعلم۔

بلکہ بہت سے موقعوں پر وہ مخالفین کی لایعنی باتوں کا سرے سے کوئی جواب ہی نہ دیتے تھے جو ہمارے اصول مناظرہ کی رو سے ایک طرح اعتراف شکست کے ہم معنی ہے، انھیں یہ شکست پسند تھی لیکن وہ اس شکست کے روادار نہیں تھے کہ شیطان ان کا وقت دوراز کار باتوں میں ضائع کرائے یا مبلغ حق، حق کو دلوں میں اتارنے کی بہ جائے محض گفتگو کی فتح وشکست کو اپنی کامیابی سمجھ بیٹھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے دربار میں:

رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (البقرہ:۲۵۸)

''ہمارا رب وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے۔''

کا جو استدلال پیش فرمایا تھا، اس پر اس کا یہ معارضہ کہ:

اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ (البقرہ:۲۵۸)

''میں زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں۔''

کتنا احمقانہ تھا وہ اگر چاہتے تو اس پر سیکڑوں معارضے فرما سکتے تھے۔ لیکن اس کی اس بات پر انھوںؑ نے سرے سے کوئی معارضہ ہی نہیں فرمایا گویا عام اصول مناظرہ کی رو سے انھوں نے اس دلیل کے مقابلے میں اپنی شکست مان لی لیکن اس کے بعد اس کی سمجھ بوجھ کے مطابق ایک دوسری دلیل اس کے سامنے پیش کی جس کا اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ (البقرہ۲۵۸)

''اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو تو اسے مغرب سے نکال، تو کفر کرنے والا مبہوت ہو کر رہ گیا۔''

ان باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کیا ان کو اس طریق تبلیغ یا طریق شہادت سے کوئی نسبت ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے؟

۲- اسی سے ملتا جلتا دوسرا مفہوم تبلیغ وشہادت کا یہ ہے ــــ جو پہلے ہی طریقہ کی طرح اب تقسیم کے بعد عملاً تو متروک ہو چکا ہے لیکن اب بھی ذہنوں میں اس کا اچھا خاصہ اثر موجود ہے ــــ کہ کسی نہ کسی طرح غیر مسلموں کو کلمہ پڑھا کر مسلمان بنا لیا جائے تا کہ ہندستان میں

مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو اور اس سے ان کو کچھ سیاسی فائدے پہنچ سکیں۔

غور کیجیے کہ انبیاء کرام کے طریقہ عمل میں اس قسم کی تبلیغ کی کہاں تک گنجائش نکلتی ہے۔ جہاں تک کلمہ پڑھانے کا تعلق ہے بے شک انبیاء کرام کی دعوت بھی کلمہ ہی کی طرف ہوتی تھی لیکن کیا ان کا مدعا بس اتنا ہی تھا کہ وہ کسی طرح کلمہ پڑھ لیں خواہ اس کا کوئی اثر ان کی زندگی پر طاری ہو یا نہ ہو؟ اور کلمہ کی تلقین کا مآل ان کے نزدیک بس یہ تھا کہ ان کو کچھ ساتھی مل سکیں جو نعوذ باللہ ان کی دنیاوی ترقی وعروج کے لیے زینہ ثابت ہوں؟ کون ہے جو بہ ثبات عقل و ہوش ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات یا اس کے کسی معمولی جزو کا بھی تصور کر سکتا ہے؟ انبیاء کرام کے زمانوں میں کلمہ کسی قومی شعار کے طور پر مستعمل نہیں تھا، یہ ان کی بنیادی دعوت کا درحقیقت ایک جامع عنوان تھا جن میں ان کی پوری دعوت اپنی تفصیلات سمیت سمٹی ہوئی تھی اس لیے وہ اس کو پیش بھی اسی طور سے کرتے تھے اور قبول کرنے والے اسے قبول بھی یہی سمجھ کر کرتے تھے اسی لیے اس کو قبول کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ انھوں نے ایک قوم سے رشتہ منقطع کر کے دوسری قوم کے ساتھ جوڑ لیا ہے بلکہ یہ ہوتا تھا کہ ایک خاص طرح کی زندگی چھوڑ کر وہ ایک نئی زندگی میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور ان کو اب جداگانہ بنیادوں پر اپنی زندگی کی تعمیر کرنی ہے۔ اور یہ انقلاب کم و بیش اس کلمہ کے ساتھ ہی ان کے اندر طاری ہو جاتا تھا اس میں کچھ بھی دیر نہیں لگتی تھی۔ اس سے پہلے ہم کسی موقع پر فرعون کے جادوگروں کے انقلاب حال کا تذکرہ کر چکے ہیں، اس موقع پر اس کی یاد تازہ کر لیجیے انھوں نے جب تک کلمہ نہیں پڑھا تھا ان کا حال کیا تھا اور جونہی وہ رب ہارون و موسیٰ علیہما السلام پر ایمان لائے چشم زدن میں ان کا حال کیا سے کیا ہو گیا؟ فرعون کی انتہائی دھمکیوں کے بعد بھی ان کے پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ کیا یہ کیفیت اس کلمہ خوانی سے پیدا ہو سکتی ہے جو ہمارے طریق تبلیغ میں رائج ہے؟ یہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ کلمہ اپنی گہرائیوں سمیت قلب میں جگہ بنا لے اور یہ بات اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کلمہ پڑھنے اور پڑھانے والے اس کلمہ کی حقیقت کو سمجھیں اور سمجھانے کی فکر کریں اگر یہ نہیں ہے تو ہم اپنے دنیاوی مفاد کے لیے کلمہ خوانوں کے اضافہ سے کتنا ہی خوش کیوں نہ ہوں لیکن دینی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ انبیاء کرام کا مقصد اپنے اردگرد بھیڑ کا جمع کرنا

نہیں تھا وہ چند اصول زندگی لے کر آئے تھے اور انہی اصولوں پر وہ لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کی نگاہ میں وہی لوگ قدر وقعت کے مستحق ہوتے تھے جو سوچ سمجھ کر ان کی دعوت کو قبول کرتے تھے اور اسی کے لیے ان کی کوششیں وقف تھیں۔

اور یہ ان پر اتہام ہوگا کہ ہم اپنی تبلیغ حق کا جو مدعا سامنے رکھتے ہیں اس کے کسی معمولی شائبہ کا بھی ان کے بارے میں کوئی تصور کریں۔ وہ دنیا میں محض حق کا بول و بالا کرنے کے لیے آئے تھے، اسی کی طرف انھوں نے دعوت دی اور اسی کے لیے انھوں نے اپنی ساری کوششیں صرف کیں، وہ قومی یا ملکی جذبات سے بالکل بالاتر تھے، اسی بنا پر ان کی دعوت پر جہاں اپنے ہم ملکوں وہم قوموں نے لبیک کہا وہیں غیر ملک وغیر قوم کے لوگ بھی اس میں شریک ہوئے اور اس کی مخالفت میں جس طرح دوسروں نے حصہ لیا اپنے ہم قوم وہم ملک بھی اس میں پیش پیش رہے۔ یہ انبیاء کرام ہر موقع پر یہی اعلان کرتے تھے کہ

يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (ہود:۲۹)

''اے میری قوم کے لوگو! میں تم سے اس کام پر کوئی مال نہیں چاہتا، میرا بدلہ تو صرف اللہ ہی دے گا۔''

لیکن اگر ان کی دعوت کی بنیاد کسی قومی مفاد پر ہوتی تو نہ وہ اس اعلان کی جرأت کر سکتے تھے اور نہ ان کی بے لوثی و بے غرضی سب کے نزدیک مسلم ہو سکتی تھی۔

۳۔تبلیغ وشہادت کا تیسرا رائج الوقت اور مقبول مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں میں کلمہ اور نماز روزہ کی تلقین کی جائے اور یہی اس کی کل حقیقت ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ یا تو دین سے غیر متعلق باتیں ہیں جن میں پڑنا درحقیقت دین کو برباد کرنے کے مترادف ہے یا وہ مالا یطاع کی حد میں داخل ہیں اس لیے ان سے تعرض کی ضرورت نہیں ہے۔

تبلیغ وشہادت کا یہ طریقہ گزشتہ دو طریقوں کے مقابلے میں زیادہ دینی معلوم ہوتا ہے اور بہ ظاہر اس کو انبیاء کرام کے طریقۂ تبلیغ سے یک گونہ ظاہری مناسبت بھی ہے کیوں کہ انبیاء کرام کے طریقۂ عمل میں بھی کلمہ کی تبلیغ و تلقین کو ایک بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے جیسا کہ اس کی تشریح آگے آئے گی، نیز نماز روزہ اور عبادات کی تبلیغ بھی ان کی سرگرمیوں کا ایک نہایت اہم

جز تھی، لیکن اگر اس طریقہ اور انبیاء کرام کی دعوت اور اس کے طریقوں کی حقیقتوں پر غور کیا جائے تو ان میں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔

پہلا فرق تو یہ ہے کہ انبیاء کرام کا تخاطب کسی خاص گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں تھا اور نہ ان کی دعوت اپنی نوعیت کے لحاظ سے کسی خاص گروہ کے ساتھ مختص تھی، ان کا پیغام عمومی نوعیت رکھتا تھا اور اس پیغام کو وہ پوری وسعت و عموم کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرتے تھے، بالفاظ دیگر وہ انسانوں کو انسان ہونے کی حیثیت سے خطاب کرتے تھے نہ اس حیثیت سے کہ وہ فلاں گروہ سے متعلق ہیں یا نہیں ہیں بلکہ بعض بعض مقامات پر تو ایسا نظر آتا ہے کہ جو لوگ ان کی دعوت کے مخالف و منکر تھے ان کی کوششیں ایسے لوگوں کی طرف زیادہ جھکی ہوئی ہیں یہاں تک کہ جب یہ جھکاؤ ایک خاص حد اعتدال سے آگے بڑھتا ہوا نظر آیا ہے تو اس پر وحی الٰہی نے ان کو تنبیہہ کی ہے تاکہ ان کی دعوت افراط وتفریط سے محفوظ رہ سکے، ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ جو لوگ ان کی ابتدائی دعوت پر لبیک کہتے تھے وہ اس بنا پر ان کی خصوصی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے کہ وہ مزید باتیں قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں لیکن اسی کے ساتھ عمومی خطاب کا کام بند نہیں ہوجاتا تھا وہ بہ ہر حال سامنے رہتا تھا بلکہ ان ...لوگوں کی تعلیم وتزکیہ میں بھی یہ بات بنیادی طور سے پیش نظر رہتی تھی کہ وہ دعوت وتبلیغ کے لیے تیار ہوکر اس عمومی کام میں حصہ لے سکیں، اس طور سے یہ خصوصی کام بھی ایک حیثیت سے عمومی دعوت وتبلیغ ہی کا ایک جز تھا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ انبیاء کرام جس کلمہ کی تلقین فرماتے تھے اس کا مقصود محض اتنا ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ بس اس کو زبان سے ٹھیک طور سے ادا کرنے لگیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس کلمہ کے جو نہایت سادہ اور سہل تقاضے ہیں ان کو سمجھ لیں اور ایک حد تک ان کو اپنی زندگی میں طاری کرنے لگیں بلکہ جیسا کہ آگے آئے گا، اس کلمہ کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہوتا تھا کہ انسان اپنی پوری زندگی اللہ واحد کی اطاعت کے تابع کردے اور اسی مفہوم کو وہ لوگوں کے دل ودماغ میں بٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔ چناں چہ اسی بنا پر اس کا قبول کرنا لوگوں پر شاق گزرتا تھا اور لوگ اس کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے تھے لیکن جو لوگ اس کو قبول کرلیتے تھے ان کے قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ان کی زندگی یک رنگ ہوکر اپنے جملہ شعبوں سمیت خدا کی تابع فرمان بن گئی، یہ نہیں تھا کہ وہ لا الٰہ الا اللہ بھی کہتے جائیں اور زندگی

کے کچھ گوشوں کو اطاعت الٰہی سے مستثنیٰ قرار دے کر انھیں اپنے نفس، شیطان یا اپنے ہی جیسے دوسروں انسانوں کے تابع فرمان کر دیں۔

اسی طرح وہ عبادات کی تلقین فرماتے تھے تو ان کا مدعا اس سے یہ نہیں ہوتا تھا کہ صرف ان عبادات کی ظاہری بجا آوری ہی مقصود کل ہے اور اس کے بعد وہ آزاد ہیں کہ جو چاہیں کرتے رہیں بلکہ یہ تھا کہ بنیادی کلمہ کی اساس پر افراد و معاشرہ کی جو تعمیرِ جدید وہ کرنا چاہتے تھے اس کے لیے یہ عبادات ستون کی حیثیت رکھتی ہیں اس لیے ان کو قائم کرنا ضروری ہے چناں چہ ان عبادات سے دین کو بہ حیثیت کل اختیار اور قائم کرنے کا جذبہ و رجحان پیدا ہوتا تھا نہ یہ کہ وہ ان کو کل سے الگ کر کے محض ان پر قانع ہو جائیں اور خود اپنی حد تک بھی وہ اپنی زندگی کے بہت سے شعبوں کو دین کے حیطۂ اقتدار سے باہر رکھیں۔

۴۔تبلیغ و شہادت کا ایک دین دارانہ مفہوم یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ فقہ، کلام کے جن مسائل کے ہم قائل و پابند ہیں، دوسرے لوگوں میں ان کی تبلیغ و اشاعت کریں۔ چناں چہ جو لوگ تبلیغ و شہادت کے اصلاً ذمے دار رہیں ان کی بہت بڑی تعداد اپنی اس ذمے داری کا حق اسی طرح ادا کر رہی ہے کہ وہ آمین، رفع یدین اور تقلید شخصی کے وجوب یا غیر وجوب جیسے مسائل پر بحث و مناظرہ کے میدان قائم کیے ہوئے ہے اور اس جوش و انہماک کے ساتھ اس میں حصہ لے رہی ہے گویا امت مسلمہ اور دنیا کی نجات کا دار و مدار یہی مسائل ہیں یا انبیاء کرام اسی طرح کے مسائل کے اثبات یا تردید کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے۔

یہ طریقۂ تبلیغ انبیاء کے طریقۂ تبلیغ کے کہاں تک مطابق ہے اس کے سمجھنے کے لیے صرف اتنی ہی بات جان لینی کافی ہے کہ انبیاء کرام کا مقام تو بہت اونچا ہے، ان کے یہاں اس طرح کے جزئی مسائل پر بحثوں کی کہاں گنجائش نکل سکتی تھی! اور وہ اگر ہمارے ان مبلغین کی طرح اسی طرح کے مسائل میں اپنا قیمتی وقت صرف کرتے، تو ان کو وہ کام یابیاں کس طرح حاصل ہو سکتی تھیں جو اصلاح و تعمیر کے سلسلے میں حاصل ہوئیں! ان سے گزر کر عام صلحاء یا مصلحین کے یہاں بھی اس طریقِ تبلیغ کا نام و نشان نہیں ملتا یہاں تک کہ ان لوگوں کے یہاں بھی جن کے ناموں پر یہ معرکے قائم کیے جاتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہنے کی جرأت کروں گا کہ جو لوگ اس

طرز تبلیغ کے عادی بن چکے ہیں ان کے اور ان کے نیاز مندوں کے ماسوا معمولی عقل اور سمجھ بوجھ رکھنے والے بھی ایسے کم مل سکتے ہیں جو اس طرز تبلیغ کو تبلیغ و شہادت کا درجہ دے سکیں کجا کہ اس کا رشتہ انبیاء کے طریقۂ تبلیغ کے ساتھ جوڑا جائے اور حقیقتاً یہ امت مسلمہ کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ یہ طرز تبلیغ اس میں اس درجہ رواج پذیر ہوگیا ہے کہ آج ہمارے بہت سے بہترین دماغ بھی جو ان سے الگ ہو کر امت کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتے تھے، اسی طرز تبلیغ میں اپنا وقت اور قوت صرف کر رہے ہیں۔ اصلی توجہ کی مستحق دین کی بنیادی باتیں ہیں نہ کہ اس کی جزئیات جس میں خود شریعت نے کافی وسعت رکھی ہے۔ ان کے سلسلے میں اختلاف رائے کی پوری گنجائش ہے اور ہر شخص کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ ان میں جس مسلک کو پسند کرے اپنے عمل کے لیے اپنائے بلکہ دوسروں میں ان کی تبلیغ بھی کرے لیکن ان مسائل کو کفر و اسلام کا مدار بنا کر ان پر معرکے قائم کرنا اور جو اصل مسائل ہیں ان کو سرے سے ترک و نظر انداز کر دینا، صرف یہی نہیں کہ دین یا تبلیغ دین نہیں ہے بلکہ یہ نہایت بے عقلی کی بات ہے جو کم از کم اس زمانہ میں جب کہ کفر و الحاد کا سیلاب اسلام کی بنیادی باتوں کو بہالینا چاہتا ہے، کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ بے شک انبیاء کرام نے بھی اپنی دعوت و تبلیغ میں جزئی امور و مسائل سے تعرض کیا ہے اور ان میں حق و ناحق کی نشان دہی فرمائی ہے لیکن ان کی توجہات کے اصل مرکز یہ مسائل نہیں تھے ان کی طرف انھوں نے توجہ فرمائی ہے تو کلی مسائل کے ضمن میں اور ان مسائل کی حسب حیثیت، نہ یہ کہ وہی مرکز توجہ ہوں اور انہی کا اثبات و تردید مشغلۂ حیات۔

۵- تبلیغ و شہادت کا ایک اور مفہوم یہ ہے کہ کچھ لوگ چھوٹی چھوٹی اخلاقی برائیوں کے خلاف کبھی کبھی زبان ہلا دیا کرتے ہیں اور اپنی جگہ پر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے وہ کام کر ڈالا جس کے لیے انبیاء کرام دنیا میں آئے تھے، یا جس کے مکلّف مسلمان بنائے گئے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ازالۂ منکر انبیاء کرام کا خصوصی کام رہا ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے سلسلے میں ہر چھوٹی بڑی کوشش اسی کام کا ایک جز سمجھی جائے گی اور یہ کوشش کرنے والے اس پر انشاء اللہ اجر و ثواب کے بھی مستحق قرار پائیں گے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا انبیاء کرام کا طریقۂ تبلیغ یہی رہا ہے کہ وہ عام برائیوں کو تو مٹانے کی کوشش کریں لیکن جو

ان کی اصل جڑ ہے اس کو باقی رکھیں یا خاکم بہ دہن اپنے حسب توفیق اس کو اپنے خون جگر سے سینچ کو مضبوط وتوانا بنانے کی کوشش کریں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہوگا تو اس طریقۂ تبلیغ کو بھی انبیاء کا طریقۂ تبلیغ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بلا شبہ انبیاء کرام نے بھی چھوٹی سے چھوٹی برائی کا پتا لگایا ہے اور اس کو مٹانے کی جدوجہد کی ہے، لیکن ان کا طریقہ موجودہ طریقہ کے برعکس یہ رہا ہے کہ پہلے جڑ کو کاٹو تا کہ اس کے ساتھ اس کی شاخیں بھی کٹ جائیں اور یہ اسی طریقۂ اصلاح کا نتیجہ ہے کہ ان کو اپنی کوششوں میں وہ کامیابیاں نصیب ہوئیں جن کا عشر عشیر بھی کسی بڑے سے بڑے مصلح کو نصیب نہیں ہوسکا۔ گاندھی جی کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ تشدد اور چھوت چھات کو مٹانے کے لیے انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ لیکن اس اثر ومقبولیت کے باوجود جو ان کو ملک میں حاصل رہا ہے، ان کو محض اس لیے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوسکی کہ انھوں نے نہ ان امراض کی جڑوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور نہ ان کے خلاف کوئی جدوجہد عمل میں لے آئے چناں چہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ تشدد کے خلاف ان کی وعظ وتلقین کتنے دلوں میں جاگزیں ہوسکی ہے اور جب بالآخر عدم تشدد کا یہ پجاری خود اپنے ایک ہم مذہب کے تشدد کا شکار ہوگیا تو ان کے وعظ وتلقین کی حیثیت تمام عالم پر آشکارا ہوکر رہی۔ اور ایسا ہی کچھ انجام گاندھی جی کی چھوت چھات کی تحریک کا بھی ہوا۔ اس کو جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی محض ظاہری وسطحی ہے اور زیادہ تر سیاسی مصالح کے طفیل میں ہے ورنہ یہ لعنت اپنی منحوس جڑوں کے ساتھ اب بھی دلوں میں قائم ہے۔ یہ مثال ایک نبی اور غیر نبی کے طریق تبلیغ کا فرق سمجھنے کے لیے کافی ہے لیکن اگر مزید مثال درکار ہو تو آپ امریکہ کی بندش شراب کو اپنے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ امریکہ نے اس تحریک کو چلانے کے لیے جو جو جتن کیے، ان کی تفصیلات یقیناً آپ کی نگاہ میں ہوں گی، لیکن اس کے باوجود اس تحریک کا جو انجام ہوا اس سے بھی آپ ناواقف نہیں ہوں گے، سب کچھ کرنے کے بعد بھی حکومت کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اس لیے اسے مجبوراً اس کی اباحت عام کا اعلان کرنا پڑا لیکن اس کے برعکس ہم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ تبلیغ میں دیکھتے ہیں کہ آپ نے امتناع شراب کی کوئی باقاعدہ مہم نہیں چلائی لیکن جس دن قرآن مجید نے شراب کے حرام ہونے کا اعلان کیا اس کی تعمیل اس طرح ہوئی کہ منہ سے

لگے ہوئے جام وساغر توڑ پھوڑ کر پھینک دیے گئے اور خم کی خم شراب اس طرح بہادی گئی کہ مدینہ کی گلیاں بہہ اٹھیں۔ اور یہی حال آپ کی دوسری اصلاحی اسکیموں کا ہوا۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ انبیاء کرام پہلے برائیوں کی جڑ کاٹتے ہیں جس سے اس کی شاخیں خود بہ خود کٹ جاتی ہیں اور دوسرے لوگ شاخوں پر تیشہ چلاتے ہیں اس لیے برائی بہ دستور موجود رہتی ہے اس کی ایک شاخ کٹتی ہے تو اس کی جگہ پر دوسری شاخیں سر نکالتی ہیں۔

تبلیغ وشہادت حق کے رائج الوقت کام اور طریقے یہی ہیں لیکن پچھلی تفصیل سے غالبًا یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ انبیاء کرام نے دنیا میں آ کر جو کام انجام دیے ہیں اور جس طرح انجام دیے ہیں، وہ چاہے ظاہری طور سے مذکورہ کاموں اور طریقوں سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے ہوں تو رکھتے ہوں لیکن جہاں تک ان کی روح وحقیقت کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے وہ ان رائج الوقت کاموں اور ان کے طریقوں سے یکسر مختلف ہیں۔ رہی یہ بات کہ بہت سے ستم ظریفوں کے نزدیک یہ بھی شہادت حق ہی کا کارنامہ ہے کہ باطل کی علم بردار پارٹیوں کا ساتھ دیا جائے یا ان کی باہمی کش مکش میں ان میں سے کسی ایک کی تائید وحمایت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا جائے۔ تو ہر چند یہ طریقہ اس زمانہ میں مختلف اسباب کے تحت ترقی پذیر ہے لیکن جو لوگ دین کا معمولی علم رکھتے ہیں وہ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ کو دین سے کوئی لگاؤ نہیں ہے چہ جائے کہ اس کو شہادت حق کا نام دیا جائے جو انبیاء کرام کی نیابت کا منصب ہے۔ انبیاء کرام کا مقام تو خیر بہت اونچا ہے، ان کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا میں وہ اسی لیے آئے تھے کہ باطل کے ساتھ سازگاری پیدا کریں اور اس کی تائید وتقویت میں کسی قسم کا حصہ لیں، انبیاء سے گزر کر ان کے عام نام لیواؤں کے بارے میں بھی اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اس قسم کے کاموں سے انھوں نے بھی ہمیشہ اجتناب کیا ہے اور کم از کم ان کی یہ جرأت نہیں ہوئی ہے کہ وہ اس قسم کا کوئی کام کریں اور اس کو شہادت حق کے نام سے موسوم کریں اور اگر کسی خرد باختہ نے اس کی جرأت کی بھی تو یا تو اس کو مجنون سمجھ کر اس سے درگزر کیا گیا یا اس کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو دین کے ساتھ مذاق کرنے والوں کے لیے خاص ہے۔ یہ محض اس زمانۂ جہل ودجل کا خاصہ ہے کہ اس قسم کے کام مسلمان کرتے ہیں اور پھر ڈھٹائی کے ساتھ اس کو شہادت حق کا نام دیتے ہیں۔

انبیاء کرام کا بنیادی کام

تبلیغ وشہادت کے اُن مروجہ کاموں اور ان کے ان طریقوں کے اس مختصر جائزہ کے بعد اگر آپ کو یہ اطمینان ہو گیا ہو کہ یہ حقیقی تبلیغ وشہادت نہیں ہیں اور نہ ان کو انبیاء کرام کے کاموں اور طریقوں سے کوئی خاص لگاؤ ہے تو اب یہ معلوم کرنے کی فکر کرنی چاہیے کہ پھر تبلیغ وشہادت کس چیز کا نام ہے۔

ہم اس سے پہلے یہ عرض کر چکے ہیں کہ چوں کہ شہادت حق درحقیقت انبیاء کرام کے منصب کی نمائندگی ہے اس لیے اس کی حقیقت اس طرح بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ہم انبیاء کرام کے حالات زندگی کو سامنے رکھ کر یہ دیکھیں کہ دنیا میں آ کر انھوں نے کیا کام انجام دیا اور کس طرح انجام دیا؟ آیئے ہم یہاں مثبت طور سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان کا کام اور طریقہ آخر کیا تھا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء کرام دنیا میں آئے تھے بدقسمتی سے ان کے حالات زندگی پوری تفصیل وضبط کے ساتھ ہمارے سامنے نہیں ہیں اس لیے فی الواقع اس سلسلے میں ہمیں اصلاً خاتم النبیینؐ ہی کے اسوۂ زندگی کو اپنا رہنما بنانا پڑے گا جن کی بے شمار خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ کے جملہ حالات زندگی دن کی روشنی کی طرح ہمارے سامنے موجود ہیں۔ تاہم چوں کہ قرآن مجید نے گزشتہ انبیاء کے حالات بھی مختلف مناسبتوں سے جابہ جا اجمال وتفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں اس لیے ان کی مدد سے ان کے بارے میں بھی یہ معلوم کرنا دشوار نہیں ہے کہ انھوں نے دنیا میں آ کر کیا کام کیا اور کس طرح کیا۔

انبیاء کرام کے طریق عمل کی بنیادی بات جو قرآن سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی ظاہری تبدیلی کے لیے کوشش کرنے کی بہ جائے سب سے پہلے فکری اصلاح و تربیت کی کوشش فرمائی ہے اور ان کی یہ بات نہایت حکمتِ عملی پر مبنی ہے۔ انسان کے اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے، تمام تر اس کے بنیادی افکار وتصورات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اس لیے کسی انفرادی یا اجتماعی تبدیلی واصلاح کے لیے افراد ومعاشرہ کے بنیادی افکار وتصورات میں تبدیلی

پیدا کرنا ضروری ہے۔ انبیاء کرام نے اصلاح و تعمیر کے اسی طریقہ کو اختیار فرمایا ہے اسی بنا پر ان کو وہ شان دار کام یابیاں حاصل ہوئی ہیں جن سے ہر شخص آگاہ ہے اور اسی کو ترک کر دینے کا نتیجہ ہے کہ بہت سے بڑے بڑے مصلحین جو انبیاء کرام کے اس طریقۂ اصلاح سے واقف نہیں تھے، وہ زندگی بھر بعض معمولی معمولی اصلاحی کاموں میں اپنا وقت اور قوت صرف کرتے رہے لیکن ان کو اپنے مقصد میں کوئی کام یابی حاصل نہیں ہوسکی جیسا کہ اس سے پہلے گاندھی جی کی مثال میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کا مصلحِ اعظم ہونا، غیر مسلمین تک کو بھی تسلیم ہے، اسی بنا پر ارشاد فرمایا ہے:

الاان فی الجسد المضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الاوھی القلب۔

''جان لو کہ بدن میں ایک لوتھڑا ایسا ہے کہ جب وہ ٹھیک ہو جائے تو بدن ٹھیک ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے۔ جان لو کہ یہ دل ہے۔''

بہر حال انبیاء کرام کی دعوت و تبلیغ کا بنیادی طریقہ یہی ہے کہ وہ قلب و ذہن کی تطہیر و تزکیہ کے ذریعے شخصی و اجتماعی زندگی میں انقلاب لاتے ہیں۔

اب آگے بڑھ کر ہمیں یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کیا افکار و تصورات ہیں جن کے ذریعے انبیاء کرام نے انقلاب حال کی کوشش کی اور اس میں ان کو کام یابیاں حاصل ہوئیں۔

جب اس سوال پر آپ غور کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ انبیاء کرام کی خصوصیت دوسرے مصلحین کے مقابلے میں یہاں بھی نمایاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی مصلح جو مصلح کہا جانے کا مستحق ہو، ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ افکار و تصورات کی کوئی بنیاد فراہم کیے بغیر کسی اصلاح کا بیڑا اٹھائے، افکار و اعمال ایک دوسرے کے ساتھ اتنا گہرا اور ساتھ ہی اتنا واضح تعلق رکھتے ہیں کہ کوئی شخص اس کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتا، لامحالہ ہر مصلح ان کے باہمی تعلق کو ملحوظ رکھتا ہے اور اس کے مطابق اپنی اصلاحی کوششوں کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے لیکن ان میں اور انبیاء کرام میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کرام ان بنیادی افکار و تصورات کو اہمیت دیتے ہیں اور ان ہی کو اپنے اصلاحی عزائم کی اساس بناتے ہیں جو فی الواقع ثابت شدہ حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں، جو فطرت انسانی

اور نظام کائنات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور جو بہ حیثیت مجموعی پورے عالم کے لیے خیر و برکت کے موجب ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے مصلحین و قائدین ایسے افکار و تصورات کو اپناتے ہیں جن کی صفات اس کے برعکس ہوتی ہیں، اور جن سے اگر کوئی فائدہ پہنچتا بھی ہے تو نہایت محدود اور وقتی اور بہ حیثیت مجموعی وہ فتنہ و فساد اور عالم کی تباہی کا موجب ثابت ہوتے ہیں۔ ہٹلر و مسولینی نے اپنی قوموں کو جس طرح کے تصورات کی شراب پلائی تھی ان کے نقطۂ نظر کے مطابق ان کی قوم کے احیاء و تنظیم جدید کے لیے وہ ضروری تھے، چناں چہ ان کی بنیاد پر انھوں نے اپنی اپنی قوم کی تنظیم جدید کی اور ان کو ایک نئے جذبہ اور نئی روح سے آشنا کیا لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ تصورات دنیا کی بلکہ خود ان کی بھی۔ تباہی و بربادی کے باعث ثابت ہوئے۔ اور یہی انجام ہر اس اصلاح و تعمیر کا ہوا ہے اور ہوگا جس کی بنیاد ٹھوس، ثابت شدہ اور صالح افکار پر قائم نہ ہو۔ اس بنا پر اصلاح و تعمیر کے ضمن میں یہ بنیادی افکار و تصورات بڑی اہمیت کے مالک ہیں جن کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اسی بنا پر یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہے کہ انبیاء کرام کے ذریعہ جو حیرت انگیز انقلابات دنیا میں طاری ہوئے ان کی اساس کس قسم کے افکار و تصورات تھے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ جہاں تک بنیادی افکار و تصورات کا تعلق ہے وہ ہر نبی کی دعوت و تحریک میں حیرت انگیز حد تک ایک ہیں۔ یہ بات بہ جائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ جن چیزوں پر اپنی دعوت کی بنیاد قائم کرتے تھے، وہ نہایت ٹھوس حقیقتیں ہیں ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ یہ انبیاء جو مختلف زمانوں میں اور مختلف قوموں کے اندر مبعوث ہوئے، وہ سب کے سب اس طرح ایک ہی قسم کے افکار و تصورات کے داعی و علم بردار ہوتے۔ بہ ہر حال ان انبیاء کرام نے جن بنیادی عقائد کو اصلاح و تعمیر کی اساس بنایا تھا، وہ تفصیل میں تو متعدد ہیں لیکن ان کا اصل الاصول یہ ہے کہ یہ دنیا جس میں انسان رہتا ہے یہ بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے بلکہ اس کا ایک بادشاہ ہے اور اسی کی مشیت ہر جگہ جاری و ساری ہے اور خود انسان بھی اگر چہ وہ ایک محدود پیمانہ پر دوسری مخلوقات کے مقابلے میں تھوڑی سی آزادی رکھتا ہے لیکن یہ آزادی اسی کی بخشی ہوئی ہے اس لیے اس کی بنا پر اسے اس غلط فہمی کا شکار

نہیں ہونا چاہیے کہ وہ دنیا میں ہر معنی میں ایک خود مختار ہستی کی حیثیت رکھتا ہے، اسے اسی کے آگے سر جھکانا چاہیے اور اسی کا مطیع بندہ بن کر زندگی گزارنی چاہیے اس کے ماسوا کوئی اطاعت و فرماں برداری کا مستحق نہیں خواہ وہ انسان ہو یا غیر انسان اور یہ اطاعت و فرماں برداری اس کے خالق ہونے کا حق بھی ہے اور اسی میں اس کا فائدہ بھی ہے اگر اس راستے کو چھوڑ کر وہ سرکشی یا بغاوت کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس سے اس ہستی کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کیوں کہ اس کی خدائی خود اپنے بل پر قائم ہے، نہ وہ کسی کے تسلیم کرنے کی محتاج ہے اور نہ وہ کسی کے مٹانے سے مٹ سکتی ہے البتہ اس سے وہ خود اپنے کو نقصان پہنچائے گا کیوں کہ اللہ کی حاکمیت تمام دنیا پر قائم ہے اور اس کے دائرہ سے خود انسان بھی خارج نہیں ہے۔ اس لیے خود مختاری کے زعم باطل کے ساتھ کائنات کے اس چوکھٹے میں وہ ٹھیک نہیں بیٹھ سکے گا اور لامحالہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

تمام انبیاء کرام کی دعوت بلا استثناء یہی رہی ہے چناں چہ خود قرآن مجید میں کہا گیا ہے:

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (النحل:۳۶)

”اور یقیناً ہم نے ہر گروہ میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔“

اور اس کے علاوہ متعدد سورتوں میں مختلف انبیاء کرام کے تذکروں میں ان کی دعوت کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ (الاعراف:۵۹)

”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، تمھارا اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے!“

اور یہی دعوت جیسا کہ بالتفصیل ہر شخص جانتا ہے، خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہی ہے۔ گویا انبیاء کرام دنیا میں جس دعوت و تحریک کو لے کر تشریف لائے تھے وہ یہ تھی کہ کفر و شرک جن شکلوں میں بھی پائے جاتے ہوں ان سے دنیا کو پاک کیا جائے اور ان کی بہ جائے اللہ کی عبادت و حاکمیت کو جیسی کہ ہونی چاہیے دنیا میں قائم کیا جائے، یہ ان کی دعوت کا خلاصہ ہے اور اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ درحقیقت اسی پر ہر قسم کی اصلاح و تعمیر کا دارومدار

ہے، دنیا میں جو فتنہ وفساد بھی برپا ہوا ہے ان سب کا حقیقی سرچشمہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے کو مخلوق ومحکوم ہونے کے بہ جائے خودمختار وغیر مسئول[1] سمجھ لیا ہے، اس لیے جب تک کہ اس کے اس زعم باطل کو دور نہ کیا جائے انسان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیاں دور نہیں ہوسکتیں، انبیاء کرام کو اصلاح کا یہ نکتہ اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا، اس لیے انھوں نے اس کو اپنی اصلاحی مساعی کا نقطۂ آغاز بنایا۔ اور انبیاء کرام کے حالات زندگی تو پوری تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن جہاں تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے آپ کے حالات زندگی میں یہ چیز روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ جس وقت آپؐ مبعوث ہوئے ہیں، بہت سے ایسے مسائل تھے جو اپنے حل کے لیے آپ کی توجہ کے منتظر تھے، جہالت اس درجہ عام تھی کہ پورے ملک عرب میں چند شخص تھے جو معمولی نوشت وخواند سے واقف تھے، اخلاقی زوال کا یہ عالم تھا کہ زنا وشراب علانیہ رائج تھے بلکہ ان کا شمار مفاخر میں ہوتا تھا، لوٹ کھسوٹ اور ناجائز معاشی انتفاع کا ہر طرف دور دورہ تھا، چپہ چپہ پر سود خواری کا جال بچھا ہوا تھا، امراء غریبوں کو بے دردی کے ساتھ لوٹنے میں مصروف تھے اور سیاسی حیثیت سے ان کی حالت یہ تھی کہ ایک طرف قبائل کی باہمی کش مکش وتنازع نے خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا کردی تھی اور دوسری طرف ایران وروما کی شہنشاہیت خطرہ بن کر ان کے سروں پر منڈلا رہی تھیں بلکہ ملک کے ایک معتد بہ حصہ میں اپنا قبضہ وتسلط بھی جما چکی تھیں۔

جس وقت آپ نے اصلاح ودعوت کا کام شروع فرمایا ہے یہ تمام حالات آپ کے سامنے تھے اور یقیناً آپ کو ان کے بدلنے کی فکر بھی رہی ہوگی کیوں کہ جیسا کہ بعد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے آپ نے ان میں سے ایک ایک حالت کی طرف توجہ کی اور ان کو مناسب طور سے حل فرمایا۔ لیکن شروع شروع میں آپ نے ان میں سے کسی ایک کی طرف بھی توجہ نہیں فرمائی صرف لا الٰہ الا اللہ کے پیغام کو پھیلانے اور منوانے ہی کی طرف آپ متوجہ رہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ انبیاء کے نقطۂ نظر سے یہی پیغام ہر قسم کی اصلاح کا سنگِ بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت سنورتی ہے اور اسی پر اجتماعی نظام کی عمارت ایک نئے نقشہ کے مطابق تعمیر

(۱) شرک کا لازمی نتیجہ بھی خودمختاری وغیر مسئولیت ہی ہے کیوں کہ شرکاء وشفعاء پر اعتماد کرلینے کے بعد انسان اپنے انجام کار کی طرف سے بے پرواہ ہوجاتا ہے۔

ہوتی ہے جو اس امت اور اس کے ساتھ پورے عالم کے لیے خیر وصلاح کی موجب ثابت ہوتی ہے چناں چہ ایسا ہی ہوا، یہ پیغام رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا رہا یہاں تک کہ ایک دن ایسا آیا کہ پورا عرب اس کا حلقہ بہ گوش بن گیا جس کے نتیجے میں انفرادی سیرتیں ایسی بن سنور گئیں کہ ان جیسے نمونے دنیا نے کبھی نہیں دیکھے تھے اور ایک ایسا نظام اجتماعی قائم ہو گیا جس کی بہ دولت عرب ہی نہیں بلکہ دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ صدیوں بعد پہلی مرتبہ حقیقی امن وسکون اور خیر وصلاح سے آشنا ہوا۔ وہ تمام عظیم الشان کامیابیاں جو ایک مختصر زمانہ میں آپؐ کو حاصل ہوئیں اور جن کی بنا پر آپ کو بہ جا طور پر مصلح اعظم کا خطاب دیا جاتا ہے وہ آپ کے اسی طریقۂ تبلیغ کی رہین منت ہیں۔

پس اصلاح وتعمیر کے سلسلے میں انبیائی طریقِ کار کے مطابق کسی کو کچھ کرنا ہے تو اس کی حقیقی شکل یہی ہوسکتی ہے کہ لوگوں کو لا الہٰ اللہ کی اصل حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا حقیقی فرماں روا ہے، اس کے سوا کوئی مالک وفرماں روا نہیں ہے اور نہ اس کے سوا کسی کی اطاعت وفرماں برداری بہ جز ان صورتوں کے جن میں اس کا اذن حاصل ہو، جائز ہے۔ اور یہاں یہ بات بھی یاد رکھی جائے کہ انبیاء کرام نے **لا الہ الا اللّٰہ یا مالکم من الٰہٍ غیرہ** کا جو پیغام پیش کیا تھا اس کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ ہم زبان سے یہ کلمہ دہرانے لگیں یا سمجھنے کی حد تک اس کو صحیح سمجھنے لگیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس کے جو زیادہ سہل سادہ اور بے ضرر مفہوم، ہیں، ان کے مطابق کچھ عملی تبدیلیاں پیدا کرلیں بلکہ یہ زندگی کے ہر شعبے میں خدا کی کامل اطاعت کا پیغام تھا۔ انبیاء کرام دین ودنیا کی تفریق یا زندگی کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرنے کے قائل نہیں تھے، وہ انسان کی پوری زندگی کو اللہ کی اطاعت میں بسر ہوتی دیکھنا چاہتے تھے۔

نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ (النساء:۱۵۰)

”ہم بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔“

کہنے والے ان کے نزدیک ویسے ہی منکر وکافر تھے جیسے بالکلیہ ان کے پیغام کو رد کردینے والے بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ۔ وہ

اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ (البقرہ:۲۰۸)

”اللہ کی اطاعت میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ۔“

کا پیغام دیتے تھے اور یہی ان کے کام کا اصل میدان تھا اور اسی بنا پر اس کلمہ کے بلند ہوتے ہی ان میں اور ان کی قوم میں عظیم کش مکش پیدا ہو جاتی تھی، ورنہ ان کے زمانوں میں ایسے ''متبعین'' کی کمی نہیں تھی جو اپنی زندگی کے اکثر گوشوں کو تو بہ طیب خاطر خدا کے حوالہ کرنے کے لیے تیار تھے، صرف بعض گوشوں کو اس سے مستثنیٰ رکھنا چاہتے تھے بلکہ بہت سے لوگ تو اس لحاظ سے پہلے ہی سے ''مسلمانانہ'' زندگی گزار رہے تھے لیکن انبیاء کرام نے اس طرز زندگی کو کافی نہیں سمجھا اور اسی بنا پر ان کے خلاف بھی ان کو کش مکش کرنی پڑی۔ اس کے برخلاف اب ہمارے سامنے لا الٰہ کا جو مفہوم ہے وہ بس اتنا ہی ہے کہ ہم زبان سے اس کا اعتراف کر لیں، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنی عملی زندگی کے کچھ حصوں کو تو اس کے تابع کر دیں اور بقیہ کو اپنی خواہش نفس یا دنیا میں جو قانون اور رسوم رائج ہیں ان کے مطابق گزاریں، ظاہر ہے اس طریقہ کو انبیاء کے طریق دعوت کا نام دینا، یا تو نری سادہ لوحی ہے یا خود فریبی، اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

غلط روی کے اسباب

یہاں پہنچ کر ایک سوال خود بہ خود ذہن میں پیدا ہوتا ہے، ضرورت ہے کہ اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے اس کا بھی ازالہ کر دیا جائے اور وہ یہ ہے کہ اگر شہادت حق کی حقیقت وہ ہے جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے تو آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ امت کی اکثریت اس سے اس طرح غافل ہو گئی ہے کہ بہتوں کو اس کو سن کر ہی اچنبھا ہوتا ہے اور اس اصل طریقے کی بہ جائے دعوت و تبلیغ کے وہ طریقے کس طرح رائج ہو گئے جن کا پہلے تذکرہ آ چکا ہے۔

ہمارے نزدیک اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ شہادت حق کا جو اصل مفہوم ہے اس کے لحاظ سے یہ کام ہمیشہ ہی دشوار رہا ہے اور اس زمانہ میں تو خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ دشوار ہو گیا ہے کیوں کہ یہ دور اپنے الحاد و مادہ پرستی میں گزشتہ تمام دوروں پر بازی لے گیا ہے، دنیا کے بیش تر حصے میں ایسے افکار و نظریات رواج پذیر ہو گئے ہیں جن کو خدا پرستی سے کوئی لگاؤ ہی نہیں ہے، سوشلزم، کمیونزم، ڈیموکریسی، جتنے نظام بھی آج دنیا پر چھائے ہوئے ہیں وہ تمام مادہ پرستانہ نظریات پر قائم ہیں اور ان کے رواج و مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ جو ممالک اسلامی کہے جاتے ہیں

وہ بھی ان ہی کے سیلاب میں بہے چلے جارہے ہیں اور بڑے بڑے علم بردارانِ دین انھیں کی مدح وستائش اور ان کی ترویج وتبلیغ میں مصروف کار ہیں۔ ایسی حالت میں یہ کوئی آسان بات نہیں ہے کہ زمانہ کی عام روش سے ہٹ کر کوئی شخص اُن نظریات وافکار کا نام لے جن کو زمانہ نے دقیانوسی قرار دے دیا ہے، بہت سے لوگوں کے لیے تو دقیانوسیت کا الزام ہی بڑا سخت ہے، وہ اس کے مقابلے کی اپنے اندر تاب نہیں پاتے، کیوں کہ اس الزام کے بعد روشن خیال سوسائٹی میں ان کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا جو اس وقت حاصل ہے اور جو لوگ اس سے کچھ اونچے ہیں وہ اپنے اندر یہ ہمت نہیں پاتے کہ رائج الوقت نظاموں کے مقابلے میں کسی دوسرے نظام کا نام لے کر اپنے کو کسی کش مکش میں مبتلا کریں، ان کو عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ اپنے طور سے کچھ مذہبی رسوم وعبادات ادا کرتے رہیں اور شہادتِ حق کی ذمے داری جس کا ہر مسلمان ہر زمانے میں مکلّف ہے، اسے وہ کسی بعد کے آنے والے کے لیے اٹھا رکھیں اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ شہادتِ حق کا جو اصل طریقہ ہے اس کا نام لینے سے ــــ اور کسی جہت سے نہ سہی کم از کم دعوتی نقطۂ نظر ہی سے ــــ یہ ذمے داری خود بہ خود داعی پر عائد ہوجاتی ہے کہ اس کی زندگی کسی نہ کسی درجے میں اس دعوت کے مطابق ہو جسے وہ دوسروں سے منوانا چاہتا ہے اور چوں کہ اس زمانے میں ہر قسم کے مفاد رائج الوقت نظامِ باطل ہی کے ساتھ وابستہ ہیں جس سے ترک تعلق کے بعد طرح طرح کی پریشانیوں کا پیش آنا ناگزیر ہے اور بدقسمتی سے نظام باطل کے زیر سایہ زندگی گزارنے کی بنا پر حق پرستی، حق پژدہی اور صبر واستقامت کی وہ خصوصیات اب باقی نہیں رہ گئی ہیں جن سے اس قسم کی مشکلات پر قابو پانا سہل ہو، اس لیے بہت سے لوگ اس طریقِ دعوت کا نام لینے سے جان بوجھ کر بھی کتراتے ہیں۔

یہ اصل شہادت حق کے متروک ومہجور ہونے کی ایک عام بڑی وجہ ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کے کچھ اور خصوصی اسباب بھی ہیں جو نہایت گہرے اور قدیم ہیں۔ ذیل میں ہم اس کی بھی کچھ مختصر توضیح کردینا ضروری سمجھتے ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کی جس خصوصیت کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آپ کی شبانہ روز جدوجہد کی بہ دولت تھوڑے ہی عرصے میں ایک

ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا تھا جس کا ہر ہر فرد

یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المآئدہ:۸)

''اے ایمان والو اللہ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والے اور انصاف کے گواہ بنو۔''

کا مظہر اتم تھا اور جو بہ حیثیت مجموعی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے قیام کا سب سے بڑا اجتماعی ادارہ تھا۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج:۴۱)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، معروف کا حکم کریں اور منکر سے روکیں۔''

اور چوں کہ اس شہادت وامر بالمعروف کا مرکز اللہ کی کامل اطاعت کا تصور تھا اس لیے افراد اپنی شخصی زندگی میں اور یہ اجتماعی معاشرہ اپنی اجتماعی ہیئت خصوصی کے لحاظ سے اللہ کی کامل اطاعت کی دعوت وقیام کے عنوان وترجمان تھے چناں چہ یہ معاشرہ جب تک اپنی اصل حالت پر قائم رہا اس کا کام اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ خود اپنی زندگی اس کے مطابق گزاریں اور تمام دنیا کو اس کی طرف دعوت دیں، اس سے جہاں اور فائدے تھے ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اس زمانہ میں شہادتِ حق کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں تھی، اس کے عملی نمونے اس کو سمجھ لینے کے لیے بالکل کافی تھے، لیکن بدقسمتی سے یہ معاشرہ اپنی اصل حالت پر زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا، بہت جلد اس میں بگاڑ شروع ہو گیا۔ پہلوں کے جانشیں ایسے لوگ ہوئے جن میں بدقسمتی سے وہ خصوصیاتِ علم وعمل میں نہیں تھیں جو پیش رووں کو نصیب ہوئی تھیں اس لیے اس معاشرے کی خصوصیات بھی مائل بہ زوال ہوتی رہیں۔ سب سے بڑا نقصان جو ان نااہل خلفاء کے ہاتھوں پہنچا وہ یہ تھا کہ انھوں نے دین ودنیا کو دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں خود یہ صلاحیت نہیں تھی کہ اپنے پیش رو خلفاء کی طرح دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلتے، اس لیے مجبوراً انھیں دین کا شعبہ کچھ مخصوص اہل دین کے سپرد کرنا پڑا اور سیاست کو انھوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا جو بس اس حد تک دین کے زیر اثر تھا کہ کبھی کسی

معاملہ میں خود سیاست کا تقاضا ہوتو اس میں وہ اہل دین سے مشورہ کرلیا کریں لیکن مشورہ کی بھی حیثیت یہ تھی کہ اس کو ماننا یا نہ ماننا ان کی مرضی پر موقوف تھا اور دین کی اتنی پرسش بھی صرف اس زمانے تک رہی جب تک عوام میں دین کا کچھ اثر باقی رہا بعد کو خلفاء اس مشورہ سے بھی بے نیاز ہوگئے اور ان کی سیاست چنگیزی کا نمونہ بنتی چلی گئی جس سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ خود تو شہادتِ حق کا حق کیا ادا کرتے اگر کچھ افراد اس کا حوصلہ بھی کرتے تھے تو اس کو خلاف مرضی پاکر دارورسن سے ان کی تواضع کرتے۔ ان حالات میں ظاہر ہے شہادتِ حق کا کام اگر جاری رہ سکتا تھا تو صرف اس طور سے کہ اس کو خالص مذہب کے دائرہ کے اندر محدود رکھا جائے۔ اس طور سے شہادت حق نے نئے نئے قالب اختیار کرنے شروع کیے اور وہی قالب ہیں جو عہد بہ عہد منتقل ہوکر ہم تک پہنچے ہیں۔ پھر چوں کہ حقیقی شہادت صرف مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہی نہیں تھا بلکہ اس سے ان میں وہ خصوصیات پیدا ہوئی تھیں جنھوں نے ان کو تختِ خلافت پر متمکن کیا تھا اس لیے اس میں فرق آنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ وہ خالص دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی زوال وانحطاط سے دوچار ہوتے گئے یہاں تک کہ نوبت یہ آگئی کہ ان کی صدیوں کی قائم حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ اس انقلابِ حال نے شہادت حق کو ایک اور طرح سے متاثر کیا یعنی مسلمانوں پر ایک خاص طرح کی شکست خوردگی اور مایوسی کی کیفیت طاری ہوگئی جس نے ان کے فکر وعمل کے سارے انداز بدل ڈالے۔ جن کا ایک گوشہ یہ بھی ہے کہ شہادت حق کے رنگ وروپ نے بھی کچھ اور نئے قالب اختیار کرلیے جن میں حوصلہ وجرأت کی بہ جائے کم ہمتی وبے حوصلگی کا عنصر غالب تھا اور جن میں جوش ونشاط کی بہ جائے پژمردگی واضمحلال اور وقتی سکون وتفریح کی طلب زیادہ نمایاں تھی۔ ان حالات وواقعات سے ہندستان کے مسلمانوں کا بھی متاثر ہونا ایک بالکل قدرتی بات تھی چناں چہ ان کا ان پر اثر ہوا اور یہاں بھی وہ تمام تغیرات ونتائج رونما ہوئے جن سے اس وقت پورا عالمِ اسلامی متاثر ہورہا تھا لیکن ایک خاص وجہ سے یہاں ان چیزوں کا اثر ہر جگہ سے زیادہ اور نمایاں رہا اور وہ یہ ہے کہ جس تغیر وانقلاب کے نتیجے میں یہ حالات رونما ہوئے تھے وہ ان کے لیے محض ایک کہانی نہیں تھی بلکہ خود اپنے ملک میں بھی قریب قریب ایسے ہی تغیر وانقلاب سے ان کو گزرنا پڑا ہے، ہر چند یہاں جو حکومت قائم تھی وہ ایسی بھی نہیں تھی جیسی کہ بنوامیہ یا بنوعباس کی

حکومتیں تھیں کیوں کہ اسلام یہاں بہت چکر کاٹ کر اور مختلف درمیانی مراحل طے کر کے پہنچا تھا اس لیے وہ اپنی بہت کچھ خصوصیات پہلے کھو چکا تھا اور اسی بنا پر اس پر یہاں مسلم قومیت کا رنگ بہت غالب نظر آتا ہے لیکن یہ حکومت شروع میں جیسی کچھ بھی تھی بعد میں ویسی بھی باقی نہیں رہی اور نہ اس کے حکم راں ان خصوصیات کو قائم رکھ سکے جو ان کے پہلوں میں موجود تھیں اور جن کی بنا پر اس کے اسلامی ہونے کا دھوکا ہوا کرتا تھا، یہ لوگ اسلام کے داعی و مبلغ نہیں تھے بلکہ فاتح و کشور کشا تھے اور ملک گیری اور حکومت ہی ان کا مقصودِ اصلی تھا، مذہب کا اثر اگر کچھ تھا بھی تو اس کے اس ناقص تصور کے ساتھ کہ وہ رسوم وعبادات کے ایک خاص دائرہ تک محدود ہے، حکومت کے عام کاروبار اس کے دائرہ اثر سے خارج ہیں۔ اس لیے ان کے طرز عمل نے یہاں بھی وہی صورتِ حال پیدا کر دی تھی جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ حکومت کا اجتماعی نقشہ شہادت حق کی بجائے، شہادت ناحق کا مظہر تھا اور چوں کہ افراد کی انفرادی حالت زیادہ تر اجتماعی نظام کے تابع ہوتی ہے اس لیے ان کی انفرادی زندگیاں بھی اس کے اثر سے خالی ہو چکی تھیں۔ اس ناموافق ماحول میں اگر کوئی شہادت حق کے لیے آمادہ بھی ہوتا تھا تو حکم رانوں کا جبر وتشدد راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا تھا پھر یا تو اٹھتے ہوئے قدم رک جاتے تھے یا ہمت و جواں مردی سے موانع کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے تھے تو ایسی ناقابل برداشت مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا جن سے ان کے حوصلے چاہے پست نہ ہوئے ہوں لیکن دیکھنے والوں کے دل تھرا اٹھتے تھے اور چوں کہ اس سلطنت کا بھی انجام وہی ہوا جو عربی سلطنت کا ہو چکا تھا اس لیے اس کے خاتمہ پر بھی وہی جذبات ورجحانات پیدا ہوئے جن کی بہ دولت عام مسلمانوں کے ذوقِ شہادت نے تبلیغ و شہادت کے نئے نئے قالب اختیار کر لیے تھے، پس اگر ہم ان حالات و واقعات کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں تو ہمیں اِس پر مطلق تعجب نہیں ہوگا کہ شہادت کا اصل انبیائی طریقہ یہاں اس طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اور اس کی جگہ مذکورہ شکلوں نے لے لی ہے اور چوں کہ ایک عرصۂ دراز سے انہی کو رواجِ عام حاصل ہے اس لیے ہمارے موجودہ رجحان طبع کے مطابق قدرتی طور پر دنیا میں ان کا رنگ بھی چھا گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ ادوار جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے شہادت حق کی حقیقی جدوجہد سے بالکل خالی نہیں تھے، حکم رانوں کے طبقہ میں بھی بعض ایسے

افراد گزرے ہیں اور عوام میں بھی، جنھوں نے اپنے اصل فریضہ کو ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان کی ان کوششوں کو تھوڑی بہت کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں چناں چہ یہ ان کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے کہ دین کے حقیقی تصورات کبھی پوری طرح نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکے اور شہادت حق کی اصل حقیقت بھی اپنا کچھ نہ کچھ اثر دکھلاتی رہی لیکن ظاہر ہے کہ تغیر و انقلاب کا جو دھارا حکومتی وسائل و ذرائع کی مدد سے بہہ رہا تھا اس کا بدل ڈالنا کوئی آسان بات نہیں تھی بالخصوص اس حالت میں کہ عوام کی عملی تبدیلیاں اس تغیر وانقلاب کے لیے حالات کو بہت کچھ سازگار بنا چکی تھیں اور وہ لوگ جن پر شہادت حق کی اصل ذمہ داری ہے بہ حیثیت جماعت اپنے فرض کی ادائیگی سے یکسر غافل تھے، ان کی اکثریت یا تو بد دلی اور مایوسی کا شکار ہو کر گھروں میں بیٹھ رہی تھی یا کراہنے اور غم کھانے کے سوا اور کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں تھی بلکہ ان میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو مختلف دینی و شخصی مصالح کے تحت اس انقلاب وتغیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے، ایسی حالت میں تھوڑے سے افراد کا جذبۂ عمل اس سیلاب کا کس طرح مقابلہ کر سکتا تھا؟ ہاں یہ ضرور ہوا کہ انھوں نے اس پر بند لگانے کی کوشش کر کے اللہ کے ہاں اپنے کو معذور ثابت کر دیا اور اپنے عمل سے فضا میں کچھ ایسے تموجات پیدا کر دیئے، جو بہ ہر حال خیر و برکت کے موجب ثابت ہوئے چناں چہ یہ انھی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ دین وشہادت حق کے نقوش اب بھی قائم رہ گئے ہیں، یہ نہ ہوتے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہاں اسلام کا نام ونشان باقی رہتا یا مٹ جاتا اور ان کی موجودگی کا سب سے بڑا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ یہ کوششیں ہمیشہ کی طرح اب بھی بعد کے آنے والوں کے لیے مہمیزِ عمل کا کام کر رہی ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ ان کے چھوڑے ہوئے نمونۂ عمل پر آئندہ کام کرنے والے پیدا ہوں اور ان کی کوششیں کسی نہ کسی وقت انجام واختتام کو پہنچ سکیں۔ **وما ذلک علی اللّٰہ بعزیز** ○

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

شہادت حق کے تقاضے

گزشتہ فصل میں شہادت حق کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے اگر اس کو ذہن میں رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کو ٹھیک طور سے بروئے کار لانے کے لیے چند باتیں ناگزیر ہیں۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ شہادت حق کے انجام دینے کے لیے صرف جوش و جذبہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ جس حق کی ہمیں شہادت دینی ہے اس کا ٹھیک ٹھیک ہمیں علم ہو، یوں تو حق کی معرفت فی نفسہ مسلمان ہونے کے لیے بھی ضروری ہے ـــــ کیوں کہ اس موقع خاص میں لفظ ''حق'' صحیح معنوں میں لفظ اسلام[۱] یا دین حق کا قائم مقام ہے اور اسلام کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو از خود محض کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے سے حاصل ہو جاتی ہو۔ اس کے لیے سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اسلام درحقیقت ہے کیا ـــــ لیکن جو لوگ عرف عام کے مطابق خود مسلمان بننے پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے بلکہ ایک حقیقی مسلمان کی طرح اس کی دوسروں میں تبلیغ بھی ضروری سمجھتے ہیں ان کے لیے تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ اپنی وسعت کے مطابق حق کا پورا پورا علم حاصل کرنے کی کوشش کریں، کسی چیز کے صحیح علم کے بغیر اس کی تبلیغ و شہادت بالکل بے معنی سی بات ہے جس کی جرأت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عقل و ہوش سے خالی ہوں اور ایسے عقل و ہوش سے خالی مبلغین کی باتوں پر وہی لوگ کان بھی دھر سکتے ہیں جو اپنے حمق

---

(۱) ظاہر ہے آیت لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ میں شہادت سے مطلب اس پورے دین کی شہادت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے ورنہ آپ کی شہادت ناقص رہ جاتی حالاں کہ آپ کو حکم یہ ملا ہے يَآ أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۖ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۖ

اور سادہ لوحی میں کچھ ان سے بھی آگے ہوں۔

لیکن یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حق یہاں کسی مجرد حقیقت کا نام نہیں ہے جس کی معرفت تھوڑی سی توجہ سے حاصل ہو سکتی ہو بلکہ اس سے مراد جیسا کہ گزر چکا ہے، وہ ضابطۂ حیات ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ اہل دنیا کے لیے بھیجا ہے اور یہ ضابطۂ حیات پوری زندگی کو محیط ہے اور ہر دور اور ہر زمانہ کے لیے ہے، اس لیے اس کو اس طرح حاصل کرنا کہ ہمیں محض اس کے کچھ منتشر اجزاء کا علم نہ ہو بلکہ اس کے پورے مجموعہ کا علم ہو جس میں اس کے تمام اجزاء ایک وحدت کی لڑی میں پروئے ہوئے نظر آئیں جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں اور ہمیں اس پر اس طرح دسترس حاصل ہو کہ ہم اپنے زمانہ کے پیش آمدہ مسائل میں اس سے ٹھیک ٹھیک رہنمائی حاصل کرسکیں، کوئی آسان بات نہیں ہے، اس کے لیے کافی محنت اور کاوش کی ضرورت ہوگی تب جا کر ہمیں اس کا وہ ضروری علم حاصل ہو سکے گا جو تبلیغ وشہادت کے لیے درکار ہے۔ پھر یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ علم وعمل کے جو نمونے اس وقت ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں وہ اس معاملہ میں آپ کے لیے کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتے بلکہ اگر آپ احتیاط پر عمل پیرا نہیں ہوں گے تو اندیشہ ہے کہ بہت سے غلط نمونے آپ کو غلط راستہ پر ڈال دینے کے موجب ثابت ہوں گے۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو دینی درس گاہیں ہر چہار طرف پھیلی ہوئی ہیں وہ درحقیقت ہمارے اس ذہنی زوال وانحطاط کی یادگاریں ہیں جس میں مسلمان خلافتِ اسلامی کے زوال کے بعد عام طور سے مبتلا ہو گئے ہیں، اسلام کی اصل خصوصیت، کہ وہ ایک انقلابی تحریک ہے جو خدا پرستی کی بنیاد پر ایک عالم گیر عظیم الشان انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے، مدت ہوئی ختم ہوگئی ہے اور اب انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں جن کی طرف اوپر سرسری اشارات گزر چکے ہیں، وہ محض ایک مذہب بن کر رہ گیا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بھی تنگ دائرہ یعنی حنفیت اور شافعیت اور دیوبندیت و بریلویت وغیرہ مسلکوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اور یہی تصور ہماری ان درس گاہوں کے نظامِ تعلیم وتربیت میں بھی نمایاں ہے۔ اس لیے جو لوگ ان سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں ان کا علم وعمل صحیح معنوں میں اسلام کا حقیقی نمونہ ہونے کی بہ جائے اکثر اس کی غلط ترجمانی کا سبب اور ذریعہ بن جاتا ہے، اسلام کے علم کے حقیقی سرچشمے کتاب وسنت ہیں: **ترکت فیکم ثقلین لن تضلوا ما**

تمسکتم بهما لیکن عام طور سے ہمارے دینی مدارس کا حال یہ ہے کہ جن علوم کو وہ خود آلی علوم کہتے ہیں انہی کے پڑھنے پڑھانے پر زیادہ وقت اور قوت صرف کی جاتی ہے، ان علوم کے جو مقصود ہیں ان کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے، بہت کم مدارس ہیں جہاں کتاب الٰہی کی باقاعدہ تعلیم کا انتظام ہو، زیادہ سے زیادہ تفسیر کے نام سے جلالین یا بیضاوی کا تھوڑا سا حصہ، سرسری طور سے طلبہ کی نظروں سے گزار دیا جاتا ہے جن میں ایک کی حیثیت یہ ہے کہ اس کی تفسیر متن سے زیادہ نہیں ہے اور دوسری گو اس کے مقابلہ میں کچھ مطول ہے لیکن اس میں قرآنی مطالب سے زیادہ زور نحوی ترکیبوں اور ادبی نکتوں کے بیان کرنے پر صرف کیا گیا ہے، حدیث کی تعلیم کا ضرور رواج ہے لیکن اس کا زیادہ حصہ بہ شکل دورہ ہوتا ہے جس میں سال بھر کے اندر ضخیم ضخیم کتابیں اس طرح پڑھا دی جاتی ہیں کہ غریب طالب علم کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ روانی میں جتنے صفحات سے وہ گزر گیا ہے ان میں کیسے کیسے جواہر پارے چھپے ہوئے تھے۔ ہاں جہاں ائمہ کے اختلافات ہیں وہاں رک کر پوری داد تحقیق دی جاتی ہے اور روانی دوانی کی کل کسر وہاں پوری کر دی جاتی ہے، لیکن یہ تحقیق کیا ہوتی ہے ایک باقاعدہ علم دنگل ہوتا ہے جس میں گزرے ہوئے ائمہ کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑایا جاتا ہے اور آخر میں فتح اس امام کو دلائی جاتی ہے جس کے ساتھ موروثی ہم دردی پہلے ہی سے قائم ہو چکی ہوتی ہے اور اکثر اوقات تحقیق کی بہ جائے یہ ہم دردی ہی اس کا باعث ہوتی ہے۔

تعلیمِ حدیث کا مجموعی اندازہ بس یہی ہے، اس سے کچھ پڑھانے والے افراد تو مستثنیٰ ہو سکتے ہیں لیکن مدارس کے سلسلہ میں شاید کوئی استثناء ممکن نہیں ہے، یا اگر ہو تو کم از کم ہمیں اس کی خبر نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس طرح قرآن و حدیث پڑھنے سے طلبہ میں وہ روح پیدا نہیں ہو سکتی جو اسلام کو اس کی صحیح شکل میں سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس سے دین کے مختلف اجزا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم رکھنے والے یا حنفی و شافعی کہلانے والے تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ایسے لوگ جو دین کے اجزاء میں سے ایک دوسرے کا باہمی ربط سمجھتے ہوں اور کسی جزء کی بہ جائے اس کے پورے مجموعے کی خوبیوں سے کما حقہ واقف ہوں اور دین میں ان کی بصیرت اتنی مجتہدانہ ہو کہ وہ نئے مسائل پر دین کی روشنی میں غور کر سکیں، اس طرزِ تعلیم سے ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کی توقع

نہیں کی جاسکتی، اور اگر اتفاق سے ان مدارس میں ایسے لوگ نکل آئیں تو ان کو ان مدارس کی بہ جائے خود ان کی خداداد صلاحیت اور محنت اور مشقت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے اور بس۔

پھر بات اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس راہ کی ایک دشواری اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ حق کی صحیح معرفت کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ ہم یہ جان لیں کہ حق کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ ناحق کیا ہے، اس کے بغیر کہنا چاہیے کہ خود حق کی معرفت تام نہیں ہو سکتی۔ **وبضد هاتتبين الاشياء**

چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے:

انما ينقض الاسلام عروة عروة من نشأ فی الاسلام ولم يعرف الجاهلية۔

''اسلام کے ایک ایک بند کو وہ شخص توڑتا چلا جاتا ہے جو اسلام میں پیدا ہوا اور اس نے جاہلیت کو نہ پہچانا۔''

اور ایک مشہور عالم دین نے آیت

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ (الانعام:۵۵)

''ہم یونہی آیات کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اور تا کہ مجرمین کی راہ واضح ہو جائے۔''

سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صحابہ کرام کو جو دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں جن کی نشو ونما اسلام کے زیر سایہ ہوئی ہے، اسلام کے ساتھ کفر اور اس کی قسموں کا زیادہ گہرا علم رکھتے تھے کیوں کہ وہ اس سے نکل کر اسلام میں آئے تھے۔

ان اقوال سے قطع نظر باطل سے واقفیت کی ضرورت ہمارے اس مشاہدہ سے بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس زمانہ میں جن لوگوں کا دائرۂ واقفیت محض دین تک محدود ہے اور وہ اپنے زمانہ کے باطل افکار ونظریات سے واقفیت نہیں رکھتے وہ اکثر نادانستہ طور سے ان کو دین یا دین سے غیر متصادم سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں، اس زمانہ میں بہت سے علماء کرام بھی جو کمیونزم یا سیکولرزم یا ڈیموکریسی کی حمایت میں وعظ وتلقین کرتے پھر رہے ہیں وہ درحقیقت اسی حقیقت کی

افسوس ناک مثال ہیں، ورنہ کجا اسلام اور کجا یہ خالص ملحدانہ اور مادہ پرستانہ افکار ونظریات! ان میں باہم اگر کوئی نسبت ہوسکتی ہے تو تضاد کی، لیکن پھر بھی ناواقفیت کی بنا پر یہ سارے ازم عین اسلام بن گئے ہیں یا کم از کم یہ کہ ان کا اسلام سے کوئی تصادم نہیں ہے۔

بہ ہر حال باطل سے واقفیت بھی علم دین ہی کا ایک شعبہ ہے، بالخصوص ان لوگوں کے لیے تو یہ از بس ضروری ہے جو دین حق کی صرف پیروی ہی نہیں کرنی چاہتے بلکہ اس کو اس کے مخالف دیگر نظام ہائے زندگی پر غالب بھی کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ دین کی اس طرح کی واقفیت حاصل کرنا بھی اس زمانہ میں بہت دشوار ہے۔ صدیوں کے تغیر وانقلاب کے نتیجہ میں ہماری ذہنیتوں میں جو سمٹاؤ پیدا ہو گیا ہے اور جس کی بنا پر دین ودنیا کی تفریق وجود میں آئی ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے علم دین کے مراکز اس تصور ہی سے خالی ہو گئے ہیں کہ انھیں باطل سے واقفیت بہم پہنچانی چاہیے کجا یہ کہ وہ ان کے مٹانے کے درپے ہوں جس کے وہ اصلاً ذمہ دار ہیں۔ اسی بنا پر وہاں اس کا کوئی انتظام نہیں ہے، ان میں پڑھنے پڑھانے والے اتنے معصوم ہیں کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ جاہلیت کیا ہے، وہ واقفیت ہیں تو ان جاہلیتوں سے جو ان کے مروجہ نصاب کی ترتیب و ترویج کے وقت کسی شکل میں رائج تھیں، زمانہ حال کی جاہلیتوں کی بھنک بھی ان میں سے بہتوں کے کانوں میں نہیں پڑی ہے اور امت کا حال یہ ہے کہ یہ دیکھ کر کہ دنیاوی ترقی کا دامن قدیم علوم کی بجائے جدید علوم کے ساتھ وابستہ ہے، قدیم مدارس کو اس نے زمانہ حال کے مطابق ڈھال لینے کی بہ جائے ان کو ان کے حال پر سسکتے ہوئے چھوڑ دیا ہے اور اب اپنی تمام تر توجہ جدید قسم کے اسکول وکالج قائم کرنے پر صرف کرنے لگی ہے، جہاں اس کا انتظام ضروری ہے کہ ان میں تعلیم پانے والے عہد حاضر کے فتنوں سے باخبر ہوسکیں کیوں کہ ان فتنوں ہی سے روٹی کا دامن بندھا ہوا ہے لیکن ان میں یا تو دینی تعلیم کا عنصر بالکل ناپید ہے یا ہے تو صرف اس حد تک کہ دنیاوی علوم پر کچھ زم زم کے چھینٹے پڑ جائیں تاکہ وہ متبرک ہو جائیں یا کسی حد تک مسلمانوں کو یہ اطمینان ہو جائے کہ دین کا سررشتہ بالکل چھوڑ نہیں دیا گیا ہے تاکہ ان سے چندہ حاصل کرنے میں سہولت ہو، نتیجہ یہ ہے کہ ان مدارس کے طلبہ باطل افکار ونظریات سے واقف ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کو

شوق کے ساتھ اپناتے جارہے ہیں اور یہ فتنہ اب روز افزوں ترقی پر ہے کیوں کہ تقسیم کے بعد جو حالات ملک میں طاری ہوئے ہیں اُنھوں نے دینی احساس کے ساتھ قومی وملی جذبات کو بھی بہت کچھ کچل کر رکھ دیا ہے، اس لیے مسلمانوں کے جو خالص تعلیمی ملی ادارے تھے وہ اب برائے نام ملی ادارے ہیں ان کا کام اس روح وذہنیت کو پروان چڑھانا ہے جو ملکی حکومت چاہتی ہے۔ ان حالات میں جب کہ ہمارے خالص دینی اداروں میں دین کے نام پر صرف مذہب ہی مذہب ہے ''دنیا'' کی کوئی ہوا نہیں لگنے پائی ہے اور دنیاوی اداروں میں صرف دنیا ہی دنیا ہے، دین کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہے، یا ہے تو مٹ رہا ہے، ان سے وہ دینی وتبلیغی ضرورتیں کس طرح پوری ہوسکتی ہیں جن کے لیے الگ الگ دین ودنیا کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ ان دونوں کے یک جا ہونے اور ایک دوسرے کے لیے مفید ثابت ہونے سے ہی پوری ہوسکتی ہیں۔ بلا شبہ مسلمانوں نے بعض ایسی درس گاہیں بھی قائم کی تھیں جن کا مقصود یہی یکجائی تھی لیکن بدقسمتی سے اس مقصد کے مطابق ان کو اچھے کارکن نہیں مل سکے اور نہ امت ہی نے، جو قدیم وجدید دو شاخوں میں اس طرح تقسیم ہوگئی ہے کہ ہر ایک کو اگر دل چسپی ہے تو صرف اپنی شاخ سے، اس نئے مقصد کے حصول میں ان کا کچھ زیادہ ساتھ دیا اس لیے یہ درس گاہیں بھی رفتہ رفتہ اس عام سطح پر آ گئیں جن پر دوسری دینی درس گاہیں چل رہی ہیں۔ غرض یہ کہ اس وقت علم وعمل کے جو نمونے ہمیں اپنے اردگرد مل رہے ہیں وہ چاہے دیگر وجوہ سے کتنے ہی قابل قدر کیوں نہ ہوں لیکن جہاں تک تبلیغی نقطۂ نظر کا تعلق ہے، یعنی اس حقیقی شہادت حق کا تعلق جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے، یہ ایک طالب حق کے لیے پوری طرح کفایت نہیں کرسکتے۔ اس لیے ایسے لوگوں کو صرف ان پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے شوق وتحقیق کو رہنما بنا کر اس کو اپنے طور سے بھی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس بارے میں سب سے زیادہ قابل اعتماد چیز، قرآن وسنت کا براہ راست مطالعہ ہے یا ان لوگوں کی تصنیفات کا جنھوں نے تقلید وجمود سے ہٹ کر ان کا تحقیقی مطالعہ کیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ایسے افراد سے امت مسلمہ اپنے عام زوال وانحطاط کے بھی کسی دور میں خالی نہیں رہی ہے اور یہی حال موجودہ دور کا بھی ہے۔

(۲) شہادت حق کو اس کے صحیح منشاء کے مطابق ادا کرنے کا دوسرا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ

داعی حق صرف حق کو سمجھ کر تحریر و تقریر کے ذریعہ اس کے فضائل ومحاسن بیان کر دینے پر اکتفانہ کرے بلکہ:

(الف) بہ قدر استطاعت پورے حق کو خود عملاً اختیار کرنے کی جدو جہد کرے۔

(ب) اس کو بغیر کسی ادنیٰ ترمیم یا حذف کے بہ تمام وکمال دوسروں کے سامنے پیش کرے۔

(ج) ان دونوں باتوں کے سلسلے میں جو مشکلات و مصائب بھی پیش آئیں ان کو پورے صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کرے۔

جہاں تک ''الف'' اور ''ب'' کا تعلق ہے ان کے متعلق ضروری تفصیلات اس سے پہلے گزر چکی ہیں اس لیے ان کے سلسلے میں ہم یہاں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے البتہ ''ج'' کے سلسلے میں یہاں یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شہادت حق کی جو حقیقت اوپر بیان کی گئی ہے اس کی رو سے اس کو عملاً اپنانا اور دوسروں کو اس کی دعوت دینا درحقیقت مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ شہادت کے مروجہ طریقوں کے مطابق تو یہ بات بہت آسان ہے کہ کوئی شخص حق کا داعی و علم بردار بھی بن جائے اور خود اس کا عمل بہ دستور ناحق کی گواہی دیتا رہے کیوں کہ ان میں زیادہ تر داعی کی فصاحت و بلاغت یا چرب زبانی کو دیکھا جاتا ہے عمل سے کچھ زیادہ بحث نہیں ہوتی یا اگر ہو بھی تو اس کا معاملہ زیادہ دشوار نہیں ہے کیوں کہ جس ''حق'' کی وہ دعوت دیتے ہیں وہ مجموعۂ حق کے کچھ سہل ترین اجزاء ہیں اس لیے ان کے اپنانے میں کچھ زیادہ دشواریاں پیش نہیں آتیں، معمولی ہمت وعزیمت بھی کافی ہے اور اسی طرح ایسے حق کی دعوت دینے میں بھی کچھ زیادہ مشکلات پیش نہیں آسکتیں کیوں کہ ایسا حق کس کو مرغوب نہیں ہوگا جس کے قبول کرنے میں زندگی کے بدلنے کا کوئی سوال نہ ہو، صرف بعض سہل اور آسان قسم کی تبدیلیاں کر لینی کافی ہو۔ اہل حق کے زمرہ میں شمار ہونے کے لیے یہ قیمت کچھ زیادہ گراں نہیں سمجھی جاسکتی، لیکن انبیاء کرام کی دعوت وشہادت کے مطابق جب یہ کام انجام دیا جائے گا تو اس کو عملاً اختیار کرنے میں بھی سخت ترین دشواریاں پیش آئیں گی اور دوسروں میں اس کی تبلیغ بھی بہت مشکل ہوگی۔ سب سے بڑی دشواری تو یہی ہے کہ حقیقی شہادت حق کا تقاضا یہ ہے کہ جو نظام اپنے کل اجزا کے لحاظ سے حق کی ضد ہو اس سے ہم خود عملاً کوئی تعلق نہ رکھیں اور دوسروں کو اس سے ترک تعلق کی دعوت دیں لیکن نظام باطل کے تسلط وغلبہ کا حال یہ ہے کہ اس سے الگ رہ کر دو وقت کی روٹی حاصل کرنا بھی دشوار

ہے، زندگی کا ہر شعبہ اس کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے اس لیے اگر کوئی شخص عقیدہ وقول یا قول وعمل میں مطابقت پیدا کرنا چاہتا ہے تو قسم قسم کی عملی دشواریاں شدِ راہ بن کر سامنے آجاتی ہیں اور اس کی طرف دعوت دینا تو اس سے بھی بڑا اور مشکل کام ہے کیوں کہ یہی نہیں کہ یہ دعوت لوگوں کے لیے اس زمانہ میں نامانوس ہو چکی ہے بلکہ مختلف اسباب کے تحت اس سے لوگوں کو کد اور ضد پیدا ہوگئی ہے اس لیے اس کی طرف بلانے کا مطلب عام اہل زمانہ کو اپنے خلاف بھڑکا لینا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کو اپنے مخصوص عقائد کی بنا پر اس سے اصولاً اختلاف نہیں ہونا چاہیے تو ان کا بھی حال یہ ہے کہ پہلے تو انھوں نے اضطرار کے عذر کی بنا پر اس تعلق کی بعض صورتوں کو جائز قرار دیا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس اضطرار نے استحسان کا درجہ حاصل کر لیا اور اب تو اس نے قریب قریب وجوب کی شکل اختیار کر لی ہے اس لیے وہ بھی اس قسم کی کسی دعوت کا استقبال اس طرح کریں گے کہ ان میں سے کوئی اس کو بے وقت کی شہنائی قرار دے گا، کوئی اسے جنون وخبط کا کرشمہ سمجھے گا اور جو ان میں اصحاب فتویٰ ہیں وہ طنز وتعریض اعتزال وخروج کے فتووں سے مسلح ہو کر اس کے مقابلے میں آمادہ ہو جائیں گے اور ان کی بڑی کوشش یہ ہوگی کہ اس دعوت حق سے لوگوں کے کان ناآشنا ہی رہیں تاکہ نہ آئندہ ان کو اپنی پر عافیت روش بدلنے کی ضرورت پیش آئے اور نہ ان کے پچھلے کارناموں کے بارے میں، جو دین ومذہب کے پرفخر نام سے انجام دیے گئے ہیں لوگوں میں کسی طرح کی بدگمانی پیدا ہو سکے، بہ ہر حال شہادت کے حقیقی منشاء کے ساتھ جو لوگ اس کام کو انجام دینے کے لیے آمادہ ہوں گے ان کو لامحالہ بڑی بڑی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑے گا جس میں ثابت قدم رہنا اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ صبر واستقامت کا غیر معمولی ذخیرہ ان کے ساتھ ہو اور اللہ پر اور اس کی فتح ونصرت پر ان کو غیر متزلزل یقین حاصل ہو۔ چناں چہ اسی بنا پر سورہ والعصر میں تواصی بالحق کے ساتھ تواصی بالصبر کا بھی جوڑ لگایا گیا ہے، کیوں کہ اوّل الذکر کے ساتھ ثانی الذکر کے مواقع ضرور سامنے آتے ہیں اور اس دوسرے کے بغیر پہلا کام کیا ہی نہیں جا سکتا ہے:

وَ الْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳ (العصر:۱-۳)

’’زمانہ گواہی دیتا ہے کہ آدمی گھاٹے میں ہے مگر وہ جو ایمان لائے اور بھلائیاں کیں

اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔"

اور غور کیجیے تو اس راہ میں مشکلات کا پیش آنا ایک لابدی چیز ہے۔ شہادتِ حق درحقیقت ایک مرتبۂ کمال و فضل ہے جو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو عطا فرمایا ہے اور اللہ کی سنت جاریہ یہی ہے کہ وہ افراد اور قوموں کو پہلے مصائب و شدائد سے آزماتا ہے اور جب وہ بالکل پکی ثابت ہوتی ہے تو اس وقت وہ ان کو اپنی عزت و نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ بنی اسرائیل کو کسی زمانہ میں جو منصب و اعزاز بخشا گیا تھا وہ ان کے صبر و عزیمت ہی کا انعام تھا۔

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا (السجدہ:۲۴)

"اور ہم نے ان میں (دین کے) پیشوا بنائے جو ہمارے احکام کے مطابق رہنمائی کرتے تھے اور یہ مقام انھیں صبر کی وجہ سے عطا ہوا۔"

اور جب ان کے بعد امت مسلمہ کو امامت و شہادت کا منصب عطا کیا گیا تو ان کے صبر و استقامت کا امتحان بھی ضروری ٹھہرایا گیا۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِیْنَ ۙ وَ نَبْلُوَاۡ اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾ (محمد:۳۱)

"اور ہم تم کو آزمائیں گے یہاں تک کہ جان لیں تم میں سے مجاہدین کو اور ثابت قدموں کو، اور جانچ لیں تمھارے احوال کو۔"

پس مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمہ تن تیار ہو کر ہی اس کام کا حوصلہ کرنا چاہیے۔

اگر گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لاالٰہ را

لیکن یاد رکھیے کہ اس ذمہ داری سے جان بچا کر بیٹھ رہنے کا مطلب بھی یہ نہیں ہے اب مشکلات و مصائب کسی حال میں پیش ہی نہیں آئیں گی۔ مصائب سے اس حالت میں بھی مفر نہیں ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ ان سے بھی زیادہ سخت و سنگین مصائب پیش آئیں کیوں کہ بنی اسرائیل کی طرح امت مسلمہ کی عزت و ذلت کا مدار بھی اسی بات پر ہے کہ جو منصب اس کے سپرد کیا گیا ہے اس کی ذمہ داریاں وہ کہاں تک ادا کرتی ہے۔ بہ حالات ظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ چوں کہ امت

نے اپنی ذمہ داریوں کا پاس ولحاظ چھوڑ دیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی نظرِ عنایت اس سے پھیر لی ہے اور اسی بنا پر وہ آئے دن نت نئی مصیبتوں کا شکار ہوتی رہتی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الانفال: ۵۳)

''یہ اس لیے کہ اللہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو بخشی ہو، اس وقت تک ہرگز نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی روش کو نہ بدل دیں۔''

اللہ تعالیٰ کسی قوم کو محض نسل ونسب کی بنا پر محبوب نہیں رکھتا بلکہ ان کی محبوبیت اس کے اعمال کے تابع ہے اس لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ ایک قوم جو کسی خصوصی منصب پر سرفراز کی گئی ہو، اپنے فرض منصبی میں کوتاہی یا غفلت اختیار کرنے کے پاداش میں اس کی معتوب بن جائے اور عزت کے مقام سے ہٹا کر اس کو ذلت وخواری اور مصائب دنیا کے گڑھے میں ڈھکیل دیا جائے۔

پس مشکلات کے تصور سے گھبرا کر شہادت حق کی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کرنا دنیاوی نفع ونقصان کے لحاظ سے بھی کوئی مفید پہلو نہیں رکھتا بلکہ درحقیقت اس میں صرف گھاٹا ہی گھاٹا ہے کیوں کہ مشکلات ومصائب سے اس صورت میں بھی چارہ نہیں اور مزید خسران کی بات یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت وفرماں برداری کے ساتھ جو مصیبتیں پیش آتی ہیں وہ قانون ابتلاء کے تحت لطف وکرم کے ساتھ اور مزید لطف وکرم کے لیے ہوتی ہیں جس کو مصیبت زدہ بھی محسوس کرتے ہیں اس لیے ان کو مصیبتوں میں بھی راحت ملتی ہے اور اللہ کی نصرت ہر موقع پر ان کی دست گیری کے لیے موجود ہوتی ہے۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ (الحج: ۴۰)

''اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کریں گے۔ یقیناً اللہ زبردست اور غالب ہے۔''

اور اس کے برخلاف جو مصیبتیں اللہ کی نافرمانی کی سزا کے طور پر پیش آتی ہیں، ان میں اس کے لطف وکرم کی بہ جائے غیظ وعتاب شامل ہوتا ہے اس لیے قدرتی طور پر ان میں اضطراب وبے چینی زیادہ پائی جاتی ہے اور اللہ کی دست گیری بھی ساتھ نہیں ہوتی۔ اب ان دونوں قسم کی مصیبتوں کو سامنے رکھتے ہوئے آپ خود فیصلہ کریں کہ ان میں آپ کے لیے قابلِ ترجیح کون

ہے۔بہتر ہے اس موقع پر ایک حدیث بھی یاد دلائی جائے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پریشانی وراحت کے ایک عجیب نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

مَنْ جَعَلَ الهموم هماواحداً هم الآخرة كفاه الله هم الدنيا ومن تشعبت به الهموم احوال الدنيا لم يبال الله فی ایّ اودیتها ملک (ابن ماجہ وبیہقی)

"جوکوئی تمام فکروں پر ایک فکر آخرت کی فکر کو چھالے، اللہ دنیا کی فکروں کے سلسلے میں ان کے لیے کافی ہوجائے گا اور جس کو دنیا کے احوال مختلف گھاٹیوں میں لیے لیے پھریں اللہ کو اس کی پروانہیں ہوتی کہ وہ کس وادی میں ہلاک ہوتا ہے۔"

اس نکتہ کو ایک دوسری حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

من كانت نيّته طلب الآخرة جعل الله غناه فی قلبهٖ وجمع لهٗ شملهٗ واتتة الدنيا وهی راغمة ومن كانت نيّته طلب الدنيا جعل الله الفقربين عينيه وشتّت عليه امره ولا ياتيه منه الا كتب له (ترمذی، احمد، دارمی)

"جس کی نیت طلب آخرت کی ہوتی ہے اللہ اپنی بے نیازی اس کے دل میں کردیتا ہے اور اس کی شیرازہ بندی فرماتا ہے اور دنیا اس کے پاس رام ہوکر خود ہی آتی ہے اور جس کی نیت دنیا کی طلب کی ہوتی ہے اللہ فقر کو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کردیتا ہے اور اس کے معاملات زندگی کو انتشار کی نذر کردیتا ہے اور اس کو ملتا اتنا ہی ہے جتنا کہ اس کے لیے لکھ دیا گیا ہے۔"

(۳) شہادت حق کے تقاضوں کے ضمن میں تیسری اہم بات یہ ہے کہ شہادت حق کا فریضہ محض افراد کی انفرادی قولی وعملی کوششوں ہی کے ذریعہ ادا نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے اجتماعی کوشش بھی درکار ہے۔

انبیاء کرام نے جو ضابطۂ حیات پیش کیا ہے اس میں انسان کی انفرادی زندگی ہی کی درستگی پیش نظر نہیں رکھی گئی ہے بلکہ اس کا بہت کچھ حصہ اجتماعی معاملات ومسائل کی درستگی سے

متعلق ہے، کتنے احکام ہیں جن کے مخاطب افراد نہیں بلکہ اولی الامر یا مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی ہے اور ان احکام کا فائدہ اجتماع و معاشرہ کی اصلاح و تعمیر ہے بلکہ جو ہدایات بہ ظاہر انفرادی سیرت کی تعمیر یا انفرادی معاملات کی درستگی سے متعلق معلوم ہوتی ہیں ان پر بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں بھی اجتماع و معاشرہ کی اصلاح و درستگی کا مقصد پوری اہمیت کے ساتھ مدنظر رکھا گیا ہے۔ چناں چہ اسی بنا پر قرآن و احادیث میں وہ امور زیادہ اہم اور قابل توجہ ٹھہرائے گئے ہیں جن کا اچھا یا برا اثر معاشرہ و اجتماع پر پڑتا ہے اور ان کے سلسلے میں زیادہ سخت وعیدیں یا بشارتیں ہیں اور ان کے مقابلے میں وہ امور نسبتاً کم اہم سمجھے گئے ہیں اور ان پر کم وعیدیں یا بشارتیں بیان کی گئی ہیں جن کا نفع و نقصان بس افراد کی انفرادی برائیوں بھلائیوں تک محدود ہے۔ خود امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو جو یہ مقام عطا کیا گیا ہے کہ اس سے غفلت برتنے والے ایک ایسے عابد و زاہد کو بھی اس کی بستی والوں کے ساتھ تباہ کر دیا گیا جس نے حدیث ہی کے لفظوں میں ''چشم زدن کے برابر'' بھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی تھی، تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اور نیکیاں اجتماع و معاشرہ پر اس درجہ اثر انداز نہیں ہوتیں جتنا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ادائیگی و عدم ادائیگی اثر انداز ہوسکتی ہے۔ چناں چہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

مثل القائم فی حدودِ اللّٰہ والواقع فیھا کمثل قومٍ استھموا علیٰ سفینةٍ فصار بعضھم فی اسفلھا وصاربعضھم فی اعلاھافکان الذی فی اسفلھا یمر بالماء علی الذین فی اعلاھا فتاذوا بہ فاخذ فاسا فجعل ینقراسفل السفینة فاتوہ فقالوا مالک قال تاذیتم ولابدلی من الماء فان اخذواعلیٰ یدیہ انجوہ ونجوّا انفسھم وان ترکوہ اھلکوہ واھلکوا انفسھم (بخاری)

''وہ شخص جو اللہ کے حدود پر قائم ہو اور جو ان حدود کو توڑ رہا ہو، ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گروہ ہو جس نے شرکت پر ایک کشتی کو لے لیا ہو، تو کچھ لوگ اس کے

نیچے کے حصے میں ہو گئے ہوں اور کچھ اوپر کے حصے میں، تو نیچے کا ایک شخص پانی لے کر
اوپر والوں کے پاس سے گزرتا ہو تو اوپر والوں نے تکلیف محسوس کی اس پر اس شخص
نے کلہاڑا لے کر کشتی کے پیندے میں سوراخ کرنا شروع کر دیا تو وہ لوگ اس کے
پاس آئے اور پوچھا کہ یہ کیا ہے، کہا تمھیں زحمت محسوس ہوئی اور مجھے بہ ہر حال پانی
چاہیے تو اگر انھوں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تو اسے بھی نجات بخشیں گے اور
اپنے آپ کو بھی اور اگر اسے چھوڑ دیں گے تو اسے بھی ہلاک کر دیں گے اور اپنے آپ
کو بھی ہلاکت کی نذر کریں گے۔"

پس جب شریعت کی نگاہ میں معاشرہ و اجتماع کو یہ اہمیت حاصل ہے اور اس کے احکام اس طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے متعلق ہیں تو ظاہر ہے کہ جن کی نگاہ میں شریعت کا کچھ احترام و وقعت ہے وہ معاشرہ و اجتماع کی اصلاح و درستگی کے خیال سے خالی الذہن نہیں رہ سکتے اور اس بنا پر شریعت کے اس حصے کو بروئے کار لانا ناگزیر ہے جو بلاواسطہ اصلاح معاشرہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا تعلق بالواسطہ ہے ان میں بھی وہ اس کے اس پہلو کو پیش نظر رکھنے پر مجبور ہیں جن کا تعلق معاشرہ و اجتماع کی اصلاح و درستگی سے ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ خداوندی ضابطۂ حیات کا یہ اجتماعی حصہ گوناگوں وجوہ سے اس کے انفرادی حصے سے زیادہ اہم اور لائق توجہ ہے، اس حیثیت سے بھی کہ اس حصے کا مقصود اصلی بھی وہی ہے اور اس حیثیت سے بھی کہ در حقیقت اجتماع و معاشرہ ہی کی اصلاح و درستگی پر انفرادی درستگی اور اس کا قیام و بقا منحصر ہے، قرن اولیٰ کو تاریخ میں انفرادی صلاح و تقویٰ کی رو سے بھی جو مقام امتیاز حاصل ہے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس وقت اس ضابطۂ حیات کا یہ اجتماعی حصہ کم و بیش اپنی اصل شکل میں رائج و نافذ تھا اس لیے اس میں انفرادی صلاح و تقویٰ کو بھی پھولنے پھلنے کا پورا پورا موقع میسر تھا، بعد کو جب اسی حصے میں انحطاط و زوال طاری ہوا تو اس سے یہ دوسرا حصہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور جتنا جتنا یہ انحطاط بڑھتا گیا اتنا ہی انفرادی خرابیوں میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ جب اس کی جگہ بالکلیہ ایسے نظام اجتماعی نے لے لی جس پر اس کا پرتو بھی نہیں پڑا تھا تو یہ خرابیاں بھی اپنی انتہا کو پہنچ گئیں اور ایک عرصہ سے اسی قسم کا دور طاری ہے۔ پس اس وقت اگر شہادت حق کا کام انجام دینا

ہے تو ہمیں دین حق کے صرف اس جز کی تبلیغ وشہادت پر اکتفانہیں کرنا چاہیے جو انفرادی امور و معاملات سے متعلق ہے بلکہ اس کے اجتماعیات سے متعلق حصہ کی بھی شہادت دینی چاہیے، مثال کے طور پر اسلام نے معاشرت ومعیشت اور سیاست کے بارے میں جو اجتماعی نظام پیش کیا ہے ضرورت ہے کہ اس کو منظر عام پر لایا جائے بلکہ اس زمانہ میں تو اس کا یہ حصہ خاص طور سے زیادہ لائق توجہ ہے کیوں کہ اس دور کی ایک بڑی خصوصیت ہی یہ ہے کہ انفرادیت اجتماعیت میں گم ہوتی جارہی ہے اور اجتماعی معاملات ومسائل ہی فکر ونظر کی اصل جولان گاہ ہیں، اس لیے اگر اس حصے کو زمانہ حال کے لیے قابل تسلیم بنا کر پیش کیا جائے تو اسلام کی خوبی و برتری زیادہ اچھے طریقے سے نمایاں ہوسکتی ہے اور ساتھ ہی چوں کہ اجتماعی مسائل باوجود انتہائی کوششوں کے روز بہ روز الجھتے اور پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں یہاں تک کہ مختلف قسم کے ازموں کو آزما کر دنیا کچھ تھک سی گئی ہے اس لیے اس کا پیش کرنا وقت کی ایک اہم ترین ضرورت بھی ہے اور اس بنا پر یہ توقع بھی کی جاسکتی ہے کہ دنیا اب ہر زمانہ سے زیادہ اس کے اخذ وقبول کی طرف متوجہ ہوسکتی ہے۔

(۴) یہ ظاہر بات ہے کہ شہادت حق کا جو حصہ اجتماعی زندگی سے متعلق ہے اس کی شہادت افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں نہیں دے سکتے اس کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ہی ضرورت ہوگی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر ہر فرد نہ اس کے لیے تیار ہوسکتا ہے اور نہ اس کی صلاحیت رکھتا ہے چناں چہ اسی بنا پر خود شریعت نے بھی اگر چہ عمومی تواصی اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مکلّف تمام افراد کو بنایا ہے لیکن اس کی اصل ذمہ داری ایک خاص ادارہ کے سپرد کی ہے جو اس غرض کے لیے قائم کیا گیا ہو، جیسا کہ

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (آل عمران: ۱۰۴)

’’تم میں سے ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیے، جو خیر کی طرف دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔‘‘

سے واضح ہے اس لیے ہمیں اپنی انفرادی حیثیتوں میں اپنے فریضہ امر بالمعروف کو الگ الگ ادا کرنے کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش کرنی چاہیے کہ اس طرح کا کوئی اجتماعی ادارہ وجود میں

آجائے، جس کی ضرورت صرف اس لیے نہیں ہے کہ اس کے بغیر ایک طرف اجتماعی شہادت حق کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کا مسلمان باقی رہنا دشوار ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس لیے کہ جو باطل نظام تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے، اس کی موجودگی میں کسی مضبوط اجتماعی ادارہ کے بغیر جو مسلمانوں کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کی کوشش کرے، ان کا اپنی انفرادی زندگی میں بھی حق پر قائم رہنا دشوار ہے۔ بلکہ اس بنا پر بھی یہ ضروری ہے کہ دینی احکام و ہدایات اس کے بہ شدت متقاضی ہیں۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

انا امرکم بخمس اللّٰہ امرنی بھن الجماعة والسمع والطاعة والھجرة والجھاد فی سبیل اللّٰہ فانه من خرج من الجماعة قید شبر فقد خلع ربقة الاسلام عن عنقه الا ان یراجع ومن دعی بدعوی الجاھلیة فھو من جشی جھنم قالوا یارسول اللّٰہ وان صام وصلی قال وان صام و وصلی وزعم انه مسلم۔ (احمد و حاکم)

''میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے: جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور جہاد، کیوں کہ جو کوئی جماعت سے بالشت بھر بھی نکلا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا الّا یہ کہ وہ مراجعت کرے اور جو کوئی جاہلیت کی کوئی دعوت دے تو وہ جہنم کا کندہ ہے۔ صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے؟ فرمایا: اگرچہ وہ روزہ نماز ادا کرے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے۔''

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے:

لا اسلام لا بجماعة ولا جماعة الا بامارة ولا امارة الا باطاعة۔ (جامع بیان العلم)

''جماعت کے بغیر اسلام نہیں، امارت کے بدون جماعت نہیں اور اطاعت کے بغیر امارت نہیں۔''

بہ ہر حال اجتماعی شہادت کے لیے مقدم ضرورت ایک صالح جماعت کے قیام کی ہے جو امارت و طاعت کے رشتوں میں بندھی ہوئی ہو لیکن چوں کہ فی الحال اس قسم کی کوئی ایسی جماعت موجود نہیں ہے جسے تمام مسلمانوں نے اس غرض کے لیے قائم کیا ہو اس لیے اجتماعی اداءِ شہادت کی ادائیگی سے وہ قاصر ہیں اور ایسی حالت میں وہ اس کے مکلّف بھی نہیں ہو سکتے ہیں لیکن اس کے لیے جدوجہد کرنا ان کے فرائض میں داخل ہے، اس کے بغیر ان کی زندگی اسلامی زندگی نہیں کہی جا سکتی۔ اس مسئلے پر اس وقت کسی تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہے اس لیے کسی مناسب وقت اس مسئلے پر روشنی ڈالی جائے گی، البتہ جو لوگ اس کی تحقیق کے طالب ہوں وہ کم از کم مولانا ابوالکلام آزاد کے اس خطبہ کا مطالعہ فرمائیں جو انھوں نے اجلاس جمیعۃ العلماء منعقدہ لاہور ۱۹۲۱ میں بہ حیثیت صدر ارشاد فرمایا تھا، اس کے علاوہ تقسیم ہند سے پہلے بالخصوص تحریک خلافت کے زمانے کے لٹریچر کو اگر سامنے رکھ لیں تو اس سے ان شاء اللہ اس مسئلے کے بہت سے ضروری پہلو سامنے آ جائیں گے۔

(۵) شہادتِ حق کی جو حقیقت پہلے بیان کی گئی ہے اس کا ایک صریح تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنے انفرادی و اجتماعی اعمال و معاملات میں قومی و گروہی عصبیتوں سے بالکل بالاتر ہو کر صرف ان عالم گیر صداقتوں کی گواہی دیں جن کی گواہی ہر زمانہ میں خدا کے فرستادہ بزرگوں نے دی ہے بالفاظِ دیگر وہ ایک قوم بن کر دنیا کے سامنے نہ آئیں جس طرح کی دنیا میں دوسری قومیں پائی جاتی ہیں جن کا مدعا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے قومی دنیاوی عروج و ترقی کے لیے کوشش کریں اور دوسری قوموں پر ہر ممکن ذریعہ سے غلبہ و تفوق حاصل کریں بلکہ ان کو ایک اصولی جماعت کی حیثیت میں اپنے کو نمایاں کرنا چاہیے جس کا کام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ دنیا میں اپنوں اور بے گانوں سے قطع نظر کرتے ہوئے بے لاگ طور سے قسط و عدل قائم کریں۔ خود قرآن پاک میں ان کی یہی حیثیت متعین کی گئی ہے۔ چناں چہ فرمایا گیا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوا۟ قَوَّٰمِينَ لِلَّهِ شُهَدَآءَ بِٱلْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَـَٔانُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ۚ ٱعْدِلُوا۟ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ (المآئدہ:۸)

''اے ایمان لانے والو، اللہ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والے اور انصاف کے گواہ بنو اور تمھیں کسی قوم اور گروہ کی عداوت اس بات پر ہرگز آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو، یہی روش تقویٰ سے قریب ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، یقیناً اللہ ان تمام اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔''

اس آیت نے اس قوم پرستی کی جڑ کاٹ دی ہے جس میں کسی دوسری قوم کے ساتھ محض اس بنا پر دشمنی وعداوت برتی جاتی ہے کہ وہ ایک دوسری قوم ہے، مسلمان مسلمان رہتے ہوئے یہ حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، ایک دوسرے موقع پر انھیں اپنی قوم کی بے جا حمایت وحمیت کے جذبے سے بھی روکا گیا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (النسآء:۱۳۵)

''اے ایمان لانے والو، انصاف کو لے کر اٹھ کھڑے ہونے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، اگر چہ یہ گواہی خود تمھارے اپنے خلاف ہو یا والدین کے اور اعزہ کے خلاف ہو۔''

اس آیت کے ذریعہ سمجھنا چاہیے کہ قوم پرستی کا باقی ماندہ تسمہ بھی کاٹ دیا گیا، قوم پرستی دو ہی عنصروں سے ڈھلی ہے، غیروں سے عداوت اور اپنوں کی رعایت، ان دو آیتوں نے صراحتاً ان دونوں سے منع فرمایا ہے، اس لیے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان نہیں رہ سکتے اگر وہ اپنے کو عرف عام کے مطابق ایک قوم کا مرتبہ دے دیں۔ ان کی صحیح حیثیت شہداء اللہ فی الارض کی ہے، وہ دنیا میں قسط وعدل قائم کرنے کے ذمے دار ہیں اور ان کا یہ درجہ خود اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے، اس لیے انھیں اپنے کو اسی حیثیت میں ڈھالنا چاہیے۔ اس غرض کے لیے ضرورت ہے، اس بات کی کہ مسلمان از سر نو اپنے انفرادی واجتماعی معاملات کا جائزہ لیں، ان میں جو باتیں قوم پرستانہ تصور سے ہم آہنگ ہیں ان سے اپنی زندگی کو پاک کرنے کی کوشش کریں، اور اس کو پھر سے اس منصب کے مطابق استوار کریں جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کیا ہے، دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی ہم نے بہت سی غلط چیزیں اختیار کر لی تھیں ممکن ہے، وہ قومیں ان کے لیے اپنے پاس کوئی

وجہ جواز رکھتی ہوں لیکن مسلمانوں کے لیے وہ کسی حال میں جائز نہیں ہوسکتیں۔ ان کے پاس چیزوں کے صحیح یا غلط ہونے کا حقیقی پیمانہ موجود ہے، اس لیے ان کو ہر حال میں اسی چیز کو اختیار کرنا چاہیے جو اس پیمانہ پر ٹھیک اترتی ہو، اور یہ پیمانہ قرآن وسنت کا ہے۔

شہادتِ حق کے یہ چند ناگزیر تقاضے ہیں جن سے کسی حال میں مفر نہیں ہے۔ ان کے علاوہ اس کے اور تقاضے بھی ہوسکتے ہیں لیکن جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں ان میں ان کا ذکر غیر ضروری ہے، اس لیے فی الحال اتنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

شہادتِ حق کے فائدے

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہادتِ حق امتِ مسلمہ کا حقیقی فریضہ یا نصب العین ہے، جو قول و عمل اور انفرادی و اجتماعی دونوں دونوں حیثیتوں میں انجام دیا جانا چاہیے، اب ہم اس فصل میں اس نصب العین کے فوائد کی طرف بھی کچھ سرسری اشارات کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ ہماری دین و دنیا کی کتنی سعادتیں اس نصب العین کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس سے غفلت اختیار کر کے ہم نے اپنے کو کتنے خیر و برکت سے محروم کر لیا ہے۔

اس نصب العین کے دینی و دنیاوی فائدے اتنے زیادہ ہیں کہ ایک مختصر مقالہ میں وہ کسی طرح ضبطِ تحریر میں نہیں آ سکتے، اس لیے یہاں ہم صرف ان چند فوائد کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے جو بہ حالاتِ موجودہ مسلمانوں کے لیے اہم ہو سکتے ہیں، ان میں سے کچھ کی طرف پہلے بھی اشارے کیے جا چکے ہیں لیکن ہم یہاں ان کو اس طرح جمع کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ بیک نظر سامنے آ جائیں۔

انفرادی شہادتِ حق کے فائدے

سب سے پہلے انفرادی شہادتِ حق کے فوائد پر نظر ڈالیے۔

(۱) شہادتِ حق ہی اُس خوف و ہراس اور مایوسی کا اصل علاج ہے جس میں مسلمان تقسیم ہند کے بعد عام طور سے مبتلا ہو گئے ہیں اور جو اُن کے امراض میں، جیسا کہ گزر چکا

ہے، سب سے زیادہ اور جلد توجہ کے لائق ہے۔[1] یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ فریضۂ شہادتِ حق قلب مومن کے اس اندرونی احساس کا مظہر ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک

(۱) جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حالیہ الیکشن مسلمانوں کے لیے موجبِ سکون واطمینان ثابت ہوا ہے یا فی الواقع اس کے نتائج ان کے لیے موجبِ سکون واطمینان ثابت ہو سکتے ہیں، وہ ہمارے نزدیک انتہائی نادانی کا شکار ہیں، خوش گمانی سے کام لینا اچھی بات ہے اور ہم خود اسی پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن مذکورہ بالا خیال خوش گمانی نہیں ہے اسے یا تو سادہ لوحی کہیے یا ابلہ فریبی، جو کچھ ہوشیار لوگ مسلمانوں کی طفل تسلیوں کے لیے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ہندستان میں فرقہ پرستی کی بنیاد اتنی کمزور اور بودی نہیں ہے کہ وہ الیکشن کے معمولی جھونکوں سے اپنی جگہ چھوڑ دے، اس کی تردید کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے کہ الیکشن کے بعد بھی اس وقت تک مختلف مقامات پر فسادات ہو چکے ہیں جن کی بڑی وجہ جمعیۃ العلماء کی تحقیقاتی رپورٹوں اور ان کے ذمہ دار لیڈروں کے بیانات میں بھی یہی بتائی جارہی ہے کہ فرقہ پرست عناصر مسلمانوں سے اپنی شکست کا انتقام لے رہے ہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا انتقامی جذبہ جلد سرد پڑ جائے گا اور وہ جمہوریت کی بخشی ہوئی سہولتوں سے کام لے کر آئندہ کچھ اور نئے پیترے نہیں بدلیں گے۔ پھر الیکشن کے دوران میں فرقہ پرستی کے جو جراثیم آزادانہ پھیلائے گئے ہیں، وہ بہ جائے خود ایک طویل مدت کے لیے ہندستان کی فضا کو مسموم رکھنے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ اس پر مزید، الیکشن میں مسلمانوں کا عمومی طرزِ عمل بھی فرقہ پرستی کے باب میں ایک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی اکثریت نے ایک خاص پارٹی کی تائید وحمایت کر کے دوسری تمام پارٹیوں کو اپنا دشمن بنالیا ہے اور غضب یہ ہے کہ جن کی خاطر انھوں نے دنیا کی دشمنی مول لی ہے وہ بھی ان سے کچھ خوش نہیں ہیں جیسا کہ سمپورنانند جی جیسے ذمے دار کانگریسی وزیر کے بیان سے واضح ہوتا ہے، جس میں انھوں نے اس بنا پر مسلمانوں کو مشکوک اور غیر وفادار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے دوسری پارٹیوں کی بھی حمایت کی ہے، خاص کر مسلمان نمائندوں کی، شاید شاعر نے اسی طرح کے کسی موقع پر کہا تھا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

لیکن مسلمانوں کی بے بسی اور بے کسی ملاحظہ ہو کہ وہ اس تلخ تجربہ پر شاعر کے انداز میں کوئی بات کہنے کے قابل اپنے کو نہیں پاتے۔ اس کے جواب میں ان کے لیڈروں کے جو بیانات شائع ہو رہے ہیں ان کا لبِ لباب یہ ہے کہ ناحق مزاج برہم ہو گیا۔ ہم نے تو کانگریس کی حمایت میں کوئی کور کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کیا فی الواقع اصولی حیثیت میں یا عملی تجربوں کی روشنی میں الیکشن کے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ ہر صورت میں حالات کا صحیح عکس ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں وہی لوگ دے سکتے ہیں جو نہ جمہوریت کی حقیقت سے واقف ہیں اور نہ ہندستان کے اس پہلے جمہوری تجربہ کی صحیح حقیقت ان کی نگاہ میں ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی، تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ

باقی اگلے صفحہ پر

کی طرف سے اس بات کا مکلّف قرار دیا گیا ہے کہ دنیا میں نیکیاں پھیلائے اور برائیوں کو دور کرے اور یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ یہ فریضہ، دین کے ضروری علم اور اللہ کے ساتھ ایک خصوصی لگاؤ کے بغیر ادا نہیں کیا جاسکتا، اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ جب کوئی شخص اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے آمادہ ہوگا اس کے اندر ایمان باللہ اور اعتماد علی اللہ ایک معتد بہ مقدار میں ضرور پایا جائے گا اور یہ معلوم بات ہے کہ اس ایمان واعتماد کے بعد دل میں کسی ماسوا اللہ کے خوف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

ولا یخشون احداً الا اللّٰہ

''اور وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔''

اور نہ اس میں کسی حال میں مایوسی کا گزر ہوسکتا ہے جیسا کہ اس سے پہلے تفصیل کے ساتھ واضح کیا جاچکا ہے۔

(**پچھلے صفحہ کا بقیہ**) الیکشن نے ہفتہ دو ہفتے کے اندر ایک طرف فرقہ پرست عناصر کی قلبِ ماہیت کردی اور دوسری طرف کانگریس کو ایک نئے قالب میں ڈھال دیا جس کو فرقہ پرستی کی ہوا بھی نہیں لگی ہے؟ کیا فی الواقع کانگریس بدل گئی ہے؟ اور اس کے کرتا دھرتا بلکہ الیکشن میں کامیاب ہونے والے اس کے ممبران زیادہ تر وہی نہیں ہیں جو پہلے سے اس میں شامل تھے، پھر یہاں کے حالات چشم زدن میں مسلمانوں کے لیے موجب اطمینان وسکون کس طرح ہوسکتے ہیں؟

ہاں الیکشن کے نتائج کا ایک پہلو کچھ ضرور اہمیت رکھتا ہے یعنی یہ کہ بعض صوبوں میں کمیونزم کو کام یابی ہوئی ہے اور سمجھا یہ جاتا ہے کہ کمیونزم فرقہ پرستی کا قاطع ہے چناں چہ اس بنا پر بعض چوٹی کے مسلمان اخبارات اس کام یابی پر بغلیں بجا رہے ہیں لیکن اس بات سے قطع نظر کہ ہندستانی کمیونزم میں فرقہ پرستی کا کوئی عنصر شامل ہے یا نہیں، ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کیا مسلمانوں کی موجودہ بے اطمینانی محض اپنا جسمانی وجود برقرار رکھنے یا دو وقت کی روٹی ہی کے لیے ہے اور اس میں ضیاعِ دین وایمان کا کوئی اندیشہ شامل نہیں ہے؟ جواب اثبات میں ہے تو کمیونزم کی کام یابی مسلمانوں کے لیے موجبِ اطمینان کس طرح کہی جاسکتی ہے جب کہ کمیونزم کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ جس ملک میں اس کو فروغ حاصل ہوا، دین واخلاق کا جنازہ نکل گیا اور وہ تمام لوگ سولی کے تختوں پر لٹکا دیے گئے جن کو روٹی کی بہ جائے دین واخلاق عزیز تھا بجز اس دین یا علم بردارانِ دین کے جو اپنے اندر اتنی لچک رکھتے تھے کہ کمیونزم کا ہر اصول دین کا اصول بن جائے اور دین کے علم بردار کمیونزم کے اصولوں کو عین دین وایمان قرار دے کر ان کی تبلیغ واشاعت پر کمر بستہ ہوجائیں۔ تو کیا یہی وہ بات ہے جس پر مسلمان خوش ومطمئن ہوسکتے ہیں؟

(۲) شہادتِ حق ایک مسلمان کے لیے نصب العین کی حیثیت رکھتی ہے اور کسی نصب العین سے وابستہ ہونے کے چند فائدے بالکل نمایاں ہیں۔

(الف) جمود وخمود ختم ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ حرکت وعمل اور سعی وجہد لے لیتی ہے۔

(ب) زندگی نظم وضبط کی پابند ہوجاتی ہے، ہر قول وعمل نصب العین کے سانچے میں ڈھل کر نمایاں ہوتا ہے۔

(ج) نصب العین کے ساتھ تعلق وعشق کے مطابق ایثار وقربانی کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔

(د) نصب العین کے حصول کی راہ میں جو مصیبتیں اور پریشانیاں بھی پیش آتی ہیں، ان کے تحمل کی قوت پیدا ہوتی ہے بلکہ ان میں ہی راحت ملنے لگتی ہے، یہ فائدے کسی خاص نصب العین کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ یہ بلا امتیاز کم و بیش ہر نصب العین کے ساتھ پائے جاسکتے ہیں، لیکن شہادت حق کو نصب العین بنانے کی صورت میں یہ نسبتاً زیادہ بہتر اور اکمل شکل میں حاصل ہوتے ہیں کیوں کہ اس نصب العین کا منشا و مآل صرف خوشنودیِ رب اور خوفِ آخرت ہے، کوئی دنیاوی غرض اس میں شامل نہیں ہوتی ہے اور چوں کہ جو شخص اس نصب العین کو اختیار کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہوتا ہے کہ آخرت کی زندگی دنیاوی زندگی کے مقابلے میں زیادہ ''خیر وابقیٰ'' ہے۔ اس لیے کسی دنیاوی مقصودِ زندگی کے مقابلے میں جس کا فانی اور ناپائدار ہونا ایک امرِ واضح ہے، اِس مقصد کے حصول کا جذبہ زیادہ قوی اور پائدار ہوتا ہے۔

ایسا شخص صرف اپنے نفس کی نگرانی ہی کے تحت کام نہیں کرتا بلکہ اللہ کو حاضر وناظر جان کر وہ خود اپنے نفس کا احتساب کرتا رہتا ہے، اس لیے وہ دانستہ اپنے کسی قول وعمل کے سلسلے میں نفس کے ساتھ کوئی بے جا رعایت برتنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

وہ اپنی جان و مال سب کچھ اللہ کے ہاتھ پہلے ہی فروخت کرچکا ہوتا ہے، اس لیے اپنے نصب العین کے لیے کسی بڑے سے بڑے نقصان کو وہ نقصان نہیں سمجھتا۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ

(التوبہ:۱۱۱)

''یقیناً اللہ نے اہل ایمان سے ان کے جان و مال کو خرید لیا ہے اس معاوضہ میں کہ ان کے لیے جنت ہے۔''

جان بھی دینی ہو تو وہ اس پر خوش ہوتا ہے بلکہ پچھتاتا ہے کہ اس سے بڑی کوئی اور چیز اس کے پاس نہیں ہے، جسے دے کر وہ اپنا حقِ بندگی ادا کرتا۔

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے، کہ حق ادا نہ ہوا

ظاہر ہے، کسی ذاتی یا قومی و ملکی عزت و سربلندی کے نصب العینوں کے ساتھ یہ جذبات پیدا نہیں ہوسکتے، اس لیے اسی نسبت سے ان کے ان تقاضوں میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

(۳) شہادتِ حق ان تمام خطرات کا علاج ہے جو تقسیم ہند کے بعد خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے دین و ملّت کو لاحق ہوگئے ہیں، یہ خطرات اندرونی بھی ہیں اور بیرونی بھی اور ان دونوں کا علاج شہادتِ حق ہی کے ساتھ وابستہ ہے، کیوں کہ یہ خطرات تمام تر دین کے جہل اور اللہ کے ساتھ تعلق کی کمی کا نتیجہ ہیں، جب یہ چیزیں شہادت حق کو اپنانے کے ساتھ دور ہو جائیں گی تو یہ خطرات بھی خود بہ خود کافور ہو جائیں گے۔ اندرونی خطرات میں اہم تر خطرات، انتشار و اختلاف، باہمی بغض و حسد، دین و ملّت کے تقاضوں سے بے پروائی، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ملّت فروشی اور ارتداد ہیں۔ قرآن مجید میں اہل کفر و نفاق کا خاصہ بتایا گیا ہے:

تَحْسَبُھُمْ جَمِیْعًا وَّ قُلُوْبُھُمْ شَتّٰی (الحشر:۱۴)

''تم ان کو مجمع خیال کرتے ہو حالاں کہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔''

اور اس کے برعکس مسلمانوں کی حقیقت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (الحجرات:۱۰) ''مومن تو بھائی بھائی ہی ہوتے ہیں۔''

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (الفتح:۲۹)

''محمد اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں اہل کفر کے مقابلے میں سخت اور باہم مہربان ہیں۔''

اور حدیثوں میں ان کے اتفاق ومودت کی تفسیر مثالی پیرایوں میں یوں سمجھائی گئی ہے:

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضا ثم شبک بین اصابعه (متفق علیہ)

''مؤمن مؤمن کے لیے عمارت کی مانند ہوتا ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے۔ پھر آپ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈال کر دکھایا کہ اس طرح۔''

المؤمنون کرجل واحدان اشتکیٰ عینه اشتکیٰ کله وان اشتکیٰ راسه اشتکیٰ کله۔ (مسلم)

''سب مومن ایک شخص کی طرح ہیں کہ اگر اس کی آنکھ دکھتی ہے تو اس کا کل بدن تکلیف محسوس کرتا ہے اور اگر اس کا سر درد کرتا ہے تو سارے بدن کو تکلیف ہوتی ہے۔''

تری المؤمنیں فی تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم کمثل الجسداذا اشتکیٰ عضو تداعیٰ له سائرالجسد بالسهروالحمیٰ (متفق علیہ)

''تم اہل ایمان کو باہم مہربانی، دوستی اور شفقت کرنے میں ایک بدن کی طرح دیکھو گے کہ جب کوئی عضو بیمار ہوتا ہے باقی تمام بدن جاگ کر اور بخار میں مبتلا ہو کر اس کا ساتھ دیتا ہے۔''

چناں چہ اسلام کے روشن ترین دور میں مودت و اتفاق کی یہی روح اسلامی معاشرہ میں عملاً جاری تھی، خود قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بہ طور نعمت اس کا اظہار فرمایا ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ (آلِ عمران:۱۰۳)

"اورسب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ و اور پھوٹ نہ ڈالو اور اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے تو اللہ نے تمھارے دلوں میں الفت پیدا کر دی۔ پس تم اللہ کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو تم کو اس سے نجات دی۔"

لیکن یہ کیفیت محض اتحاد و اتفاق کا وعظ کہنے سے پیدا نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ درحقیقت اسلامی تعلیمات اور ان پر عمل پیرا ہونے کا صدقہ تھا، چناں چہ اسی بنا پر قرآن مجید میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾ (الانفال: ۶۳)

"اسی نے تجھ کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا اور ان کے دلوں میں الفت ڈال دی، اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تو بھی ان کے دلوں میں الفت نہ ڈال سکتا، لیکن اللہ نے ان میں الفت ڈال دی۔ بے شک وہ زور آور اور حکمت والا ہے۔"

اس لیے اس زمانے میں بھی یہ چیز اگر پیدا ہو سکتی ہے تو اسی راہ سے، اس کے ماسوا تمام تدبیریں بے کار ہیں، ان سے اگر کوئی فائدہ پہنچے گا بھی تو نہایت تھوڑا اور وقتی، جو ان کو خطرات سے نجات دینے کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح ملت فروشی یا ارتداد وغیرہ کی جو وبا پھوٹ پڑی ہے اس کی علت بھی یہی ہے کہ ایک طرف ان میں مبتلا ہونے والے یا تو دین کا علم نہیں رکھتے یا علم رکھتے ہیں تو اس پر یقین و اذعان سے محروم ہیں اور دوسری طرف عام مسلمانوں کی اکثریت خود بھی کچھ اسی طرح کی حالت میں مبتلا ہے، اس لیے وہ ان کے لیے کوئی خاص روک نہیں بن سکتی، اس کے برعکس اگر مسلمان اپنے دین سے صحیح معنوں میں واقف ہو جائیں اور اس کے ساتھ ان کو اتنا لگاؤ پیدا ہو جائے کہ اسے بہ طور نصب العین کے اپنا مقصدِ زندگی بنا لیں تو ان باتوں کا شائبہ بھی ان میں باقی نہیں رہ سکے گا۔ کیوں کہ یہ باتیں صفات ایمانی کی ضد ہیں، جو ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں

چناں چہ قرآن پاک میں مومن کے اوصاف میں ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ علم برادرانِ کفر کے مقابلے میں بہت سخت ہیں۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (المائدہ:۵۴)

''اہل ایمان کے مقابلے میں نرم، اہلِ کفر کے مقابلے میں سخت۔''

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح:۲۹)

''وہ اہل کفر کے مقابلے میں سخت ہیں۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایمان کسی قلب میں جاگزیں ہوجاتا ہے تو وہ آسانی کے ساتھ اپنے دشمنوں کا آلہ کار نہیں بن سکتا بلکہ وہ اپنی دینی صلابت کے ذریعے مخالفین کا بھی منہ پھیر دیتا ہے۔ اس سے اس بات کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آج ہندستان میں مسلمانوں کو جو بیرونی خطرات درپیش ہیں، ان کے ازالہ کے لیے ان ایمانی صفات کی کتنی ضرورت ہے، حقیقتاً صرف ان کے ذریعے ہی ان کا ازالہ ہوسکتا ہے لیکن یہ یاد رکھیے کہ یہ صفات، ایمان ایمان کی رٹ لگانے سے پیدا نہیں ہوسکتیں، یہ شعوری ایمان کے خاصے ہیں اور اس کے لیے خاصے اہتمام کی ضرورت ہے، خود ان آیات میں مومنین کے جو، دیگر اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (الفتح:۲۹)

''تم ان کو رکوع کرتے اور سجدہ ریز ہوتے دیکھو گے۔ وہ محض اللہ کا فضل اور اس کی خوش نودی چاہتے ہیں۔''

سمجھنا چاہیے کہ یہ ان صفات کے لیے ایک گونہ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اگر یہ نہیں ہیں تو اس سے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہوگیا، لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ان کے بغیر اس میں وہ صلابت وسختی پیدا نہیں ہوسکتی جو دین پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ وہ کسی معمولی ڈر یا فائدہ کے لیے ازخود اسلام کا قلادہ اتار پھینکے۔

(۴) شہادتِ حق کو بہ طور مقصد اپنانے کا ایک نہایت اہم اور زبردست فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے افراد میں وہ خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جو اسلامی اجتماعیت اور ایک صالح

اسلامی معاشرہ کے لیے بنیاد کا کام دیتی ہیں۔ معاشرہ کی تعمیر کے لیے افراد اینٹ پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی فکری عملی اور اخلاقی صلاحیتیں چونے گارے کی، تعمیر کے یہ اجزاء جتنے اچھے ہوں گے اتنی ہی اچھی اور مضبوط عمارت تعمیر ہوگی اور جس قدر ان میں خرابی و کم زوری ہوگی اسی قدر عمارت بھی ناقص اور کم زور تیار ہوگی۔

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ، تعمیر نہ کر

آج مسلمانوں میں سرے سے کوئی اجتماعیت نہیں پائی جاتی اور اگر ان کو وجود میں لانے کے لیے کوئی کوشش عمل میں لائی جاتی ہے تو اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ نہ اس عمارت کے لائق اس کی بنیادوں کے لیے ضروری سروسامان موجود ہے اور نہ ہی اس کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کی کوئی فکر و اہتمام ہے اگر کچھ لوگ اس کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں تو جو گلا سڑا میٹریل ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے اسی کو وہ الٹے سیدھے چن کر اس پر دیواریں اور چھتیں قائم کرنی شروع کر دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہوا کے معمولی جھونکوں کو بھی وہ برداشت نہیں کر سکتیں اور زمین سے آلگتی ہیں جیسا کہ اس سے پہلے متعدد بار اجتماعی تحریکات کے ضمن میں تجربہ کیا جا چکا ہے۔ پس اگر اجتماعیت کوئی ناگزیر ضرورت ہے اور اس پر مسلمانوں کی اجتماعی فرائض کی ادائیگی ہی نہیں بلکہ ان کے ملی وجود کے بقاء و تحفظ کا بھی دارمدار ہے تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کے افراد کو آئندہ اس طرح تیار کیا جائے کہ وہ اس عمارت کے لیے اچھی بنیاد اور مضبوط ستون کا کام دے سکیں اور یہ مقصد اسی طور سے حاصل ہوسکتا ہے کہ مسلمان شہادت حق کو بہ طور مقصد زندگی کے اختیار کریں۔

کسی اجتماعیت کے لیے سمع و اطاعت، احساس ذمہ داری، قربانی و ایثار پیشگی، عفو و مسامحت، ہم دردی و ملاطفت، شعور و تمیز اور ان میں اعتدال اخلاق و کردار اور ان میں ہم آہنگی وغیرہ نہایت ضروری اوصاف ہیں۔ اور یہ باتیں شہادت حق کو بہ طور مقصدِ زندگی کے اختیار کرنے سے حاصل ہوسکتی ہیں بہ شرطے کہ یہ محض زبانی نہ ہو بلکہ دل و دماغ کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوچکی ہو اور اس کا سادہ مفہوم ہی ذہن میں نہ ہو، جو اس زمانہ میں عام طور سے رائج ہے، بلکہ اس

سے وہ حقیقی شہادتِ حق مراد ہو، جس کی تشریح اوپر گزر چکی ہے اور یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ اس مقصد کے لیے وہ اخلاق وصفات کچھ زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتے ہیں۔ جن کی پرورش و پرداخت کا کام ہماری اس وقت کی خانقاہیں انجام دے رہی ہیں، ان خانقاہوں کے سامنے سرے سے اجتماعیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا۔ محض انفرادی سیرت کی تعمیر ان کے پیش نظر ہوتی ہے اور وہ بھی دین و دنیا کی تفریق کے تصور کے ساتھ اس لیے ان کارخانوں سے جو کل پرزے ڈھل کر تیار ہوتے ہیں، وہ اپنی جگہ کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں، لیکن وہ کسی اجتماعی مشنری کا پرزہ نہیں بن سکتے۔

(۵) شہادت حق ایسے نصب العینوں کے مقابلے میں جن کا مقصد ذاتی یا قومی وملکی فوائد کا حصول ہو زیادہ اعلیٰ و پاکیزہ مقصد ہے، کیوں کہ یہ خالص نیکی کے جذبہ کے ساتھ اور نیکی کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اس لیے قدرتی طور پر اس کے ذریعہ اچھے جذبات پرورش پاتے ہیں اور چوں کہ کائنات کا نظام بھی خیر وعدل ہی کے محور پر گردش کرتا ہے اس لیے اس مقصد کو اپنانے اسے اس کے ساتھ قدرتی طور پر ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جو کسی نصب العین کے باعث خیر ہونے کی پہلی شرط ہے ورنہ وہ نصب العین لامحالہ دوسرے افراد یا دوسرے گروہوں اور قوموں کے لیے مضر اور تباہ کن ثابت ہوگا جیسا کہ اس طرح کے مقاصد کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

(۶) انفرادی شہادت حق کا آخری اور سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ یہ رحمتِ ایزدی کو اپنی طرف مائل کرنے کا اوّل وآخر وسیلہ یہی ہے، یہ پہلے گزر چکا ہے کہ شہادتِ حق مسلمانوں کی سب سے بڑی بلکہ اصلی دینی ذمہ داری ہے اور اس امت کو جو مقام شرف وامتیاز بھی حاصل ہوا ہے وہ اسی شہادت کے طفیل میں ہے، اس لیے خدا ان سے اسی وقت تک راضی رہ سکتا ہے، جب تک وہ اپنے اس فرض منصبی کو ادا کرتے رہیں ورنہ اُن میں اور دنیا کی کسی دوسری قوم میں کوئی ایسا امتیازی فرق باقی نہیں رہ جاتا، جس کی بنا پر وہ کسی خصوصی رعایت ونصرت کے مستحق ہوں پھر اس کی نگاہ میں سب برابر ہیں، بلکہ یہ لوگ اور زیادہ مستحق عتاب ہیں کہ ان کے ذمہ ایک خصوصی کام کیا گیا، لیکن اس سے عہدہ برآ ہونے میں انھوں نے غفلت وکوتاہی برتی، اس کے اندازہ کے لیے سورۂ مائدہ کی حسب ذیل آیت اپنے سامنے رکھیے جو اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے اور خود اپنے الفاظ کے اشاروں سے شہادتِ حق میں کوتاہی پر ایک زبردست سرزنش کی حیثیت رکھتی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾ (المآئدہ:۵۴)

''اے ایمان والو، جو کوئی تم میں سے پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ عنقریب ایسی قوم کو لائے گا کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں، مسلمانوں پر نرم دل ہیں، کافروں پر زبردست ہیں، اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، اور کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے، یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ کشائش والا اور خبردار ہے۔''

اجتماعی شہادت حق کے فوائد

انفرادی شہادتِ حق کے فوائد کے بعد ایک نظر اجتماعی شہادت کے فوائد پر بھی ڈال لیجیے، ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر آئندہ مسلمانوں کو یہ توفیق حاصل ہو سکی کہ وہ اجتماعی شہادتِ حق کو ادا کرنے کے لیے تیار ہو سکے تو اس کے فوائد انفرادی شہادت کے فوائد سے کہیں زیادہ اہم اور قیمتی ثابت ہوں گے۔

(۱) انفرادی شہادت حق کے جو فوائد اوپر بیان ہوئے ہیں وہ اجتماعی شہادت کے بعد بہ درجۂ اتم پورے ہونے لگیں گے۔ اجتماعی شہادت قدرتی طور پر ایک ایسا ماحول پیدا کر دے گی جس میں انفرادی شہادت زیادہ سہل و آسان ہو جائے گی اور زیادہ پھول پھل سکے گی اس لیے اسے جس قدر وسعت حاصل ہوگی اسی نسبت سے اس کے فوائد کا دائرہ بھی زیادہ وسیع ہو جائے گا۔

(۲) انفرادی شہادت میں جو فوائد افراد کو حاصل ہوتے ہیں اجتماعی شہادت کی صورت میں وہی فوائد اجتماع کو حاصل ہوں گے۔ مثال کے طور پر اگر انفرادی شہادت، افراد کے خوف و ہراس اور مایوسی کا علاج ہے تو اجتماعی شہادت سے یہ فائدہ اجتماع کو اس شکل میں حاصل ہوگا کہ بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں کی قومی زندگی آج جس خوف و ہراس اور مایوسی کی پالیسی پر مبنی ہے وہ یکلخت بدل جائے گی اور از سر نو اس کی بنیاد حوصلہ، جوش اور اعتماد پر قائم ہوگی، جس سے مسلمان بہ حیثیت قوم فائدہ اٹھائیں گے۔

(۳) اس کا اثر بہ راہِ راست ان کے موجودہ قومی مسائل پر پڑے گا، اور اس سے ان کو گونا گوں دینی و دنیاوی فائدے پہنچیں گے۔ مثلاً شہادت حق کو اپنا اجتماعی نصب العین مقرر کر لینے کے بعد ان کی آئندہ اجتماعی جدوجہد، قوم پرستانہ تخیل کی بہ جائے ان ہمہ گیر انسانی اصولوں پر قائم ہوگی جو اسلام پیش کرتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس سے نہ صرف وہ قومی کش مکش ختم ہوجائے گی جو قوم پرستانہ تخیل کی پیداوار ہے بلکہ اس کی جگہ وہ اعتماد اور جذبۂ خیر سگالی پیدا ہوجائے گا جو ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں دونوں کی بقا و ترقی کے لیے ناگزیر ہے بلکہ یہ امید بھی کی جاسکتی ہے کہ اگر ٹھیک ٹھیک اس نصب العین کے مطابق کام کیا جائے تو مسلمان جو اس وقت اپنے قوم پرستانہ تصور کے ماتحت ایک حقیر قوم یا بے وزن اقلیت بن کر رہ گئے ہیں جس میں حالات کے دباؤ کے تحت روز بہ روز گھٹاؤ کا عمل بھی جاری ہے، آئندہ وہ صرف اقلیت نہ رہیں بلکہ یہاں کی غالب قوم بن جائیں اور اسلام کے پیش کیے ہوئے اصول ہی یہاں کے حکم راں اصول ہوں۔ مسلمان اپنے کو اگر صرف ایک قوم ہی سمجھتے رہیں تو یقیناً ہندستان میں ان کے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کا کوئی امکان نہیں ہے، بلکہ اپنی موجودہ حیثیت کو برقرار رکھنا بھی ان کے لیے دشوار ہے، کیوں کہ اس سے دوسری قوموں کی قوم پرستی کے جذبات بھڑکتے ہیں اور وہ ان کو خطرہ سمجھ کر ان کو نگل لینے کے لیے آمادہ ہوجاتی ہیں لیکن اگر وہ ایک اصولی پارٹی بن جائیں جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں اور جس کی بنا پر ان کو حزب اللہ یا شہداء اللہ فی الارض کا خطاب عطا کیا گیا ہے تو آئندہ یہاں قومیت کی بنیاد پر مسلم و غیر مسلم کی کوئی کش مکش باقی نہیں رہے گی، کش مکش اگر ہوگی تو اصولوں کے درمیان ہوگی اور ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ اسلام کے اصولوں کو اگر مناسب طریقوں سے پیش کیا گیا اور یہاں کے باشندوں کو کسی مناسب ماحول میں ان پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا موقع ملا تو یقیناً وہ ان پر توجہ کریں گے اور دوسرے اصولوں کے مقابلے میں، جن کے تجربے دنیا کے لیے مایوس کن ثابت ہو رہے ہیں، وہ ان کو قابلِ ترجیح خیال کریں گے، اس طرح یقین رکھنا چاہیے کہ اجتماعی شہادتِ حق کا فائدہ صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں ہوگا، ہندستان کو بھی اس سے حصہ ملے گا بلکہ اس کا دائرہ اس سے بھی وسیع ہوسکتا ہے اور اس کی وسعت پوری دنیا کو عام ہوسکتی ہے۔

(۴) اجتماعی شہادتِ حق کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ درحقیقت اسلام کی صحیح حیثیت، اجتماعی

شہادت حق ہی کے ذریعہ نمایاں ہوسکتی ہے، اسلام کی جو خوبیاں انفرادی سیرت وکردار سے نمایاں ہوتی ہیں اوّل تو منتشر حالت میں ہونے کی وجہ سے ان پر دنیا کی نگاہیں نہیں جمتیں اور دوسرے درحقیقت وہ اس کی خوبیوں کا نہایت معمولی حصہ ہیں، اسلام کا اصل جوہر درحقیقت اس کا اجتماعی نظام ہی ہے، جو صرف اجتماعی شہادت کے ذریعہ ہی رونما ہوسکتا ہے اس لیے یقیناً دنیا میں اسلام اپنی صحیح شکل میں اس وقت تک نمایاں نہیں ہوسکتا جب تک اجتماعی شہادت کا بندوبست نہ کیا جائے اور یہ مسلمانوں کا فرض منصبی ہے پس اجتماعی اداءِ شہادت ایک خالص دینی ذمے داری بھی ہے اور اس کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ اس فرض سے ہم عہدہ برآ ہوسکیں۔

انفرادی واجتماعی شہادتِ حق کے یہ چند فوائد ہیں جو سرسری انداز میں آپ کے سامنے پیش کردیے گئے ہیں۔ ان پر آپ غور کریں اور اگر یہ آپ کے نزدیک اہم ہوں تو ان کے حاصل کرنے کی فکر و بندوبست کریں، رہے اس کے دیگر فوائد تو اس کے لیے یہ مختصر صفحات کافی نہیں ہوسکتے اور اس کے لیے کسی قدر اطمینان کی بھی ضرورت ہے، البتہ اگر آپ خود ان کو معلوم کرنے کے درپے ہوں، تو اس کی ایک نہایت سہل اور آسان تدبیر میں آپ کو بتائے دیتا ہوں، اس سے فائدہ اٹھائیں شہادتِ حق کے فائدوں کے بہت سے گوشے ازخود آپ پر روشن ہوجائیں گے اور وہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا اور اس کے حالات وکوائف سے قطع نظر کرکے آپ اپنی نگاہوں کے سامنے ایک ایسے معاشرہ کا منظر لے آیئے جس کا عموماً ہر ہر فرد اور بہ حیثیتِ مجموعی پورا معاشرہ ان احکام وہدایات کا تاحدِّ امکان پابند ہو جو قرآن مجید یا احادیث میں دیے گئے ہیں اور پھر دیکھیے کہ یہ معاشرہ اور اس کے افراد اپنے اعمال وکردار میں کیسے کچھ ہوسکتے ہیں، اور ایسے معاشرہ وافراد کے ذریعہ کیا کچھ خیر وبرکت ان کے لیے ان کے پڑوسیوں کے لیے اور ان سے گزر کر آس پاس کے ملکوں کے لیے اور پھر پوری دنیا کے لیے ظاہر ہوسکتی ہے، بہت سی یہ برکات تو ایسی ہوں گی کہ شاید وہ تعبیر کی متحمل ہی نہ ہوسکیں اور جو اس قابل ہیں کہ بیان کی جائیں ان کے بیان کے لیے ممکن ہے الفاظ ناکافی ثابت ہوں۔ اور آخر میں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ آپ اس طرح کا جو نقشہ اپنے ذہن کے سامنے لائیں گے وہ نرا ذہنی نقشہ نہیں ہوگا بلکہ دنیا نے اس طرح کے نقشے متعدد بار عالم وجود میں بھی دیکھے ہیں جن میں ایک نقشہ ان میں سب سے کامل تر وہ بھی تھا جو آں حضرت صلی

اللہ علیہ وسلم کی مبارک کوششوں کے ذریعہ عرب کی سرزمین میں عملاً نمودار ہوا تھا۔ اگر آپ چاہیں تو تخیل پر زور دے کر کوئی فرضی نقشہ بنانے کی بہ جائے اس واقعی نقشہ کو سامنے رکھیں۔ اس کے آئینے میں آپ کو انفرادی اور اجتماعی شہادت حق کے ہر طرح کے نمونے اور ان کے فوائد وثمرات پوری تفصیل کے ساتھ نظر آجائیں گے۔

موجودہ مشکلات

اب تک جو مباحث گزرے ہیں ان سے غالباً ایک حد تک یہ واضح ہو چکا ہوگا کہ مسلمانوں کا حقیقی مقصد و نصب العین کیا ہے اور اس کے تقاضے اور فائدے کیا کیا ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ہم کچھ وقت مشکلات و موانع کا جائزہ لینے میں صرف کریں کیوں کہ اس کے بغیر منزل کی طرف قدم اٹھ نہیں سکتا، یہ مشکلات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو بنیادی اور دائمی ہیں۔ یعنی جب بھی اس کام کا عزم کیا جائے گا وہ لازمی طور سے پیش آئیں گی۔ اور دوسری مشکلات وہ ہیں جو مخصوص حالات کی پیداوار ہیں۔ ہم یہاں اس دوسری قسم کی مشکلات سے بحث کرنی چاہتے ہیں کیوں کہ قدم اٹھانے میں اس وقت عملاً سب سے پہلے ان سے سابقہ پیش آئے گا اور دراصل یہی موانع اس وقت اس بات کا باعث بنے ہوئے ہیں کہ بہت سے لوگ اس نصب العین کا نام لینے کی جرأت نہیں کرتے اور اس کو چھوڑ کر غیر دینی سیاسیات و تحریکات اختیار کرتے جا رہے ہیں اور جو لوگ غیر دینی تحریکات کو پسند نہیں کرتے وہ بھی کام کے امکانات سے مایوس ہیں اور اس لیے عزلت نشیں ہوتے جا رہے ہیں۔

مشکلات و موانع کے یہ نتائج نہایت افسوس ناک اور ملت کے لیے تباہ کن ہیں اس لیے ہمیں بہ ہر صورت ان کا جائزہ لے کر ان کے ازالہ کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

یوں تو یہ موانع بہت زیادہ ہیں لیکن چوں کہ تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے اس لیے سر دست ہم صرف اہم اور بنیادی موانع تک ہی اپنی گفتگو کو محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

(۱) دین سے ناواقفیت

سب سے بڑی چیز اسلام سے ناواقفیت ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت بحمداللہ اب بھی دین کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک لگاؤ رکھتی ہے، لیکن اس کے ساتھ اس امر واقعی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام کے بارے میں اس کا علم بہت تھوڑا اور ناقص ہے۔

کچھ ایسے لوگ ہیں جو محض اس لیے مسلمان ہیں کہ کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے سے اسلام کے بارے میں کچھ مجمل معلومات ان کے کانوں میں پڑ گئی ہیں، وہ انہی پر قانع ہیں۔ ان سے زیادہ کچھ معلوم کرنے یا ان معلوم باتوں کی حقیقت سمجھنے کی بھی ان کو کوئی فکر نہیں ہے، نتیجہ یہ ہے کہ کھانے پینے اور رہنے سہنے کے کچھ مخصوص طور طریقوں کے علاوہ عملی طور سے ان میں اور پاس پڑوس کی دوسری قوموں میں کوئی خاص فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا۔

کچھ ایسے لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ مسلمان بننے کے لیے کچھ بنیادی باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن ان کو اس بات کی خبر نہیں ہے کہ ان پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔ ان کا عام خیال یہ ہے کہ اسلام بس بہ طور عقیدہ مان لینے کی چیز ہے عمل کے سلسلے میں اس کا کوئی مطالبہ نہیں ہے، بلکہ ہمارے پیشہ ور واعظین کے کرم سے عمل سے ان کی بے گانگی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ عمل کا تصوّر سامنے آتے ہی وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ خدانخواستہ وہابیت یا خارجیت کے جراثیم تو ان کے اندر گھس نہیں آئے ہیں۔

کچھ ایسے لوگ ہیں جو عقیدہ کے ساتھ کسی حد تک عمل کے بھی قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک عمل بس زیادہ سے زیادہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج میں منحصر ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ دین کے یہ ستون اگر کھڑے کر دیے گئے تو دین کی پوری عمارت اپنے حجروں، چھتوں اور صحن سمیت قائم ہوگئی اب اور کس چیز کی فکر درکار ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے عمل کے مفہوم میں اس سے زیادہ وسعت پائی جاتی ہے یعنی وہ شریعت کے مطابق اخلاق و اعمال کی درستگی کو بھی عمل کا ایک جزء سمجھتے ہیں لیکن ان کی نگاہ بس انفرادی اخلاق و معاملات کی درستگی میں ہی اٹک کر رہ جاتی ہے، وہ اس سے آگے یہ تصور نہیں

کر سکتے کہ اسلامی احکام کا تعلق اجتماعی معاملات و مسائل سے بھی ہے اور ان کے سلسلے میں بھی مسلمانوں پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

غرض مسلمان کہلانے والا معاشرہ اسلام کے علم کے بارے میں ان گوناگوں قسموں میں بٹا ہوا ہے اور ہر پہلی قسم دوسری قسم کے مقابلے میں زیادہ عام اور وسیع ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں کا علم اتنا سطحی اور ناقص ہو وہ بھلا شہادت حق کے عظیم فرض کو کیا محسوس کریں گے اور جب محسوس نہ کریں گے تو اس کے لیے کچھ کریں گے کیا؟

(۲) عملی کوتاہیاں

علم کے بعد دوسرا درجہ عمل کا ہے، عمل کا سرچشمہ چوں کہ علم ہے اس لیے علم کے بارے میں اوپر جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، اس کو سامنے رکھنے ہی سے عمل کا ہر گوشہ نگاہ میں آسکتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ مذکورہ تصورات کی بنیاد پر عمل کی جو عمارت تیار ہوگی وہ کہاں تک اسلام کے نقشہ کے مطابق ہوگی اور وہ کس حد تک کسی شہادت کی ذمہ داریوں کا بوجھ سہار سکے گی۔ لیکن ممکن ہے آپ علم و عمل میں کسی ملازم کے قائل نہ ہوں اور آپ کا خیال یہ ہو کہ بنیاد کے بغیر عمارت قائم ہوسکتی ہے اور اسلام کے صحیح علم کے بغیر اسلامی اعمال کا ظہور و صدور ممکن ہے، اس لیے آپ صرف علم کے نقشہ کو سامنے رکھ کر ہی اعمال کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کریں بلکہ وہ جیسے کچھ ہیں ان کو خارج میں دیکھ کر ان کا کوئی نقشہ ذہن میں متعین کریں۔ کیا مسلمانوں کے بارے میں آپ کی معلومات اس کی تردید کرسکیں گی کہ:

(الف) ایسے مسلمان بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں لیکن کلمہ و نماز تک سے واقف نہیں ہیں اس لیے عملاً بھی ان کے تارک ہیں۔

(ب) ایسے مسلمان بھی پائے جاتے ہیں جو کلمہ کا ورد تو کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی دن رات قسم قسم کے مشرکانہ اعمال کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔

(ج) ایسے مسلمان بھی پائے جاتے ہیں، جو نماز روزہ کے تو پابند ہیں لیکن جھوٹ بولنے، رشوتیں لینے دینے، جھوٹی گواہیاں دینے اور مکر و فریب سے کام لینے میں ان کا معیارِ

اخلاق بسا اوقات دوسری قوموں کے افراد سے بھی گرا ہوا نظر آتا ہے۔

(د) ایسے مسلمان بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے نماز روزہ اور اخلاق و معاملات میں تو شریعت کے مجسمہ ہیں لیکن اسی کے ساتھ جب وہ حجرہ و خانقاہ اور مسجد و مدرسہ سے باہر نکلتے ہیں تو وہ اپنے مسلمان ہونے کی حیثیت کے ساتھ، نیشنلزم، کمیونزم، سیکولرزم اور دنیا کے سارے ازموں کا جوڑ بھی ملا لیتے ہیں اور انہی ازموں کی مدح وستائش اور تبلیغ و اشاعت میں شب و روز سرگرمِ عمل رہتے ہیں، اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں اور اس کو کسی درجے میں اپنی اسلامی حیثیت کے منافی بھی نہیں سمجھتے۔

آپ آنکھیں کھول کر دیکھیں، اسلام کے یہ نمونے بلکہ ان سے بھی زیادہ عجیب وغریب نمونے آپ کو ہر طرف چلتے پھرتے نظر آئیں گے، کیا آپ توقع کر سکتے ہیں کہ ایسے ہی مواد خام سے شہادتِ حق کا فرض انجام پا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دینا مشکل ہے۔

شہادت کے متعلق یہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ محض قول سے ادا نہیں ہو سکتی اس کے لیے عمل کی شہادت بھی ضروری ہے اور یہاں صرف یہی نہیں کہ عمل مقصود ہے بلکہ زندگی خلاف حق عمل کا مظہر اور اس کی داعی ہے پھر شہادت کا حق کس طرح ادا ہو سکتا ہے۔

(۳) مغربی تہذیب کا غلبہ

اسلام اور مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ جو زمانہ یورپ کی نئی بیداری اور اس کے سیاسی و علمی ارتقاء کا زمانہ ہے وہی عالمِ اسلام کے انحطاط و زوال اور غفلت و مدہوشی کے عین شباب کا بھی زمانہ ہے اس لیے یہ ممالک اس کے مقابلے میں صرف سیاسی حیثیت سے ہی شکست نہیں کھا گئے بلکہ ذہنی و فکری حیثیت سے بھی انھوں نے اس کے مقابلے میں ہتھیار ڈال دیے۔

اوپر مسلمانانِ ہند کے علم و عمل کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ کچھ اس زمانہ کا نیا خاکہ نہیں ہے، صدیوں سے ان کا قریب قریب یہی حال چلا آ رہا ہے اس لیے جو صورت حال دوسرے ملکوں میں پیش آئی۔ وہی یہاں بھی پیش آئی، ہندستان میں سلطنت مغلیہ کے زوال کے معنی صرف یہی نہیں تھے کہ مسلمان جسمانی طور سے انگریزوں کے غلام بن گئے بلکہ یہ جسمانی غلامی

ان کی ذہنی غلامی کا پیش خیمہ تھی اور یہ غلامی پہلی غلامی سے بھی زیادہ شدید و بدتر ثابت ہوئی۔

انگریزوں کا سب سے بڑا اور قیمتی تحفہ اس تہذیب کا تحفہ تھا، جو وہ اپنے ساتھ یورپ سے لائے تھے، یہ ایک نہایت نظر فریب، چمکیلی تہذیب تھی، ادھر مسلمان، یورپ سے مرعوب ہو چکے تھے اور ان میں نہ اپنی تہذیب کی خصوصیات ہی باقی رہ گئی تھیں اور نہ اس کے لیے ان میں کوئی دل چسپی کا داعیہ ہی موجود تھا، اس لیے انھوں نے لپک کر اس کا خیر مقدم کیا اور اس کو اپنے سر آنکھوں پر جگہ دی۔ اس تہذیب کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ اس پر یہاں کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہے، لیکن جو لوگ اس کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ تہذیب اسلامی تہذیب کی عین ضد ہے، اسلامی تہذیب کا سنگِ بنیاد خدا پرستی اور خوفِ آخرت ہے، اسی پر افراد کی سیرتیں بھی تعمیر ہوتی ہیں اور اسی پر اجتماعی زندگی کا ایوان بھی قائم ہوتا ہے اور چوں کہ خدا پرستی کے ساتھ کسی اور پرستاری کا جوڑ نہیں لگ سکتا، اس لیے اسلامی تہذیب کے زیر اثر جو اسلامی معاشرہ وجود میں آتا ہے اس میں وطن پرستی، قوم پرستی اور اس جیسی پرستاریوں کے لیے کوئی نہیں۔ اس کے برعکس مغربی تہذیب کا خاصہ یہ ہے کہ وہ خالص مادہ پرستانہ تصورات کی بنیاد پر قائم ہے، اس میں خدا کے لیے اگر کوئی جگہ ہے، تو صرف اس حد تک کہ مسجد و مندر میں کوئی چاہے تو اس کی پوجا کر لے، دنیا اور معاملاتِ دنیا سے بہ ہر حال اس کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے، پھر خدا کو اس طرح معاملات سے بے دخل کر دینے کے بعد اس کے مقام پر قوم کو بٹھایا گیا ہے، اس کی دل و جان سے عبادت بجالائی جاتی ہے اور اس کی محبت کے تمام تقاضے یعنی قومی ترقی کے لیے جھوٹ، مکر و فریب، دوسروں کے حقوق پر دست درازی وغیرہ ذوق وشوق کے ساتھ پورے کیے جاتے ہیں(۱)۔ اور اس پر مزید ستم یہ ہے کہ خدا کے خوف اور اخلاق کی

---

(۱) اور ایسا ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے، یورپ کے مخصوص حالات اور ماحول کی بنا پر اس کا قوم پرستی کی لعنت میں مبتلا ہو جانا ایک بالکل قدرتی بات ہے۔ اوّل تو یہ سرزمین اپنی قدرتی آب و ہوا اور جغرافیائی ماحول کے لحاظ سے قوم پرستی کی پیدائش و پرورش کے لیے ایک نہایت موزوں مقام ہے، یہ ایک چھوٹا سا خطہ ہے، جہاں کے وسائل معاش نہایت محدود اور ناکافی ہیں، اس لیے زندگی کے لیے کش مکش گویا وہاں کے حالات کا ایک فطری تقاضا ہے اور یہ کش مکش وہ بلا ہے کہ اگر دین و اخلاق کا پاسباں موجود نہ ہو تو کوئی چیز اس کو قوم پرستی کے رنگ میں رنگ جانے سے روک نہیں سکتی۔ پھر اس کے

باقی اگلے صفحہ پر

گرفت سے لوگوں کو پوری طرح آزاد کردینے اور قوم پرستی کی ان بدترین لعنتوں میں مبتلا کردینے کے بعد ان کو جمہوریت کے نام پر اس بات کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ناقص اور بدترین جذبات وخواہشات سے دبی ہوئی عقل سے کام لے کر اپنی زندگی کے لیے جس طرح کا چاہیں نقشہ تیار کریں اور اس کے مطابق زندگی گزاریں۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسی تہذیب کو اپنا کر مسلمان اپنے ملّی نصب العین کے ساتھ اپنی وابستگی برقرار نہیں رکھ سکتے، چاہے زبانی اس کے ساتھ اپنے کتنے ہی عشق ومحبت کا دعویٰ کریں

پچھلے صفحے کا بقیہ

ساتھ اس خطے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کو نسلی اور جغرافیائی اختلافات نے ظاہری طور سے بھی الگ الگ منطقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یہ تقسیم غیر حقیقی سہی، لیکن اگر انسان انسانیت کے وسیع تر مفہوم سے واقف نہیں ہے تو یہ ظاہری تقسیمیں بھی اس کو قومیت کا احساس دلانے کے لیے کافی ہیں، یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے یہ چھوٹا سا خطہ مختلف قومیتوں کا گہوارہ رہا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ یونان جو اگرچہ اس مختصر خطے کا بھی ایک نہایت مختصر حصہ ہے لیکن اس کی قدیم تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ اس میں بیسیوں ایسے شہر تھے جو اپنی اپنی جگہ پر ایک مستقل مملکت کی حیثیت رکھتے تھے۔

دوسری بات جو درحقیقت یورپ میں قومیت کی پیدائش اور فروغ کی اصل علّت ہے، یہ ہے کہ یورپ کی نئی بے داری سے پہلے پوپ اور قیصر کے ناپاک اتحاد سے وہاں جو ہمہ گیر استبداد قائم ہوگیا تھا اس کا قدرتی ردِعمل یہی ہونا چاہیے تھا کہ ہر قوم اس نظام سے اپنا رشتہ منقطع کر کے خود اپنی قسمت کی مالک بن جائے، چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ اس تشتت کو اگر کوئی چیز روک سکتی تھی تو وہ صرف دین کی طاقت تھی، لیکن دین خود سیاست کا غلام بن کر اپنا وقار کھو چکا تھا اور درحقیقت جو دین وہاں رائج تھا، اس میں اس لہر کو روکنے کی سرے سے کوئی طاقت ہی نہیں تھی، اور چوں کہ یہ علیٰحدگی یک گونہ مذہب سے نفرت کی بنا پر وجود میں آئی تھی اس لیے کچھ دنوں تک تو موروثی اثرات کے تحت دین کا تھوڑا بہت اثر قائم رہا لیکن جب دین وسیاست کی کش مکش میں دین پوری طرح مغلوب ہوگیا تو یہ اثر بھی جاتا رہا اور اب قوم پرستی اپنی اصل شکل میں نمودار ہونے لگی۔ اب یہ کوئی مدافعانہ اور حفاظتی تدبیر نہیں تھی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس نے دوسری قوموں کے حقوق پر بھی دست درازی شروع کردی، جس سے قومی کش مکشوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، ایشیائی ممالک اس کے سب سے پہلے لقمہ بنے، کیوں کہ وہ کم زور وناتواں تھے، لیکن یہ بلا ان کے ہی ساتھ مخصوص نہیں رہی، قوم پرستی اپنی اصل فطرت کے لحاظ سے کش مکش وتصادم کی طالب ہے، اس لیے یہ قومیں خود آپس میں ہی ٹکرانے لگیں، اس سے پہلے دو عظیم جنگیں اسی قوم پرستی کے بطن سے پیدا ہو کر تمام دنیا میں تباہی مچا چکی ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ تیسری جنگ کا جنین بھی عنقریب منصۂ شہود پر رونما ہونے والا ہے، جو غالباً اپنی نحوست میں اپنے پیش رووں سے بھی بازی لے جانے والا ثابت ہوگا۔

بلکہ صحیح معنوں میں ان کا مسلمان باقی رہنا بھی دشوار ہے۔ کوئی بھی قوم ہو، جب اس کی نگاہ میں اپنی ملّی خصوصیات بے وقعت ہوگئیں اور ان کو چھوڑ کر وہ کسی دوسری قوم کی خصوصیات اختیار کرنے کی طرف مائل ہوگئی، تو زیادہ دن نہیں گزریں گے کہ وہ اپنی اصل سے بہت دور جا پڑے گی، اور یہاں بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ مسلمان اپنی ملّی خصوصیات کو چھوڑتے جا رہے ہیں، بلکہ ان کو چھوڑ کر جس تہذیب کو وہ اختیار کر رہے ہیں، وہ اپنی اصل و مزاج اور خصوصیات کے اعتبار سے، جیسا کہ گزر چکا ہے، ان کی تہذیب، ان کی ملّی خصوصیات اور ان کے نصب العین کی ضد ہے، ایسی حالت میں اس کے ساتھ لگاؤ کس طرح باقی رہ سکتا ہے، چناں چہ یہی نقشہ اس وقت ہمارے سامنے ہے، مسلمانوں کے معاشرے کا جائزہ لیں، آپ دیکھیں گے کہ آج خود مسلمانوں کے ہاتھوں ان کا نصب العین پامال ہو رہا ہے۔

وہ مسلمان ہی ہیں جو محض یورپ کی تقلید میں مذہب کو ایک بے معنی چیز سمجھتے ہیں حالاں کہ مذہب سے انکار یورپ کی سب سے بڑی نادانی ہے جس میں اپنے کچھ خصوصی اسباب کی بنا پر وہ مبتلا ہوگیا ہے اور اس معاملے میں اس کی تقلید حماقت محض ہے پھر مسلمانوں کا دین بھی وہ مذہب نہیں ہے جس سے نفرت کے لیے کوئی وجہ جواز ہو جیسا کہ یورپ کا حال تھا جہاں مذہب اپنی اصلیت کھو کر ان کے لیے زحمت بن چکا تھا۔

وہ مسلمان ہی ہیں بلکہ ان کے مذہبی پیشوا اور رہبر بھی ہیں جو دین و سیاست کو اس لیے دو الگ الگ چیزیں سمجھتے ہیں کہ یورپ میں بعض وجوہ سے یہ تفریق عملاً قائم ہوگئی ہے اور اس تفریق پر وہ اس طرح آنکھیں بند کر کے ایمان لا چکے ہیں کہ اس کے خلاف کچھ کہنا ان کے نزدیک ''عقل و فہم کی سب سے بڑی کوتاہی ہے'' اور بہت سے لوگ تو قرآن و حدیث ہی سے اس کو عین دین ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، حالاں کہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے، جس پر خود انہی حضرات کی پچھلی تحریریں بھی شاہد ہیں کہ اسلام میں اس تفریق کی قطعاً گنجائش نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت یک گونہ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ کا مظاہرہ ہے جو قرآن کے الفاظ میں دین و دنیا دونوں کے خسران کا موجب ہے۔

وہ مسلمان ہی ہیں جو دوسروں سے پہلے خود بڑھ بڑھ کر اعلان کر رہے ہیں کہ مسلمان

اپنا کوئی جداگانہ تشخص نہیں رکھتے، بلکہ وہ یہاں کی عمومی قومیت کا ایک جز ہیں اور نہ ان کی کوئی علیٰحدہ تہذیب ہے، جس کی حفاظت کی فکر کی ضرورت ہو۔

غرض مغربی تہذیب وتمدن نے مسلمانوں کو فکری حیثیت سے اسلام سے بہت بے گانہ اور دور کردیا ہے اور اس کا یہ اثر صرف اس طبقہ تک محدود نہیں ہے، جس کو بہ راہ راست اسے برتنے کا موقع ملا ہے، بلکہ وہ دور دراز اور محفوظ گوشے بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ گئے ہیں جو دینی علم اور اسلامی تہذیب کے مرکز سمجھے جاتے ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے تو یہ گوشے اثر پذیری میں پہلے طبقے سے بھی آگے ہیں۔

یہ حال تو فکری حیثیت سے ہے، عملی حیثیت سے دیکھیے، تو اس لحاظ سے بھی مغربی افکار کی بنیادوں پر ہی ان کے عمل کی دیواریں قائم یا اٹھتی ہوئی نظر آئیں گی۔ یورپ کے نظریۂ حیات کے تحت یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ زندگی جو کچھ ہے، اس دنیا کی زندگی ہے اور اس کے بعد نہ کوئی دوسری زندگی ہے، اور نہ کوئی جزا وسزا، اس لیے حلال وحرام کی تمیز اٹھتی جارہی ہے، دنیاوی مفاد وعزت کے لیے ضمیر فروشی بھی کرنی پڑے تو اس سے گریز نہیں ہے، اخلاق کا جنازہ نکل چکا ہے، مفاد پرستی اصل دین بن چکی ہے، جب اس طرح مغربی تصورات ذہن ودماغ پر مسلط ہو چکے ہیں اور ان کے ماتحت زندگی بڑی حد تک مادہ پرستانہ بن چکی ہے تو یہ توقع ہی ایک بے جا بات ہے کہ لوگ اسلامی افکار ونظریات کو مسائل زندگی کا حل یقین کریں گے اور اس کے لیے کچھ جدوجہد کریں گے، موجودہ حالات میں تو یہی غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ ابھی امت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو صحیح اسلامی اقدار کو قدر ووقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنے دامن کو ان اثرات سے کسی حد تک محفوظ کیے ہوئے ہیں یہ اور بات ہے کہ یہ طبقہ رفتہ رفتہ کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے اور حالات کو دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ بہت حد تک بجا معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہی لیل ونہار رہے اور مغربی افکار ونظریات کے سیلاب کو روکنے کے لیے کوئی مؤثر جدوجہد عمل میں نہ لائی گئی تو خدانہ خواستہ یہ طبقہ اپنی رہی سہی قوت مقاومت کھو بیٹھے اور اپنے کو اسی سیلاب کے حوالے کردے۔

(۴) ہندستان کے نامساعد حالات

چوتھا مانع وہ نامساعد حالات ہیں، جو ہندستان میں بالخصوص تقسیم کے بعد پیش آئے، یہاں کی غیر مسلم آبادی خود بھی قوم پرستی کے کچھ کم رجحانات نہیں رکھتی تھی، اس پر مسلمانوں کے قوم پرستانہ طرزِ عمل نے گویا آگ پر تیل کا کام دیا، اور پھر وہ سب کچھ ہوا، جس کے تصور سے بھی ایک معقولیت پسند انسان کو گھن آتی ہے، ہندو مسلم کش مکش کی انتہا یہ ہوگئی کہ ملک کو مجبوراً دو حصوں میں تقسیم ہونا پڑا، یہ تقسیم فطری طور پر غیر مسلموں کے لیے ایک تکلیف دہ چیز تھی، اس لیے اس کے ردعمل میں مسلمانوں کے ساتھ ان کی نفرت اور زیادہ ہوگئی اور چوں کہ ناعاقبت اندیش مسلم لیڈروں نے نتائج پر دھیان دیے بغیر تحریک پاکستان میں ان مسلمانوں کو بھی شریک کرلیا تھا، جو ہندستان میں بستے ہیں اور جن کو بہ ہر حال ہندستان ہی میں رہنا تھا، اس لیے پاکستانی مسلمانوں کے حصے کی نفرت بھی انہی کو بھگتنی پڑی، بلکہ غریب اسلام بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکا، کیوں کہ قومی تحریک کو طاقت ور بنانے کے لیے اس کا نام بھی جا و بے جا استعمال کیا گیا تھا۔

ان حالات کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ یہاں کی اکثریت مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے، اور ان پر اعتماد کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ہے، اسلام یا اسلام کے نام پر کسی اجتماعی جدوجہد کا نام لیتے ہی وہ اپنے کان کھڑے کرلیتے ہیں۔ ان کے سامنے فوراً ہی مسلم لیگ کا نقشہ اپنی پوری ہیئت کے ساتھ آجاتا ہے اور وہ اس کے خلاف نفرت اور غصہ کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ حالیہ الیکشن میں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت نے مختلف اسباب کے تحت کانگریس ہی کو ووٹ دیا ہے، لیکن سمپورنانند جی جیسے ذمہ دار کانگریسیوں کو ان کی وفاداری اس لیے مشکوک نظر آرہی ہے کہ ان کے بہ قول بعض مقامات پر انھوں نے غیر کانگریسی مسلم نمائندوں کی حمایت کی تھی حالاں کہ وہ اس شکایت کے ساتھ ہی یہ بھی فرماتے جاتے ہیں کہ آزاد الیکشن میں ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق ووٹ دینے کا حق ہے اور وہ غالباً اس بات سے بھی انکار نہیں کرسکتے کہ وفاداری کے اس پیمانہ سے اگر خود ان کے ہم قوموں کو ناپا جائے تو ہندستان کی آدھے کے قریب آبادی غیر وفادار ہی نظر آئے گی۔

شک و بدگمانی کی اس کیفیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ہندستان میں مسلم لیگ کا عملاً کہیں وجود نہیں ہے، صوبۂ مدراس میں بھی درحقیقت صرف اس کا نام زندہ ہے، جہاں تک کام کا تعلق ہے اس کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ اس کے صدر محترم نیاز مندیوں کے اظہار، ماضی پر استغفار اور آئندہ کے لیے احتیاط کے وعدوں کے ساتھ کبھی کبھی اخبارات کے صفحات پر نمودار ہو جایا کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اس الیکشن میں چوں کہ انھوں نے بھی صوبۂ مدراس میں کچھ غیر مسلم پارٹیوں ہی کے بل بوتے پر اپنے کچھ امیدوار کھڑے کردیے تھے جن میں سے کچھ کانگریس کی طرف سے پبلک کی بے اطمینانی کے طفیل میں کام یاب بھی ہوگئے ہیں، اس لیے آج غیر مسلم پریس اس کو مستقبل کے لیے ایک خطرۂ عظیم سمجھتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہے، یہی حال بمبئی کی فورتھ پارٹی کا بھی ہورہا ہے، خود کانگریس اس معاملے کو اتنی زیادہ اہمیت دے رہی ہے کہ ان دونوں جماعتوں کا مسئلہ باقاعدہ اس کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے آچکا ہے، حالاں کہ ان جماعتوں میں سے ایک قطعی طور پر خود کانگریسیوں ہی کی سازباز کا کرشمہ ہے اور اس نے الیکشن میں کانگریس کو کافی گراں قیمت ادا کرکے اپنے دو ایک امیدوار کام یاب کرائے ہیں۔ یہاں ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ مسلمانوں کا اس طرح الیکشن میں حصہ لینا صحیح و مفید ہے یا غلط و مضر، اس بارے میں ہمارا جو نقطہ نظر ہے اس کے بارے میں کسی کو اشتباہ نہیں ہونا چاہیے، ہم قطعی طور سے اس کو غلط اور مضر سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا جارہا ہے اس سے اس بات کا قطعی ثبوت ملتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی کسی نام کی بھی اجتماعی جدوجہد کے سلسلے میں ملک کے رجحانات کیا ہیں اور اسی حیثیت سے ہم نے یہاں ان پارٹیوں کا حوالہ دیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اسلام یا مسلمانوں کی طرف سے جو شک و بدگمانی غیر مسلموں کے دلوں میں بیٹھ گئی ہے، اس کی بنا پر ان کی خواہش و کوشش یہ ہے کہ مسلمان کبھی کسی نام پر بھی مجتمع نہ ہوسکیں بلکہ سرے سے اس کا کوئی خیال ہی ان میں پیدا نہ ہوسکے، اور اگر پیدا ہو، تو اس کو پہلے ہی مرحلے پر ختم کردیا جائے، حد یہ ہے کہ وہ اس بارے میں اپنے معتمد علیہ لوگوں پر بھی کوئی اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ۱۹۴۸ میں مسلمانوں کا جو اجتماع لکھنؤ میں مولانا آزاد کی زیرِ صدارت منعقد ہوا

تھااس کوبھی عام طور سے شک و بدگمانی ہی کی نگاہ سے دیکھا گیا، سردار پٹیل تک نے بھی اس کے سلسلے میں ایسے بیانات دیے تھے جن سے ان کی بے اطمینانی صاف طور سے جھلک رہی تھی، حالاں کہ اس اجتماع کے لیے انھیں شکرگزار ہونا چاہیے تھا، شکایت کا تو بہ ہر حال کوئی موقع نہیں تھا۔

ان حالات میں مسلمانوں کو اپنے حقیقی منصب یعنی شہادت حق کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں جو خوف دامن گیر ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ کرنا کوئی دشوار بات نہیں ہے، اس سے اس کام کی مشکلات کا پورا پورا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اور مزید برآں اس کے ساتھ اس بات کو بھی ذہن میں رکھ لینا چاہیے کہ تقسیم کے بعد یہاں کے مسلمان کس قدر خوف زدہ ہیں، ان کی ہمتیں اس طرح جواب دے چکی ہیں کہ وہ اس کو ہی بہت غنیمت سمجھ رہے ہیں کہ کسی طرح ان کا وجود باقی رہ سکے، نوعیت وجود کے متعلق کچھ سوچنے کے لیے بھی ان کا ذہن تیار نہیں ہے اور اگر کچھ سوچتا بھی ہے، تو اس پہلو سے کہ وہ دین کے لبادے کو کب تک بارِ دوش بنائے رکھ سکتے ہیں اور اس کا فائدہ کیا ہے۔

ان حالات و اسباب کی موجودگی میں اس بات کی کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ مسلمانوں میں انفرادی یا اجتماعی حیثیت میں کوئی ایسی تبدیلی پیدا ہوسکے جس کا بنیادی مقصد شہادت حق ہو! خدا کی قدرت سے تو کوئی بات بھی بعید نہیں ہے لیکن اگر یہ دنیا اسباب وعلل کے رشتے سے بندھی ہوئی ہے، تو ہمارے نزدیک مسلمانوں کی موجودہ عملی زندگی کو اسلام کی بنیادوں پر ازسرِ نو تعمیر کیے بغیر اس کا تصور کرنا خواب وخیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، ان حالات میں تو خالص قومی بنیاد پر بھی وہ کوئی جدوجہد کرنے کے نااہل ہیں چہ جائے کہ اسلام اور شہادت حق کی بنیاد پر جس سے ابتدائی مرحلے میں کسی دنیاوی فائدے کی توقع وابستہ نہیں کی جاسکتی، بلکہ اس میں اپنا سب کچھ کھودینا پڑتا ہے تاکہ آخرت کی کام یابی حاصل ہوسکے، یہ نقد سودا نہیں بلکہ نسیئہ ہے اور اس زمانہ میں بڑے بڑے عقل مندوں سے بھی اس عقل مندی کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ عاجلہ کے مقابلہ میں آخرت کو اور نقد کے مقابلہ میں نسیئہ کو ترجیح دیں گے کجا یہ کہ وہ اس راہ میں اپنی جان و مال اور قوت وصلاحیت کی کوئی قربانی پیش کریں گے، اس لیے ان حالات کو بدلنے اور موانع کو رفع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دین کے جو تقاضے ہیں اور جن کو پورا کرنا ہر حال میں ضروری ہے، ان کو پورا کرنے کا عملی انتظام ہوسکے، آیئے ہم غور کریں کہ اوپر جن موانع کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔

رفع موانع کی تدابیر

ہمارے خیال کے مطابق مذکورہ موانع و مشکلات کے ازالہ کے لیے علی الترتیب حسبِ ذیل تدابیر ناگزیر ہیں۔

(۱) دینی تعلیم کا بندوبست

دینی تعلیم وتربیت کا ایک ایسا وسیع اور ہمہ گیر نظام قائم کرنا چاہیے کہ ہر مسلمان دین کی ابتدائی معلومات سے ضروری طور سے واقف ہوسکے، لیکن ابتدائی معلومات سے مراد صرف ایمان وعقیدہ اور نماز روزہ کے ضروری مسائل ہی نہیں ہیں، بلکہ اس میں دین کا یہ علم بھی داخل ہے کہ اس کا تعلق صرف عقائد وعبادات ہی سے نہیں ہے بلکہ اخلاق اور دنیاوی معاملات سے بھی ہے۔ یعنی تفریقِ دین و دنیا کا جو تصور عام ہے، اس کو مٹا کر اس کی بہ جائے دین کی وسعت و ہمہ گیری کا تصور عام کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر نہ صحیح معنوں میں ان کی زندگی اسلامی زندگی ہوسکتی ہے اور نہ وہ عہدِ حاضر کے فتنوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں، آج جو مسلمان تیزی کے ساتھ لادینی تحریکات کا شکار ہوتے جارہے ہیں، اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کے نزدیک یہ تحریکات دنیاوی معاملات ومسائل کے حل سے تعلق رکھتی ہیں اور دین کو ان مسائل سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے اس لیے اس کے ساتھ ان کی دل چسپی ایسے ہی کم ہوتی جارہی ہے۔ پھر اس تصور کے مطابق ہمارا جو دینی عملی نمونہ ہر جگہ دیکھنے میں آرہا ہے وہ بہ جائے خود اس زمانے کے ذہین طبقہ کو دین سے بے رغبت کرنے والا ہے۔ وہ ایسے دین کو ایک لایعنی شے سمجھنے لگے ہیں جو

زمانہ کی عملی دشواریوں میں کوئی نقطۂ نظر ہی نہ رکھتا ہو چہ جائے کہ وہ ان کے حل میں کچھ معاون ثابت ہوسکے۔

اس غرض کے لیے ہمیں ایک وسیع پروگرام بنانے کی ضرورت ہے، جس کے تحت یہ کوشش کی جائے کہ

(الف) ہمارے جو مکاتب و مدارس پہلے سے قائم ہیں اور جو مالی دشواریوں، نظم کی خرابیوں یا کارکنوں کی نااہلیتوں اور عام مسلمانوں کی غفلتوں کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں یا ان سے مطلوبہ مقصود حاصل نہیں ہورہا ہے، ان کی از سرِ نو تنظیم کی جائے اور ان کو زیادہ مضبوط بنیادوں پر چلانے کی کوشش کی جائے۔

(ب) جہاں ایسے مکاتب و مدارس نہیں ہیں، وہاں نئے مکاتب و مدارس قائم کیے جائیں۔

(ج) ایک ایسا نصابِ تعلیم مرتب کیا جائے، جس میں دینی تعلیم کے تمام ضروری تقاضوں کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہو اور اس کو عمومی طور سے رائج و نافذ کرنے کی جدوجہد عمل میں لائی جائے۔

(د) ظاہر ہے، مکاتب و مدارس سے ایک خاص عمر و استعداد اور خصوصی حالات رکھنے والے لوگ ہی مستفید ہوسکتے ہیں، اس لیے ان کے اجراء و توسیع کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش کرنا چاہیے کہ دوسرے لوگ جو ان سے استفادہ نہیں کرسکتے ان کو دوسرے طریقوں مثلاً زبانی افہام و تفہیم، وعظ و تلقین، اخبارات و رسائل اور چھوٹی بڑی کتابوں کے ذریعہ دین کی ضروری باتوں سے آگاہ کیا جائے اور ان میں اس کا ذوق و رجحان پیدا کیا جائے۔

(ہ) مکاتب و مدارس اور تعلیم دین کے دوسرے ذرائع سے استفادہ دینی تعلیم کی ضرورت کے احساس پر مبنی ہے اور اس کا کوئی عمومی اور ہمہ گیر احساس اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا، جب تک عام لوگوں کو یہ نہ سمجھایا جائے کہ دین کا انسانی زندگی میں کیا مقام ہے اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان جس دین کے ماننے والے ہیں، اس کو جاننا اور عملی زندگی میں برتنا، اپنے ذاتی فائدہ و نقصان کے پہلو سے کتنا ضروری ہے، نیز قوم و ملک

اور انسانیت کے کتنے فوائد اس کے ساتھ وابستہ ہیں، اس غرض کے لیے ایک عمومی دینی تحریک جاری کرنا ازبس ضروری ہے، اس کے بغیر حصولِ علم دین کا جذبہ مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس ضمن میں ان کو یہ بھی بتانا ضروری ہوگا کہ ملی ضروریات کی فراہمی پہلے بھی ملت ہی کے فرائض میں داخل تھی، لیکن تقسیم کے بعد یہاں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں اگر تعلیم دین کا وسیع انتظام نہ کیا گیا تو ممکن ہے، موجودہ نسل اپنے ایمان کا سرمایہ بچالے جائے، لیکن آئندہ جو نسل موجودہ سرکاری مدارس اور تعلیم گاہوں سے تعلیم پا کر نکلے گی، وہ سب کچھ ہوسکتی ہے، مگر صحیح اسلام پر اس کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے، حالات جس رخ پر جارہے ہیں، ان سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر ان میں ان حالات کی اصلاح و تدارک کا احساس پیدا نہیں ہوسکتا، جو لوگ صحیح حالات کو چھپاتے ہیں یا مسلمانوں کو ان کے مضر اثرات سے متنبہ کرنے کی بہ جائے، مختلف تاویلوں اور توجیہوں کے ذریعہ ان سے اور غافل کردینے کی فکر میں ہیں وہ ان کے اور اسلام کے ساتھ بدترین ظلم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور یہ امت مسلمہ کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ ان میں ہی ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں جو اپنے کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا نام بھی لیتے ہیں لیکن ان کی کوشش و خواہش یہ ہے کہ مسلمان بس نام کے مسلمان باقی رہ جائیں اور اس ایک فرق کے علاوہ وہ ہر حیثیت سے سیکولر اسٹیٹ کے ایک ایسے معیاری شہری بن جائیں جن میں اور یہاں کی دوسری قوموں میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہ رہ جائے، ع

تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ایسے لوگ دوست نما دشمن ہیں جن کی طرف اولین توجہ کی ضرورت ہے۔ ان کی حقیقت سے عام مسلمانوں کو پوری طرح باخبر کردینا چاہیے تاکہ مسلمان ان کے فریب سے بچ سکیں۔

اوپر جن امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ وہ کام ہیں جو مسلمانوں کی دینی تعلیم کے سلسلے میں اندرونی طور سے ہمیں انجام دینے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر یہ سب کام ہماری خوبی۔ تقدیر سے بہ روئے کار آ بھی جائیں تو بھی یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ محض اتنے ہی سے

آپ کا مقصد مطلوب پورا ہو سکے گا۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مسلمان ہندستان میں کسی ایک مقام پر سمٹے ہوئے نہیں ہیں، وہ اس وسیع وعریض ملک میں جا بجا منتشر ہیں اس لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ملک کے عمومی حالات ورجحانات سے اپنے کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے دائرہ میں اپنے نہج پر ارتقاء کر سکیں۔ ملک میں اگر دین واخلاق کی کوئی قدر وقعت نہ ہوگی تو مسلمان لاکھ کوشش کر کے بھی اپنا دامن اس سے بچا نہیں سکیں گے، اس لیے ہم اپنے مسئلہ پر غور کرتے وقت ملک کے عمومی حالات سے کسی طرح صرف نظر نہیں کر سکتے۔ ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم ملک کے عمومی حالات کو بھی اپنی نگاہ میں رکھیں اور ان کو اخلاقی اقدار کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے رہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ مسلمان اپنی دینی تعلیم کا کیسا ہی خاطر خواہ انتظام کیوں نہ کر لیں بہ حالات موجودہ یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا کہ وہ اپنے بل بوتے پر اپنی دنیاوی ضروری تعلیم کا کوئی الگ مستقل بندوبست کر سکیں گے جس میں دین ودنیا دونوں کے تقاضوں کی پوری پوری رعایت کی گئی ہو اس لیے لامحالہ بہت سے لوگ اس تعلیم کے لیے سرکاری مدارس ہی کی طرف رُخ کریں گے بلکہ کتنے تو ایسے ہوں گے جو مسلمانوں کی اپنی ابتدائی دینی تعلیم سے بے نیاز ہو کر اسی تعلیم کو ترجیح دیں گے بالخصوص ایسی حالت میں کہ دنیاوی ترقی کا تمام تر انحصار انہی سرکاری درس گاہوں کی تعلیم پر ہوگا اس لیے اگر ان درس گاہوں کی تعلیم وتربیت میں کوئی ایسی تبدیلی نہ ہو سکی جو مسلمانوں کے تعلیمی نقطۂ نظر سے ضروری ہے تو اس صورت میں ان کے اپنے اندرونی تعلیمی انتظامات کا فائدہ زیادہ سے زیادہ ایک تنگ دائرہ تک محدود ہو کر رہ جائے گا، مجموعی حیثیت میں مسلمان کم وبیش انہی خطرات کا شکار ہو جائیں گے جو ان درس گاہوں کے نظام تعلیم وتربیت سے بجا طور پر محسوس کیے جا رہے ہیں۔ یہ بات کہ ابتداء عمر میں کچھ دین کی باتیں ان کے کانوں میں پڑ چکی ہوں گی اور وہ آئندہ تعلیمی مراحل میں ان کے لیے حرز ایمان کا کام دیں گی، ایک خوش آئند تصور سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، انگریزی دور حکومت کا تجربہ سامنے ہے جب کہ ایک طرف مختلف اسباب کے تحت مسلمانوں میں دین داری کا جذبہ بھی نسبتاً زیادہ تھا اور خود حکومت بھی بہ راہِ راست دین و مذہب میں مداخلت نہیں کیا کرتی تھی بلکہ اپنے مصالح کے تحت اس نے تبرک کے طور پر اس کا کچھ جز شامل نصاب کر دیا تھا، اس وقت اگر مسلمان طالب علم اپنی اور اپنے والدین کی نیک

خواہشوں کے باوجود، یورپ کے غارت گر دین و ایمان علوم کی زد سے اپنا توشۂ ایمان بہ مشکل بچا سکتے تھے تو اب اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے جب کہ علوم قریب قریب وہی ہیں اور سیکولرزم کے نام پر ایک طرف تو مذہب واخلاق کو نصاب سے خارج کیا جارہا ہے اور دوسری طرف دوسرے ناموں سے وہ چیزیں پڑھائی جارہی ہیں جو مسلمان طالب علموں کو اسلامی تہذیب سے کوسوں دور کرنے والی ہیں۔ یہ اور اس طرح کے دیگر حالات جب سامنے آتے ہیں تو لامحالہ مسلمان اس سوچ میں پڑجاتا ہے کہ ہندستان کا سیاسی اور تہذیبی ارتقاء اگر انہی لائنوں پر ہوتا رہا جس پر اس وقت قائم ہے اور اس میں اور مسلمانوں کے نظریۂ حیات میں کسی توافق کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہوسکی۔ اور نہ ہی اس سے فروتر درجے میں اپنے مخصوص دائرۂ زندگی میں اپنی زندگی کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے تعمیر کرنے اور برقرار رکھنے کی کچھ سہولتیں حاصل ہوسکیں تو آئندہ کتنے دنوں تک مسلمان ایک مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے اور یہ اضطراب صرف وہی لوگ نہیں محسوس کرتے جن کا طرز فکر یک گونہ قوم پرستانہ ہے، بلکہ وہ لوگ بھی جو مسلمانوں کو ایک قوم نہیں بلکہ ایک اصولی پارٹی دیکھنا چاہتے ہیں، اس پر اضطراب محسوس کرتے ہیں، کیوں کہ بہ ظاہر اسباب اسلام کی نمائندگی اسلام کے موجودہ نام لیواؤں ہی، کے ذریعہ متوقع ہے، اس لیے اگر غیر اسلامی نظام تعلیم کی بنا پر مسلمانوں کی موجودہ دینی حالت بھی خدانہ خواستہ برقرار نہیں رہ سکی تو اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے وہ اور زیادہ نااہل ہوجائیں گے اس لیے یا تو ملک کا مجموعی نظام ایسا ہو جس سے مسلمانوں کے دین وثقافت کے لیے کوئی خطرہ محسوس نہ ہو یا پھر کم تر درجہ میں یہ کہ ان کو وہ سہولتیں حاصل ہوں جو ان کے دینی اطمینان کے لیے ناگزیر ہوں اور سچ پوچھیے تو یہ بات نہ عقل ومنطق کی رو سے غلط قرار دی جاسکتی ہے اور نہ اسے وسیع نقطۂ نظر سے کام لیتے ہوئے ملک کے مفاد کے لیے مضر ثابت کیا جاسکتا ہے۔ عقل ومنطق کے خلاف اس لیے نہیں ہے کہ اگر ملک کی وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے اس بات کی گنجائش ہوسکتی ہے اور ہر طرح جائز سمجھ لیا گیا ہے کہ زبان، طرز زندگی، اصول تہذیب اور اجتماعی ضروریات کے تفاوت کی بنا پر ملک کو کم وبیش دو درجن ریاستوں اور صوبوں میں تقسیم کردیا جائے جیسا کہ اس وقت عملاً ہے اور آئندہ کے لیے بھی اس کا دروازہ کھلا رکھا گیا ہے جیسا کہ آندھرا وغیرہ کے علیٰحدہ صوبہ قرار دینے کے سلسلے میں بارہا

اعلان کیا جا چکا ہے، تو اس کی کوئی معقول وجہ نہیں قرار دی جاسکتی کہ انھی اختلافات کی بنا پر مختلف قوموں کو عمومی مسائل میں متحد رکھتے ہوئے اپنے گھر کی اندرونی اصلاح و تنظیم کے لیے ایک متحد مرکز کے تحت تھوڑے بہت ثقافتی اختیارات سپرد نہ کیے جائیں، رہا اس ملک کے عمومی مفاد کے خلاف ہونے کا پہلو تو اس بارے میں صرف جذبات سے کام لینا کوئی عقل مندی کی بات نہیں ہے، ٹھوس حقائق کو سامنے رکھنا چاہیے اور جذبات وتعصّبات سے الگ ہو کر ملک کی ترقی و استحکام کے مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔ جب یہ واقعہ ہے کہ ہندستان میں صرف ایک ہی قوم نہیں بستی ہے بلکہ یہاں بیسیوں ایسی قومیں آباد ہیں جو اپنی مخصوص زبان، اپنا مخصوص کلچر اور اپنا مخصوص نظریۂ حیات رکھتی ہیں اور ان کو آئین ہند میں ان کے تحفظات کی طرف سے اطمینان بھی دلایا گیا ہے تو ان کو زبردستی ایک قومیت یا ایک تہذیب کے بندھن میں باندھنے کی کوشش کرنا اپنے مآل کار کے اعتبار سے ہندستان کے لیے مفید ثابت نہیں ہوسکتا اس سے قدرتی طور پر ان میں بے اطمینانی پھیلے گی اور یہ چیز ملک کی مجموعی تعمیر و ترقی کے لیے سدراہ ثابت ہوگی اور اس طرز عمل کا ایک اور کھلا ہوا نقصان یہ ہے کہ جب کسی قوم کو زبردستی کسی نئی تہذیب یا نئے خیالات کے اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ قوم اپنے اخلاق و اعمال کے لحاظ سے نہایت پستی میں مبتلا ہو جاتی ہے، نہ اس میں قدیم اساسی تصورات ہی اپنی اصل شکل میں باقی رہ جاتے ہیں اور نہ وہ جدید تصورات ہی کو ٹھیک طور سے جذب کر پاتی ہے اس لیے وہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے بالکل کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہے اور مزید برآں ایسے ناگوار حال سے دوچار ہونے کی بنا پر اس میں احساس کمتری وغیرہ جذبات پرورش پانے لگتے ہیں جو بہ حیثیت مجموعی پورے ملک کی صحت مند حالت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے ہوش مند مدبر جیسا کہ دنیا کے بعض دوسرے ملکوں میں دیکھا جاتا ہے، کبھی اپنے ملک میں ایسی صورت حال پیدا ہونے نہیں دینا چاہتے اور وسعت قلب سے کام لے کر ہر قوم کو اس کے مخصوص ثقافتی دائرۂ زندگی میں اپنی تعمیر آپ کرنے کا حق تسلیم کر لیتے ہیں۔

لیکن چوں کہ بہ حالات موجودہ یہ توقع بہت کم ہے کہ مسلمانوں کے ان احساسات کا کوئی عملی نتیجہ برآمد ہو سکے گا اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ ہم موجودہ حالات کو جوں کا توں سامنے رکھتے ہوئے کم از کم حسب ذیل تدبیروں کو اختیار کرنے کی کوشش کریں جو ایک حد تک

خارجی حالات وخطرات کے سلسلے میں مفید ثابت ہوسکتی ہیں، لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْراً۔

(الف) اس بات کے لیے ایک وسیع تحریک شروع کی جائے کہ سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں جو نصابِ تعلیم رائج ہے اس کو مغربی الحادو بے دینی کے زہریلے اجزاء سے ضروری حد تک پاک کیا جائے اور اس میں اخلاق اور مسلم مشترک دینی اقدار کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کی جائے۔ یہ کام بے شک دشوار بہت ہے، ہمارا پورا نظامِ تعلیم یورپ کے افکار ونظریات پر قائم ہے اور بدقسمتی سے یورپ کے بند غلامی سے آزاد ہونے کے بعد بھی ہمارا ذہن اب تک بہ دستور اس کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ امید افزا پہلو یہ ہے کہ اس تعلیم کے مضر اثرات نے بہتوں کے دل ودماغ کو اس کے حسن وقبح پر غور کرنے کے لیے مجبور کر دیا ہے جن میں نہایت مشہور اور بااثر شخصیتیں بھی داخل ہیں، اگر ایسے تمام لوگ متحد ہوسکیں اور کسی طے شدہ نقشہ کے مطابق اپنے خیالات کے مطابق عملی تبدیلیوں کے لیے متفق جدوجہد عمل میں لے آئیں تو زود یا بدیر اس کے خاطر خواہ نتائج ضرور برآمد ہوں گے۔ یہاں موقع نہیں ہے کہ میں اس ضمن میں تفصیل کے ساتھ ملک کے سربرآوردہ شخصیتوں کے خیالات پیش کرسکوں لیکن ذیل میں بہ طور نمونہ ایک دو اقتباسات درج کیے جاتے ہیں، ان سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ مغرب زدگی کے خلاف ملک میں کافی ردعمل شروع ہو چکا ہے اور یہ مستقبل کے لیے ایک فال نیک ہے۔

ڈی.اے.وی.کالج دہرہ دون کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر کی.ان.کاٹجو نے فرمایا:

> ''مغربی ممالک میں کسی شخص کی قدر و قیمت جانچنے کا معیار دولت جمع کرنا ہے لیکن ہندستان میں اس کا پیمانہ یہ ہے کہ اس نے کس قدر ترک و تیاگ سے کام لیا ہے، پراچین کال کے ہندستان میں فقر اور گرو ہم معنی اصطلاحیں تھیں اور ایک استاد کی بڑائی اس کے فقر میں مضمر تھی۔ ملک کا بڑے سے بڑا شخص بھی اس کی عزت کرتا تھا۔ لیکن موجودہ دور کا معاشرہ جو مغرب کی نقالی کر رہا ہے اور اپنی روح کو کھو چکا ہے اُس طرح اساتذہ کے ساتھ معاملہ نہیں کر رہا ہے۔

مغرب نے سائنس کے میدان میں بڑی ترقی کی ہے لیکن وہ دل کے سکون وطمانیت سے محروم ہوگیا ہے، ڈر اور خوف ترقی پر ہے۔ جن لوگوں کے پاس ایٹم بم ہے وہ بھی اپنی تباہی سے اتنے ہی خوف زدہ ہیں جتنے کہ وہ لوگ جن کے پاس ایٹم بم نہیں ہے۔ ٹائی فائڈ، انفلوینزا اور دق جیسی بیماریوں پر تو بہت بڑی حد تک قابو پالیا گیا ہے، لیکن تفکرات نے نئی نئی اور زیادہ مہلک بیماریاں مثلاً دل کی تکالیف اور بلڈ پریشر وغیرہ کو جنم دے دیا ہے، اس سے نکلنے کی تدبیر صرف یہی ہے کہ اپنے دل ودماغ پر کنٹرول (ضبط) کیا جائے اور اس سلسلے میں پرانی کتب بہت اچھی رہنما ثابت ہوسکتی ہیں۔''

(ہندستان ٹائمز مارچ ۱۹۵۲ء)

ڈاکٹر امرناتھ جھا مشہور ماہر تعلیم نے سناتن دھرم کالج کان پور میں اپنے خطبۂ تقسیم اسناد میں فرمایا:

''کسی خاص فن میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کے مقابلے میں، ہر فن کی تھوڑی بہت معلومات حاصل کرنا، ہماری تعلیمی پالیسی کا اہم مقصد ہونا چاہیے اور مذہب کو اس کی پوری آزادی ملنی چاہیے کہ وہ ہمارے نوجوانوں کی زندگی کو ہمارے بلند مقاصد اور عظیم الشان روایات کے مطابق ڈھالنے میں اپنا مقدس فریضہ انجام دے سکے...

کچھ لوگ موقع بے موقع سیکولر اسٹیٹ کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور اس کی مدح و منقبت کرنے سے کبھی نہیں تھکتے۔ اگر سیکولر اسٹیٹ سے ان کا منشا یہ ہے کہ اس میں مذہب کو کوئی مقام حاصل نہیں ہونا چاہیے یا خدا کو اس سے جلاوطن کردینا چاہیے یا یہ کہ مذہب کے بارے میں ہر قسم کی گفتگو اس میں جرم یا گناہ ہے تو اس پر ضبط کرنا ممکن نہیں، وطن کی اصل ضرورت یہ نہیں ہے کہ یہاں مذہب کم سے کم ہو بلکہ یہ ہے کہ یہاں اصلی اور خالص مذہب زیادہ سے زیادہ پایا جائے۔ سیکولر اسٹیٹ کا مطلب اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ حکومت کو تمام مذاہب کے پیرووں کے ساتھ ایک ہی قسم کا سلوک کرنا چاہیے اور مذہب ومعتقدات کے اختلاف کی بنا پر ان میں کسی قسم کا فرق و امتیاز روا نہیں رکھنا چاہیے۔

اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندستان ابتداء عہد تہذیب ہی سے ایک سیکولر اسٹیٹ رہا ہے، اشوک کے زمانہ کے کتبات اس کا بین ثبوت ہیں، دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا ہے وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔
اشوک، منو دھرم یعنی مذہب انسانیت کا مبلغ تھا جس کے خاص اصول یہ تھے، خدا کا عقیدہ، روح کے غیر فانی ہونے کا عقیدہ، انسان اور ہر جاندار چیز کا احترام اور یہی ہر مذہب کے بنیادی اصول ہیں۔"

موجودہ تعلیم کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جھا نے فرمایا کہ "موجودہ نظام تعلیم ناقص بھی ہے اور ضروریات کے لیے ناکافی بھی۔ یہ بے خدا تعلیم ہے۔ آج کل کی یونی ورسٹیوں سے جو لوگ فارغ ہو کر نکلتے ہیں وہ اخلاقی معیار اور زندگی کی صحیح اقدار کا کوئی خاکہ ذہن میں نہیں رکھتے۔ وہ کذب اور دروغ گوئی سے محبت رکھتے ہیں اور حق کے مقابلے میں مصلحت کوشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی برتتے ہیں۔ ان کا طرز عمل غلط کارانہ اور غیر ایمان دارانہ ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے ایک بے خدا تعلیم کا جو جسم اور دماغ کے ارتقاء اور نشو ونما پر تو بے انتہا زور دیتی ہے لیکن روح کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے، استادوں اور افسروں کے لیے کوئی جذبۂ احترام باقی نہیں رہ گیا ہے، اس بدقسمتی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے روزمرہ کے کام ایک خدا ترس انسان کی طرح انجام نہیں دیتے، ہندستان کو خوش حالی کی راہ پر گامزن ہونا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگ اعلیٰ مقاصد وروایات کے حامل بنیں اور مذہب کو یہ مقام حاصل ہو کہ وہ اپنا مقررہ فرض آزادی کے ساتھ انجام دے سکے۔ صحیح رویہ پر ہمیشہ زور دینے کی ضرورت ہے، اگر مذہبی تعلیم صحیح طرز پر دی جائے تو وہ ایسے لوگ مہیا کرے گی جو معاشرہ کے لیے بے حد قیمتی ثابت ہوں گے۔" (ہندستان ٹائمز ۱۸/ جنوری ۱۹۵۱ء)

ڈاکٹر جھا کے یہ خیالات بنیادی طور سے ہمارے نقطۂ نظر سے بہت قریب ہیں۔ انھوں نے مذہبی تعلیم کی ضرورت ہی واضح نہیں کی ہے بلکہ اس پر جو سب سے بڑا اعتراض کیا جاتا ہے اس کا ازالہ بھی انھوں نے بہت خوب صورتی کے ساتھ کر دیا ہے، عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ مذہبی تعلیم اختلافات ومناقشات کا دروازہ کھولتی ہے لیکن درحقیقت یہ مذہب سے ناواقفیت اور

اس کو اپنے اغراض کے لیے آلۂ کار بنانے کا نتیجہ ہے، مذاہب کی بہت سی باتیں جیسا کہ ڈاکٹر جھا نے کہا ہے مشترک ہیں اگر مذہب کے رائج الوقت تصور سے الگ ہوکر ان بنیادی باتوں کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ اختلافات پیدا نہیں ہوں گے بلکہ موجودہ اختلافات بھی ختم ہوسکتے ہیں، بلکہ اگر مذہب کی بنیادی باتوں کا حقیقی شعور واحساس پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ہر مذہب والوں کو ان کے اپنے مخصوص مذہب کی تعلیمات حاصل کرنے کی سہولتیں بھی مہیا کردی جائیں تو بھی کوئی نقصان کا پہلو پیدا نہیں ہوسکتا۔ مذہب کے سارے فتنے درحقیقت غلط مذہبیت کا ثمرہ ہیں، اس لیے اس کے نتائج کے پیش نظر خالص اور حقیقی مذہب کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

بہ ہرحال ان خیالات کو عام کرنے اور ان کے حق میں رائے عامہ ہم وار کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک میں بحمداللہ بہت کافی ایسے لوگ ہیں جو موجودہ نظام تعلیم و تربیت میں زبردست تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور اس میں دینی واخلاقی اقدار کوسموئے جانے کے قائل ہیں اور ایسے لوگ بھی بہت ہیں بلکہ بعض بااثر اور منظم جماعتیں ایسی ہیں جن کے مخلصین کو آسانی کے ساتھ اس کا قائل کیا جاسکتا ہے کیوں کہ جن فقروں پر ان کی بنیاد ہے ان کا تقاضا یہی ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ خود مسلمان ہی اس ضرورت کے احساس میں پیچھے ہیں یا احساس رکھتے ہیں تو احساس کم تری ان پر اس درجہ غالب ہے کہ اس کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں، ڈاکٹر جھا نے موجودہ بے خدا تعلیم پر جس بے باکی کے ساتھ تبصرہ کیا ہے اس کو سامنے رکھیے اور اس کے مقابلے میں ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے حالیہ اجلاس منعقدہ علی گڑھ کی تجاویز پر ڈالیے۔ جو بات ڈاکٹر جھا فرمارہے ہیں اس کو پیش کرنے میں شرکاء کانفرنس کو ان سے بھی کچھ آگے ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ یہ خالص خدا پرست لوگ ہیں اور شرکاء کانفرنس میں خیر سے متعدد چیدہ علماء بھی شریک رہے ہیں لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ ان کے یہاں سرے سے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے بلکہ اگر کچھ ہے تو اس سے موجودہ حالت پر اطمینان ہی کا اظہار ہوتا ہے۔ مسلم نقطۂ نظر سے بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے وہ یہ عرض داشت ہے کہ ''چوں کہ جمہوریہ ہند ایک سیکولر اسٹیٹ ہے اس لیے ہند کے مدارس نصاب میں ایسی کتابیں رائج نہیں ہونی چاہئیں

جن میں کسی خاص مذہب کی تلقین یا تنقیص ہو"۔ گویا نظام تعلیم کی بنیادی خرابی بس یہی ہے اور اگر اس کی اصلاح کردی جائے تو پھر وہ ہمارے لیے ہر طرح قابل قبول ہو جائے گا یا ممکن ہے وہ یہ خیال کررہے ہوں کہ دیگر خرابیوں کی اصلاح کی ذمہ داری ڈاکٹر جھا جیسے لوگوں پر ہے اور ان کا وظیفہ بس اتنا ہی ہے کہ سیکولرزم کی دیکھ بھال کرتے رہیں، اور اس کے خلاف کچھ ہورہا ہو تو دست بستہ حکومت کو توجہ دلائیں۔

(ب) اوپر جس ضرورت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ظاہر ہے پیش نظر مقصد کے لیے وہی کسی حد تک کارآمد ہوسکتی ہے، لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کام کی اگر کوئی باقاعدہ تحریک شروع بھی ہوسکی تو ایک طویل عرصہ کے بعد ہی اس کے کچھ نتائج برآمد ہوسکیں گے، اس لیے اس جدوجہد کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش یقیناً ہونی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہے موجودہ نصاب تعلیم کی وہ خرابیاں رفع ہوسکیں جو مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کے لیے تکلیف دہ ثابت ہورہی ہیں مثلاً یہ کہ ریکھا نامی جیسی کتابیں جن میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اشتعال انگیز باتیں درج ہیں، داخل نصاب ہیں یا نصاب تعلیم کے ذریعہ ایسے خیالات وعقائد کی تلقین کی جاتی ہے جن سے حکومت کی غیر جانب داری کے دعویٰ پر بھی حرف آتا ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جس تجویز کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ اس پہلو سے یقیناً ایک مفید تجویز کہی جاسکتی ہے بشرطیکہ اس کے سلسلے میں کوئی عملی اقدام بھی کیا جائے، اس طرح کی کوششوں سے فی نفسہٖ کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا، البتہ یہ بات غلط ہے کہ مرض کی اصل جڑ کو تو باقی رکھا جائے بلکہ اس کو اور زیادہ مضبوط بنانے کی فکر کی جائے لیکن اس کی کسی ایک شاخ اور اس کے پھول پھل پہ اظہار بے زاری کیا جائے اور محض اس کی تراش خراش کے لیے باغ کے رکھوالوں سے منت سماجت کی جائے اور اس سے زیادہ اس کے سلسلے میں بھی کچھ اور نہ کیا جائے۔

(ج) اسی طرح یہ کوشش بھی کسی درجے میں مفید ہوسکتی ہے کہ جو مسلمان طلبہ ان لادینی تعلیم گاہوں کا جو درحقیقت دین وایمان کی قتل گاہیں ہیں، رخ کرتے ہیں ان کو حتی الوسع دین سے زیادہ سے زیادہ آگاہ کرنے کی کوشش کی جائے، اس غرض کے لیے کسی درجے میں وہ تدبیر بھی مفید ہوسکتی ہے جس کو مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے اپنی کتابوں اور مضامین میں

پیش فرمایا ہے، یعنی اسکولوں اور کالجوں کے ساتھ ایسے اقامت خانے قائم کیے جائیں جہاں ان کی مذہبی تعلیم وتربیت کا بندوبست ہو اور کسی درجے میں وہ تدبیر بھی جو جمعیۃ العلماء کے سامنے ہے، یعنی ایسے مکاتب کا اجراء جہاں اس قسم کے طلبہ اوقات درس سے پہلے یا بعد، کچھ دین و اخلاق کی باتیں سیکھ سکیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ ان کی لمبی چھٹیوں میں ان کی دینی تعلیم کا کوئی معقول بندوبست کیا جائے، ہر چند تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ اس طرح دین کا جو زادِ راہ طلبہ کے ساتھ کر دیا جاتا ہے وہ ان کے لیے آیندہ غیر دینی مراحل سفر میں کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتا، وہ آگے چل کر خود ہی اس گٹھری کو اتار پھینکتے ہیں لیکن بہ ہر حال ممکن ہے، اس سے کچھ طلبہ جن کی فطرت بھی ان کی پاسباں ہو کچھ فائدہ اٹھا سکیں اس لیے اس سے بھی فائدہ اٹھایا جائے۔ البتہ اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی کوشش ہونی چاہیے کہ اس طرح کے مکاتب کے اجراء کے ساتھ مسلمانوں کے اپنے گھروں کا ماحول ٹھیک ہو جائے جہاں کے اثرات زیادہ قوی اور دیرپا ہوتے ہیں، اس کے فائدے ان شاء اللہ اس قسم کے مکاتب اور اقامت گاہوں سے بھی زیادہ وسیع اور بہتر ثابت ہوں گے۔

(۲) دینی تربیت کا نظم

دوسرا مانع بدعملی یا عملی کوتاہیاں ہیں اور اس کی طرف بھی بیش از بیش توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔ دینی تعلیم کا تو خیر کچھ تھوڑا بہت رواج بھی ہے لیکن جہاں تک صحیح دینی تربیت کا تعلق ہے، اس کا تقریباً فقدان ہے اور اگر کچھ اس کا نظام پایا بھی جاتا ہے تو اس کو زیادہ سے زیادہ تھوڑے سے افراد کی اصلاح وتزکیہ کا نام دیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اس طور کا تزکیہ کہ وہ ہماری ملی ضروریات کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ ہمارے جو اسکول اور کالج جدید طرز کے ہیں ان میں جب دینی تعلیم کا داخلہ ہی ممنوع ہے تو اس کی تربیت کا کیا انتظام ہو سکتا ہے، رہے دینی مدارس تو ان کا حقیقی مدعا تو یہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ اپنے طلبہ کو دینی اصلاح وتربیت سے پوری طرح آراستہ کر کے نکالیں لیکن وہاں بھی اس کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے، ہر ادارہ نے اپنے سامنے کچھ مخصوص اغراض ومقاصد رکھ لیے ہیں جو ملّی ضروریات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں

ہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے ان سے بہ راہِ راست یا بالواسطہ طور سے متصادم بھی ہیں اور انہی اغراض ومقاصد کے پیش نظر وہ اپنے طلبہ کو تیار کرتے ہیں اس لیے ان سے بھی مطلوبہ مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہوتا۔ خانقاہوں میں جس اصلاح وتربیت کا انتظام ہے وہ بھی بالعموم قابل اطمینان نہیں ہے، اس تربیت کا بہتر سے بہتر ثمرہ جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ انفرادی زندگی میں صالح اور متقی بن جاتے ہیں لیکن ان کا صلاح وتقویٰ دین کے ایک خاص دائرہ میں محدود ہوتا ہے اس کے باہر ان میں اور عام مسلمانوں میں کوئی نمایاں فرق عام طور سے نظر نہیں آتا۔ اور یہ بات تو تقریباً سرے سے مفقود ہی ہوتی ہے کہ وہ شہادت حق کو اپنا فریضۂ زندگی سمجھ کر اس کے لیے کوئی عملی جدوجہد دکھلائیں اور اس سلسلے میں ایثار وقربانی یا جرأت وہمت کا کوئی مظاہرہ کرسکیں، ان حالات میں جن کا تذکرہ انتہائی دکھ کے ساتھ ہم نے کیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں کی نگاہ، حالات پر ہوگی وہ اس کے سلسلے میں غالباً ہم پر مبالغہ یا تنقیص کا الزام عائد نہیں کرسکیں گے، یہ بہت ضروری ہے کہ تربیت کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کی جائے۔

ہمارے نزدیک تربیت میں مقدم چیز اس کے مقاصد کی تعیین ہے اور اس ذیل میں امت کی موجودہ ضروریات کو دیکھتے ہوئے ہمارے نزدیک حسب ذیل باتیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔

(الف) مسلمانوں کی ذہنی وفکری تربیت اس حیثیت سے کہ دین میں رسوخ واستحکام پیدا ہو اور وہ اپنی ملی تہذیب اور اس کی خصوصیات سے اس طرح آگاہ ہوجائیں اور ان کے ساتھ ان کا اتنا قلبی لگاؤ ہوجائے کہ وہ عہد حاضر کے نظر فریب نظریات اور اس کی تہذیبی خصوصیات کے اثرات بد سے اپنے کو محفوظ رکھ سکیں۔

(ب) ہمارے معاشرہ میں جاہلیت کی جتنی باتیں بھی گھس آئی ہیں ان کے خلاف ان میں نفرت وحقارت کا جذبہ پرورش پاسکے اور وہ ان سے اپنے کو اور اپنے بھائی بندوں کو پاک کرنے کے لیے عملاً آمادہ ہوسکیں۔

(ج) افلاس، جہالت اور غلامی کی بہ دولت ان میں جو عملی کم زوریاں مثلاً حرص، طمع، خودغرضی اور بے حسی وغیرہ پیدا ہوگئی ہیں، ان کا ازالہ ہوسکے۔

(د) ان میں ایسے اوصاف پیدا ہوسکیں جو اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہیں تاکہ وہ اپنے

اجتماعی مقاصد کی حفاظت کے لیے اور اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے اجتماعی کوششیں کرسکیں۔

(ہ) اجتماعیت کونقصان پہنچانے والوں اور نقصان پہنچانے والی چیزوں کو جاننے پہچاننے لگیں اوران کے خلاف ان کے دل میں اس طرح نفرت بیٹھ جائے کہ ان کوان کے معاشرے میں درخور حاصل کرنے کا کوئی موقع دستیاب نہ ہوسکے۔

(و) ان میں وہ مومنانہ اوصاف پیدا ہوجائیں جو اپنے ملی مفاد کے تحفظ اور باطل سے نبرد آزما ہونے کے لیے ضروری ہیں، ان مقاصد کے تحت تربیت کا کام ظاہر ہے بہت دشوار ہے کیوں کہ اس کے لیے جن وسائل و ذرائع کی ضرورت ہے وہ سردست مسلمانوں کو حاصل نہیں ہیں، اس لیے بہ حالات موجود کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیے اور یہ اس وقت بھی ناممکن نہیں ہے کہ

(الف) ہر شخص جس کو موجودہ ضروریات کے تحت اس قسم کی تربیت کا احساس ہے وہ ازخود اس کے مطابق اپنی اصلاح کی کوشش کرے اور جہاں تک اس کے امکان میں ہو دوسروں کو بھی اس پر آمادہ کرے۔

(ب) جو جماعتیں اس ضرورت سے متفق ہوں اور عملاً اس کو کر نہ رہی ہوں یا اس کی طرف پوری طرح متوجہ نہ ہوں وہ اس کو اپنے پروگرام میں داخل کریں اور اس طرف زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کریں۔

(ج) تعلیمی ادارے اور خانقاہیں جہاں کسی نہ کسی مقصد کے لیے تربیت کا بندوبست ہے وہ اس کے مطابق تبدیلیاں کرلیں ہمارا خیال یہ ہے کہ اوپر جن اغراض ومقاصد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان سے کسی سمجھ دار انسان کو اختلاف نہیں ہوسکتا، ان میں سے ہر بات جیسا کہ اس سے پہلے تفصیل سے واضح بھی کیا جاچکا ہے ہمارے فرائض مذہبی کا ایک جز ہے، نیز انہی پر ہماری آئندہ ملّی بقا وتحفظ کا دارومدار بھی ہے اس لیے اگر ہم اپنی موجودہ غفلتوں اور چھوٹے چھوٹے معاملات و اختلافات میں اپنا وقت ضائع کرتے رہے اور اس ضروری کام کی طرف ہم نے توجہ نہیں کی تو ممکن ہے موجودہ دور

کے مسلمان اپنے دین وایمان پر قائم رہ جائیں لیکن اس نسل کے بعد ہی جو نسل اٹھنے والی ہے اس میں شاید اسلام کے نام کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں رہ جائے گی، اور اتنی بات تو یقینی معلوم ہوتی ہے کہ بہ حیثیت امت ہندستان میں ان کو کوئی مقام حاصل نہیں ہوگا۔ لاقدر اللہ۔

(۳) مغربیت کا انسداد

تیسرے مانع کے ازالہ کے لیے ضروری ہے کہ یورپ کی ذہنی غلامی سے ہندستان اور بالخصوص مسلمانوں کو آزاد کرانے کی کوشش کی جائے، اس غلامی کے جو اثرات خاص طور سے قابل توجہ ہیں حسب ذیل ہیں:

(الف) دین سے بے تعلقی جس کا ایک شاخسانہ تفریق دین وسیاست بھی ہے کیوں کہ اس تفریق کے بعد اوّل تو دین کو زندگی کے وسیع حدود سے جلا وطن ہوکر اس کے ایک نہایت تنگ ومحدود دائرہ کے اندر گزر کرنی پڑتی ہے، جس کی وسعت مسجد ومندر کی وسعت سے زیادہ نہیں ہے اور پھر اس محدود وتنگ دائرہ میں بھی اس کو چین اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا، لادینیت باہر سے اس کو برابر ڈراتی دھمکاتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ بے چارہ اپنے حدود میں بھی بے جان اور نیم مردہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ دین سے اس بے تعلقی یا بے جان تعلق کے جو اثرات ونتائج مرتب ہو رہے ہیں وہ مختصراً یہ ہیں کہ ہماری سیاست مکر وفریب کا مجموعہ بنتی جارہی ہے جس کے تازہ نت نئے مظاہرے حالیہ الیکشن میں پوری طرح کھل کر سامنے آگئے ہیں، جس میں ہر پارٹی نے اپنی حریف پارٹی کو شکست دینے کے لیے وہ سب کچھ کیا جس کو دنیا کا کوئی دین یا اخلاق پسندیدہ قرار نہیں دے سکتا اور دین کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ سیاست کے جو کھیل بھی کھیلے گئے ہیں دین ہر قدم پر اس کی خدمت گزاری کے لیے موجود رہا ہے، یہاں تک کہ مسلمانوں میں اگر کچھ علماء نے دین کے نام پر کانگریس کی حمایت کے فتوے دیے ہیں تو دوسرے علماء نے اسی دین سے راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ یا سوشلسٹ اور کمیونسٹ

پارٹیوں کی تائید کے بھی پہلو نکال لیے ہیں حالاں کہ دین کو ان میں سے کسی کی حمایت وتائید سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ سب دین کے نام پر غیر دینی کاروبار ہیں جو محض اس لیے ظہور میں آئے ہیں کہ ہمارے دین دار بھی باطل سیاست میں پڑ کر اہل باطل ہی کے طور طریق کی تقلید کو ہنر سمجھنے لگے ہیں، دین کا کچھ ایسا ہی انجام عمل کے دوسرے میدانوں میں بھی نمایاں ہے۔ دین داری اور اخلاق کا گویا جنازہ نکل گیا ہے اور کہیں ان کا نام سنائی بھی دیتا ہے تو بالعموم کسی بے دینی یا بداخلاقی کی تائید ہی کے لیے اور یہی مغربی تہذیب کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔

(ب) قوم پرستی، جس نے اخلاق وکردار کے سارے مسلمہ قدیم اقدار کو تہس نہس کر کے رکھ دیا ہے، اس کے تحت حق وہ ہے جو قوم کے لیے مفید ہو اور ناحق وہ ہے جس سے اسے کسی طرح کا نقصان پہنچے اور مغربی تہذیب کے زیر اثر ہندو اور مسلمان دونوں ہی کم و بیش اس کا شکار ہیں اور یہی فلسفہ آج تمام دنیا میں چھایا ہوا ہے جس کے کڑوے کسیلے پھل قوموں قوموں کی باہمی منافرت اور جنگ و جدال کی شکل میں ہر جگہ نمودار ہو رہے ہیں اور دنیا ان کا مزا چکھ کر منہ بسور رہی ہے لیکن ان سے مفر کی کوئی راہ اسے سوجھائی نہیں دیتی۔

(ج) حاکمیت جمہور جس کے تحت یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ انسان اپنے معاملات کی سربراہی کے لیے کسی آسمانی ہدایت کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ اپنی قسمت کا خود مالک ہے۔ وہ ہر حیثیت سے آزاد ہے اور اس قابل ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے معاملات جس طرح چاہے انجام دے۔

مغربی تہذیب کے یہ تین خصوصی تحفے ہیں جو عصر حاضر کی جملہ خرابیوں کی اصل جڑ ہیں لیکن ان کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ آج تمام دنیا، مسلمان ممالک سمیت انھیں کی گرویدہ ہے، حالاں کہ ایک مسلمان جس کو اسلام کی تھوڑی سی بھی واقفیت حاصل ہو وہ جان سکتا ہے کہ امر اول وہ سب سے بڑی گم راہی ہے جس کو مٹانے کے لیے اسلام آیا ہے اور قوم پرستی کا جو مفہوم دنیا میں رائج ہے اسلام کی تعلیمات اس سے بہ راہ راست متصادم ہوتی ہیں کیوں کہ اسلام رنگ، زبان

اور نسل و نسب کی بنا پر کسی تفریق کا قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک تمام بنی نوع انسان ایک آدم اور ایک حوا کی اولاد ہیں اس لیے ان ظاہری اختلافات کی بنیاد پر ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا جاسکتا، فرق و امتیاز کا مبنی صرف ایک ہی ہے اور وہ تقویٰ ہے۔

وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (الحجرات: ۱۳)

"اور ہم نے تم کو خاندانوں اور قبیلوں کی شکل دی تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، (ورنہ) یقیناً تم میں سب سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔"

اسی طرح اسلام میں حاکمیت جمہور کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حاکم صرف اللہ ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف: ۴۰) اور انسان دنیا میں اس کے نائب کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اسے اپنی من مانی کرنے کا کوئی حق اور اختیار نہیں ہے اور نہ درحقیقت وہ اپنی عقل و فکر کی محدود صلاحیتوں کے ساتھ اپنے مسائل کو حل ہی کرسکتا ہے۔ یہ باتیں بالکل واضح ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مغربی افکار کے غلبہ و تسلط نے ہمارے ایمانی عقائد کی بنیادیں بھی ہلا دی ہیں بہ ہر حال یہ صورت حال دینی و ملّی نقطۂ نظر سے انتہائی تشویش ناک ہے اور اس کی اصلاح کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلے میں دو تین باتیں ازبس ضروری ہیں۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ یورپ نے جو نظریہ و خیال بھی پیش کیا ہے اس کے پیچھے وہ دلائل کا انبار رکھتا ہے اس لیے اس کی تردید کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہوسکتی کہ آپ اس کی مذمت کردیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کا قرآن و سنت کے خلاف ہونا ثابت کریں، یہ باتیں ان لوگوں کے لیے تو بلاشبہ کافی ہوسکتی ہیں، جن کا قرآن و سنت پر ایمان مستحکم ہو لیکن ایسے لوگ کتنے ہوسکتے ہیں؟ مغربی افکار کا اثر کچھ جدید تعلیم یافتہ لوگوں ہی میں محدود نہیں ہے ان سے وہ لوگ بھی کسی نہ کسی درجے میں متاثر ہیں جو بہ ظاہر ان کے دائرۂ اثر سے دور اور محفوظ ہیں، ایسے تمام لوگ صرف اسی وقت مطمئن ہوسکتے ہیں جب یورپ کے ایک ایک غلط نظریہ کو لیا جائے اور ان سے زیادہ مضبوط دلائل کے ساتھ ان کی غلطیاں واضح کر کے دکھا دی جائیں، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے جسے ہر شخص انجام دے سکے، یورپ کے افکار و نظریات پر

تنقید فی نفسہٖ کوئی مشکل کام نہیں ہے، یہ پہلے بھی کچھ مشکل نہیں تھا، صرف مرعوب ذہن و دماغ کی بہ جائے آزاد ذہن و دماغ کے ساتھ ان پر غور کرنے کی ضرورت تھی لیکن اب تو تجربات کے آئینے میں وہ اپنے خط و خال کے ساتھ اس طرح نمایاں ہو کر سامنے آگئے ہیں کہ ایک اندھا بھی پہچان لے سکتا ہے کہ ان میں کیا خوبی اور کیا برائی ہے، چناں چہ خود یورپ میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو ایک عرصہ تک اپنی تہذیب کا ڈھنڈھورا پیٹنے کے بعد اب خود دبی زبان سے اس کی برائیوں کا اعتراف کرنے لگے ہیں اور جن ملکوں میں اب تک یورپ سے آئی ہوئی ہر بات بہ منزلہ وحی الٰہی کے تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ ان میں بھی ایسے صاحب نظر پیدا ہونے لگے ہیں جو کھل کر اس کے افکار و نظریات پر تنقیدیں کرتے ہیں، خود ہندستان بھی اس معاملے میں کچھ پیچھے نہیں ہے، چناں چہ اس کے ثبوت میں یہاں کے مفکرین کے بے شمار بیانات پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن خوف طوالت مانع ہے، البتہ جو اصلی دشواری ہے وہ یہ ہے کہ ابھی مسلمانوں میں ایسے صاحب نظر بہت تھوڑے ہیں جو ان پر تنقید کر کے ان کے نقائص کو اس طرح واضح کرسکیں کہ ان کے مقابلے میں اسلامی نقطۂ نظر کی خوبی خود بہ خود نمایاں ہو جائے، ان میں دو ہی طبقے کے لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں ایک وہ جن کی یورپ سے مرعوبیت ابھی دور نہیں ہوئی ہے، یا ہوئی ہے تو محض اس حد تک کہ ان پر شک اور تذبذب کی ایک حالت طاری ہوگئی ہے، دل اس طرف پوری طرح ٹھکتا نہیں اور اسلام کی معلومات بہت تھوڑی ہیں اس لیے وہ درمیان ہی میں لٹک رہے ہیں یا وہ لوگ ہیں جو مذہبی معلومات سے تو مالا مال ہیں اور وہ کیوں اور کس طرح اسلامی نظریات سے متصادم ہیں، ان کو اپنے قصوں جھگڑوں سے فرصت ہی نہیں ہے کہ وہ ان مسائل کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوں۔ ایسی حالت میں آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ خالص تنقید کی حد تک بھی کام کتنا دشوار ہے۔

(۲) دوسری اہم ضرورت اسلامی تہذیب کی ٹھوس بنیادوں پر ایک ایجابی عمومی تحریک شروع کرنے کی ہے۔ مغربی تہذیب ایک عمومی تحریک کی حیثیت رکھتی ہے، جس کی پشت پر سیاست، حکومت اور پروپیگنڈا کی بے پناہ قوت ہے اس لیے اس کا مقابلہ خالی تنقیدوں سے نہیں ہوسکتا۔ یہ چیز اگر مرض کا کوئی علاج ہوتی تو یہ مرض ہندستان میں اتنی وسعت اختیار ہی نہیں کرسکتا تھا، اس تہذیب سے نفرت کرنے والے لوگ ابتداء میں تو بہت زیادہ رہے ہیں اور اب بھی ان

کی تعداد کچھ کم نہیں ہے اور علمی انداز میں تنقیدیں کرنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں رہی ہے ہمارے بہت سے مصنفین نے اس موضوع پر تصنیفات کا انبار لگا دیا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ مرض سیلاب کی طرح برابر بڑھتا ہی رہا۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اس سیلاب کو تنقیدوں کا بند لگا کر روکنے کی تو ضرور کوشش کی گئی لیکن اس طرف بالکل توجہ نہیں کی گئی کہ سیلاب کو سیلاب ہی سے روکا جا سکتا ہے اس لیے تنقیدوں کے ساتھ یہاں اسلام کے بنیادی اصولوں یعنی خدا پرستی، جزا وسزا اور وحدت بنی آدم کی بنیادوں پر ایک ایسی ٹھوس تہذیبی تحریک شروع کرنے کی ضرورت تھی جو اس تحریک کا مقابلہ کر سکتی، کسی مقابل کی تحریک کے نہ ہونے کی صورت میں اکثر لوگوں کا اس میں بہہ جانا ایک بالکل قدرتی بات ہے اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک چیز سے نفرت رکھتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں کیوں کہ ان کو اس کی بہ جائے اختیار کرنے کی کوئی دوسری چیز نہیں ملتی، اور ہمارا یہی بنیادی نقص مغربی فکر وتہذیب کے غلبہ واستیلاء کی اصل علّت ہے، دنیا میں اور خود مسلمان ملکوں میں اس کو جو عروج حاصل ہوا ہے اس کی وجہ کچھ یہ نہیں ہے کہ ان ملکوں کے باشندے سب کے سب اس پر ایمان لا چکے تھے۔ کتنے ایسے تھے جو اس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے اس جذبہ کے تحت اس کو روکنے کی بھی کوشش کیں لیکن چوں کہ کوئی جوابی تحریک اس کے مقابلے میں نہیں تھی اس لیے یہ سب ممالک یکے بعد دیگرے اس سیلاب میں غرق ہوتے چلے گئے۔

(۳) تیسری ضرورت ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جس کے افراد ان اصولوں کے عملی نمونہ ہوں جن کو وہ رائج الوقت اصول ونظریات کی جگہ پر رائج کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی اصول اپنی جگہ کتنا ہی سچا اصول کیوں نہ ہو اگر اس کے پیش کرنے والے اپنے عمل سے اس کی صداقت کی گواہی پیش نہیں کریں گے، دنیا اس کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہو سکتی۔ اور اس کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ عہد حاضر کے نظریات کے ساتھ لوگوں کی عام دل چسپی کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان نظریات کو اپنے زندگی کے مسائل کا حل سمجھتے ہیں اور ان سے ان کو بیّن طور سے کچھ فائدے پہنچتے ہوئے نظر آتے ہیں اس لیے ان نظریات کی بہ جائے دوسرے نظریات کی مقبولیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے کچھ نہ کچھ فائدے نمایاں طور سے دیکھنے لگیں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ان نظریات کے

مطابق زندگیوں میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوں، جن کے آئینے میں کسی شان دار مستقبل کا عکس نظر آنے لگے۔

لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے یہاں اس چیز کی سب سے زیادہ کمی ہے۔ ہماری نگاہ میں ایسی محترم ہستیاں ہیں جن کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے علمی انداز میں مغربی تعلیم وتہذیب کے نقائص بہت عمدہ انداز میں واضح کیے ہیں لیکن ان کو اور ان کے گھر کے ماحول کو آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ جس چیز سے دوسروں کو نفرت دلانا چاہتے ہیں ان کے اختیار کرنے میں وہ بڑے سے بڑے مغرب زدہ سے پیچھے نہیں ہیں۔ خود مسلمانوں کا پچھلا اجتماعی طرزِ عمل بھی اسی حقیقت کا گواہ ہے، ان میں متعدد ایسی جماعتیں اٹھیں ہیں جن کا مقصود اسلام یا مسلمانوں کا تحفظ تھا لیکن ان کی تدبیر کیا خوب تدبیر تھی۔

اہل تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

کتنے مسلمان یا اسلامی ادارے ہیں جو ایک طرف زبان سے یورپ کی تہذیب وتمدن اور اس کے اساسی نظریات سے نفرت بھی ظاہر کرتے ہیں اور دوسری طرف انھی کی بنیادوں پر قائم ہونے والے ہر نظام کے ساتھ، دل وجان سے چمٹے ہوئے بھی ہیں بلکہ اپنے مخصوص دائرہ کے اندر بھی انھی کی پیروی کررہے ہیں۔

یہ ہیں یورپ کے ذہنی غلامی سے نجات کی تدابیر، اب ان کو سامنے رکھ کر آپ کو غور کرنا چاہیے کہ بہ حالات موجودہ یہ کس طرح اور کہاں تک روبہ کار لائی جاسکتی ہیں۔

بہ ہر حال مغربی تہذیب کے یہ فتنے بہت زیادہ توجہ کے مستحق ہیں اور خصوصیت سے اس بنا پر کہ مغربی تہذیب کے بنیادی نظریات کی اساس پر جو جدید سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام ہائے زندگی عملاً قائم ہوئے ہیں، وہ اپنی اندرونی خباثتوں اور عملی ہلاکت آفرینیوں کی بنا پر دین، اخلاق اور انسانیت سب کے لیے انتہائی تباہ کن ہیں، اور ان دونوں نظاموں میں اس وقت خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے لیے دوسرا یعنی اشتراکی نظام زندگی، زیادہ قابل توجہ ہے کیوں کہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی تو خود اپنی موت آپ مر رہا ہے اور یہ نظام تیزی کے ساتھ اس کی

جگہ لیتا جارہا ہے۔ دنیا میں بھی اس کے اثرات چھاتے جا رہے ہیں اور جیسا کہ حالیہ الیکشن نے واضح کردیا ہے، خود ہمارا ملک بھی اسی کی لپیٹ میں آتا جارہا ہے اور بہ ظاہر یہاں کے حالات اس کے لیے سازگار نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ملک میں غربت وافلاس کی فراوانی ہے اور دوسری طرف جو لوگ اس سیلاب کو روکنے کی قوت اور ذرائع ووسائل رکھتے ہیں، وہ متعدد وجوہ سے اس سیلاب کا مقابلہ کرنے سے عملاً عاجز ہیں اور تیسری طرف ان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ جو علم برداران اسلام واقعتاً اس سیلاب کو روک سکتے تھے کیوں کہ وہ اپنے پاس معاشی لحاظ سے بھی اشتراکیت سے بہتر نظام زندگی رکھتے ہیں وہ بھی اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں۔ یادر پردہ اس کے استقبال کی تیاریاں کررہے ہیں۔ ان وجوہ کو سامنے رکھیے اور اس کے ساتھ ہی اشتراکیوں کی فکری وعملی سرگرمیوں اور ان کی جاں فشانیوں کو، آپ کو بین طور سے نظر آجائے گا کہ ہندستان میں شاید یہ آخری موقع ہے کہ یا تو اسلام کو اس حیثیت سے نمایاں کیا جائے کہ وہی یہاں کے جملہ مسائل کا حقیقی حل ہے۔ پھر اس سے خوانخواستہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھولیا جائے۔ اس بناپر اوپر مغربی تہذیب کے انسداد کے سلسلے میں جن تدابیر کا ذکر کیا گیا ہے ان کو جلد سے جلد بہ روئے کار لانے کی کوشش ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر اس فتنۂ عظیم کا انسداد ممکن نہیں ہے۔

(۴) ناسازگاریِ احوال کا تدارک

شہادت حق کی راہ کے موانع میں چوتھی چیز ملکی حالات کی نامساعدت ہے۔ ہمیں اس کا بھی کوئی علاج سوچنا چاہیے بلکہ اس کی فکر دوسرے تمام علاجوں پر مقدم ہے کیوں کہ درحقیقت ملک کے موجودہ ناسازگار حالات ہمارے ہر کام کے سلسلے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہورہے ہیں، جب تک اس رکاوٹ کو بہ طریق احسن دور نہ کیا جائے، ہمارے ہر طرح کے اخلاقی وتعمیری کام میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں گی۔

اس سلسلے میں چند تدابیر نہایت ضروری ہیں جن کو ذیل میں ہم دفعہ وار درج کرتے ہیں۔

یہ تدابیر دوطرح کی ہیں، منفی ومثبت۔ پہلے ہم منفی تدابیر کا تذکرہ کرتے ہیں۔

سازگاری احوال کی منفی تدبیریں

(۱) سب سے پہلے خود اپنے ذہن کو خوف وہراس اور یاس وقنوط سے پاک کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ جذبات صرف اسی لیے بُرے نہیں ہیں کہ یہ انسان اور اس کے قوائے عمل کو مضمحل اور ناکارہ بنادیتے ہیں بلکہ انسان کے کردار پر ان کے کچھ ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں جو دوسروں کو اس کی جانب سے شک وتردد میں مبتلا کردیا کرتے ہیں۔ اگر مسلمان ان کو چھوڑ کر ہمت، جرأت اور عزم وحوصلہ سے کام لیں اور اپنے رویہ کی بنیاد وثوق وقطعیت پر قائم کریں تو اس سے جہاں اور بے شمار فائدے پہنچ سکتے ہیں اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان کے بارے میں یہاں کے غیر مسلموں کا بہت کچھ شک وشبہ از خود رفع ہوجائے گا، اس غرض کے لیے ان تدابیر کو بہ روئے کار لانے کی ضرورت ہے جو ہم خوف وہراس اور مایوسی کے علاج کے سلسلے میں اس سے پہلے لکھ چکے ہیں۔

(۲) ہندستان سے ہجرت یا یہاں قیام کے بارے میں موجودہ تذبذب آمیز رویہ ختم ہوجانا چاہیے۔ جن لوگوں کو شرعی بنیاد پر یا کسی اور وجہ سے یہاں کے قیام پر اطمینان نہیں ہے انھیں یا تو جلد از جلد اپنی بے اطمینانی رفع کرلینی چاہیے یا پھر انھیں وہی کرنا چاہیے جو ان کا دل چاہ رہا ہے، حیص بیص اور تذبذب کی حالت خود ان کے لیے بھی سود مند نہیں ہوسکتی اور اس کا بہت خراب اثر عام مسلمانوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ رہے وہ لوگ جو یہاں کے قیام پر راضی ومطمئن ہیں تو ان کو بھی حتمی طور سے یہ طے کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے ارادہ کی حد تک اسی سرزمین میں رہنا اور مرنا چاہتے ہیں، اور بجز شدید اضطراری حالت یا شرعی وجوہ ہجرت کے پیش آجانے کے اور کسی حال میں ترک وطن کے لیے تیار نہیں ہیں، یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ جو لوگ یہاں رہنا چاہتے ہیں ان میں سے بھی کتنے ہی اپنے مستقبل کے بارے میں پوری طرح یکسو نہیں ہیں۔ اس صورت حال کا افسوس ناک نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کو یہ شک ہے کہ ان کو پوری طرح ملکی سمجھا جائے یا نہیں اور اس شک کے مطابق وہ ان کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں جس سے ان کو طرح طرح کے قومی نقصانات پہنچ رہے ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے اس مسئلے پر گفتگو

کرتے ہوئے ہم تفصیلاً لکھ چکے ہیں اور دوسری طرف اپنے اس تذبذب کی بنا پر خود مسلمان اپنے قیام واستحکام کے ضروری مسائل کی طرف پوری پوری توجہ نہیں دے رہے ہیں اور یہ چیز ان کے مستقبل کے لیے نہایت تباہ کن ثابت ہورہی ہے، اگر ان کے تذبذب کا یہ رویہ ختم ہوجائے تو اس سے جہاں یہ فائدہ پہنچے گا کہ وہ بیش از بیش اپنے ضروری مسائل کی طرف متوجہ ہوسکیں گے وہاں اس کا ایک بین فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان کے بارے میں غیر مسلموں کی وہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی جو ان کے پاکستان دوست ہونے کے مفروضے پر پیدا ہوگئی ہیں اور جن کے لیے کوئی واقعی بنیاد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہندستان کے قیام کے بارے میں ان میں سے بہتوں کا رویہ بہ ظاہر غیر حتمی معلوم ہوتا ہے۔

اس سے پہلے ہم قیام ہندستان کے مسئلے پر شرعی اور عقلی حیثیتوں سے کافی تفصیلی گفتگو کرچکے ہیں، اس موقع پر اس بحث کو سامنے رکھ لینا چاہیے۔ اس سے اس بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے میں ان شاء اللہ مدد ملے گی۔

(۳) ہندستان میں رہتے ہوئے یہاں کے مسائل سے زیادہ پاکستان کے مسائل سے دل چسپی لینا بھی شک و بدگمانی کا موجب ہوسکتا ہے اور ہے اس لیے اس سے بھی حتی الوسع اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔ عالم اسلام کے ساتھ قلبی لگاؤ رکھنا اور فکری حیثیت سے اس کے مسائل سے دل چسپی لینا، ایک بالکل قدرتی بات ہے کیوں کہ اسلام وہ مذہب ہے جس نے اپنی ملت کی بنیاد قوم وملک کی حد بندیوں پر نہیں بلکہ وحدت افکار پر رکھی ہے اور اسی رشتے کو اس نے ہر رشتے سے زیادہ مضبوط اور سچا رشتہ قرار دیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ عالم اسلام کے ساتھ اس حد تک تعلق رکھنا، نہ عقلی حیثیت سے غلط ہے اور نہ یہ کسی آئین وضابطہ کے خلاف ہے بلکہ اس کو ناپسند کرنا انتہائی درجہ تک کی تنگ نظری وتنگ ظرفی ہے، جس کا کوئی عقل مند انسان اس زمانہ میں تصور نہیں کرسکتا لیکن یہ بات دوسری ہے کہ ہم ہندستان میں رہتے ہوئے یہاں کے مسائل سے تو کوئی سروکار نہ رکھیں البتہ شب وروز پاکستان یا کسی دوسرے ملک اور اس کے مخصوص مسائل سے دل چسپی لیتے ہوئے ان پر بحث و مذاکرہ میں اپنا وقت ضائع کریں جس سے حقیقتاً نہ اس ملک کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ بحث کرنے والوں کو ہی کو۔ ہم ایسے ہی تعلق کو غلط سمجھتے ہیں اور اس

سے مسلمانوں کو اجتناب کا مشورہ دیتے ہیں بلکہ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ جب تک ہندستان و پاکستان کے تعلقات شک و بدگمانی پر مبنی ہیں، پاکستان سے ہمیں معمولی تعلق کے سلسلے میں بھی حتی الوسع احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اس میں اپنا اور پاکستان دونوں کا فائدہ ہے۔

(۴) وقوع یا امکان سے بحث نہیں، لیکن ایک اصولی بات کی حیثیت سے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندستان میں رہتے ہوئے ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو واقعتاً ملک دشمنی پر محمول کیا جاسکے، یہ اس حیثیت سے بھی غلط ہے کہ ہندستان میں جو مسلمان رہتے ہیں ان کا ملک کے ساتھ گویا ایک طرح سے معاہدۂ امن ہو چکا ہے اس کے ''نبذ'' (فسخ) کے بغیر ان کے لیے اس کی خلاف ورزی جائز نہیں ہوگی اور یہ اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ ایک مسلمان کا رویہ ہمیشہ مکر وفریب اور بدعہدی اور کذب وغیرہ سے پاک ہونا چاہیے، ملک میں رہتے ہوئے اور وفاداری کے اعلان واظہار کے ساتھ ملک دشمنی کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔

(۵) تقسیم ملک کے بعد یہاں کے حالات میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے اور ان کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی حدود کے اندر اپنے مسلک و رویہ میں معقول تبدیلیاں پیدا کرنی چاہئیں۔ اس ضمن میں سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ قوم پرستی کے جراثیم سے اپنے ذہن و دماغ کو بالکل پاک رکھنا چاہیے۔ یہ چیز پہلے بھی خلاف اسلام ہونے کی بنا پر ترک کیے جانے کے قابل تھی اور موجودہ حالات میں تو اس کا کسی درجے میں بھی باقی رہنا، مسلمانوں کے حال و مستقبل کے لیے انتہائی خطرناک ہے، انگریزی دور حکومت میں بھی اس سے مسلمانوں کو کافی نقصانات پہنچ چکے ہیں لیکن اس وقت اس کی پوری خطرناکیاں اس لیے منظر عام پر نہیں آ سکیں کہ انگریز خود اپنے مصالح کے لیے اس کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اس لیے وہ اپنی حکمت عملی کے ذریعے اس کے نقصانات کا کچھ نہ کچھ تدارک بھی کرتے رہتے تھے تاکہ مسلمان بددل ہو کر اس کو ترک نہ کر بیٹھیں، لیکن اب حالات دگرگوں ہیں، انگریزوں کی طرح کی کوئی تیسری طاقت موجود نہیں ہے جو قوم پرستانہ سرگرمیوں کے نتائج سے محفوظ رہنے میں ان کو کوئی سہارا دے سکے، اب ان کا واسطہ براہِ راست انہی لوگوں سے ہے جن سے وہ اب تک قوم پرستی کی بنا پر کش مکش کرتے رہے ہیں اور وہی اس وقت ملک کے سیاہ وسفید

کے مالک ہیں، ایسی حالت میں اگر وہ اپنا رویہ نہیں بدلتے ہیں تو اس سے غیر مسلموں کی قوم پرستی اور زیادہ بھڑکے گی اور اس سے ایسے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے جن کا مقابلہ کرنا ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہوگا۔

اس تبدیلی کا منشا یہ ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں اپنا قوم پرستانہ نقطۂ نظر چھوڑ کر اسلام کی اصولی باتوں پر اپنے فکر وعمل کی بنیاد رکھیں۔

سب سے پہلے ہمیں اپنا اجتماعی رویہ بدلنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا اجتماعی رویہ کسی بڑے سے بڑے انفرادی رویہ کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اور اس کے نتائج واثرات جلد لوگوں کی نگاہوں میں آجاتے ہیں۔

ہر چند ہندستان کے بدلے ہوئے حالات میں اس بات کا بہ ظاہر کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ مسلمان کسی محدود اجتماعی حیثیت میں بھی قوم پرستی کی راہ پر گام زن ہوسکیں گے، ہندستان میں جو دستور رائج ہے اس میں جہاں بہت سے بنیادی اسقام موجود ہیں، وہیں اس میں خوبی کا بھی، ایک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی مجموعی حیثیت میں ہندو مسلم دونوں طرح کی قوم پرستیوں میں مزاحم ہے چناں چہ الیکشن میں فرقہ پرست جماعتوں کو جو شکست اٹھانی پڑی ہے، اس میں دستور کی اس حیثیت کو بھی بڑا دخل ہے اور جہاں تک مسلم قوم پرستی کا تعلق ہے اس کے لیے تو اور بھی عملی موانع موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود اس بات کا امکان ہے کہ ملک میں جو کچھ مسلمانوں کے سلسلے میں ہو رہا ہے، اس کے رد عمل کے طور پر مسلمانوں میں کسی نہ کسی درجے میں اجتماعی قوم پرستی کا ابھار پیدا ہو۔ اس کا اندیشہ یوں بھی ہے کہ جو لوگ اس قسم کی کسی تحریک میں حصہ لے سکتے ہیں، ان کی اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کا نقطۂ نظر تقسیم سے پہلے قوم پرستانہ رہ چکا ہے اور وہ غالباً اس ایک نقطۂ نظر کے علاوہ کسی دوسرے نقطہ سے، جو مسلم قوم کے لیے مفید ہوسکے، واقف بھی نہیں ہیں، چناں چہ پچھلے دنوں مسلمانوں کے بعض طبقوں میں کچھ اجتماعی کام کرنے کا فوری جوش کئی بار نمودار ہوچکا ہے اور جہاں تک ہم نے ان کے جذبات وحیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، ہمیں ہر بار یہی نظر آیا ہے کہ ان کا جوش قوم پرستی ہی کی ہانڈی کا ابال تھا۔ اس قسم کی چھوٹی بڑی تحریکات کے شروع ہونے کا آئندہ بھی امکان ہوسکتا ہے، اس لیے اس کی طرف سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

اجتماعی رویہ کی اس تبدیلی کے ساتھ افراد کا رویہ بھی بالکل بدل جانا چاہیے۔ افراد یہ سمجھنے کی بہ جائے کہ وہ ایک مسلمان نامی قوم کے افراد ہیں، اس لیے انھیں قوم پرستانہ نقطۂ نظر کے تحت یہاں اپنی قوم کو مضبوط بنانے کی فکر کرنی چاہیے اور اس کے مطابق اپنے حقوق و مطالبات تیار کر کے ان کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے، آئندہ یہ سمجھنا شروع کریں کہ وہ ایک قوم نہیں بلکہ ایک اصولی پارٹی ہیں جن کو قرآن مجید میں حزب اللہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور جس کا اصلی کام دنیا میں یہ ہے کہ وہ حق و عدل کے قیام کے لیے کوشش کرے اور دنیا کو نیکی کی راہ دکھلائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس تصور کے مطابق معمولی تبدیلی کے کیا اثرات و نتائج مرتب ہوتے ہیں، اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ قومی حقوق و مطالبات کی بنا پر کش مکش اور ایک دوسرے سے شکوہ و شکایت کا سلسلہ از خود ختم ہو جائے گا، اسلام کے اصولوں کو اپنانے کے بعد ان کی دل چسپیاں قومی حقوق و مطالبات کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتیں، وہ ان کو خلاف اسلام سمجھتے ہوئے غلط بھی سمجھیں گے اور اپنے مقصد کے لیے حارج و مزاحم بھی، اس لیے وہ ان کی بہ جائے زیادہ اعلیٰ اقدار کے لیے اپنی کوششیں مرکوز کر سکیں گے اور چوں کہ غیر مسلموں کی نفرت کی سب سے بڑی بنیاد یہ قومی حقوق و مطالبات ہی ہیں اس لیے اس تبدیلی کا اثر قدرتی طور پر ان کے موجودہ رویہ پر بھی پڑے گا۔

اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جب نفرت و عداوت کی یہ دیوار درمیان سے اٹھ جائے گی اور مسلمان واقعتاً خلوص کے ساتھ نیکی و تقویٰ کے پھیلانے میں سرگرم کار ہو جائیں گے جس کی مقدم شرط یہ بھی ہے کہ وہ سب سے پہلے خود ان کا نمونہ ہوں، تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہندستان کے باشندے پھر بھی عصبیت ہی کا شکار بنے رہیں گے اور دل سے ان تبدیلیوں کا خیر مقدم نہیں کریں گے، نیکی و تقویٰ انسان کی فطری مرغوبات ہیں، ان کے طلب و پسندیدگی سے کوئی طبیعت انسانی خالی نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں چوں کہ گوناگوں اسباب کے تحت یہ جنس بہت کمیاب ہوگئی ہے اس لیے اس کی قدر بھی اسی نسبت سے بڑھ گئی ہے البتہ اس زمانہ میں دجل و فریب بھی بہت عام ہے اس لیے دنیا پورا اطمینان کر لینے کے بعد ہی کسی نیکی کو نیکی اور تقویٰ کو تقویٰ سمجھ سکتی ہے۔ ان حالات میں قدر و تحسین کی قدرتی تاخیر سے بددل اور بدگمان ہونا صحیح نہیں ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ قوم پرستی کو ترک کرنے کا مطلب یہ نہیں

ہے کہ مسلم قوم سے آپ اپنا ہر طرح کا رشتہ منقطع کر لیں، آدمی جس قوم، قبیلہ اور خاندان میں پیدا ہوتا ہے اس سے ایک خاص حد تک تعلق رکھنا بالکل فطری بات ہے اور اس میں پیدا ہونے سے اس پر اس کے کچھ حقوق بھی عائد ہوتے ہیں جن کو ادا کرنا، انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور یہی بات اسی درجے میں وطن و ملک کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ اس لیے اپنی قوم اور اپنے ملک کے ساتھ دوسروں کے مقابلے میں کچھ خصوصی تعلق محسوس کرنا اور ان کے سلسلے میں اپنے کو کچھ خصوصی ذمہ داریوں کا مکلّف سمجھنا، کوئی غیر معقول بات نہیں ہے البتہ یہ تعلق اور احساس ذمہ داری فطری حدود کے تابع ہونا چاہیے اور ایک مسلمان کے لیے یہ کسی حال میں جائز نہیں ہے کہ قوم یا ملک دونوں میں سے کسی کے سلسلے میں بھی وہ فطری حدود سے تجاوز کر کے ایک انچ بھی آگے قدم بڑھائے۔ آگے بڑھنے کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ اپنی قوم یا اپنے ملک کے ساتھ وہ کوئی بے جا رعایت کر رہا ہے جو کسی دوسرے ملک یا قوم پر ظلم کرنے کے ہم معنی ہے اور یہ خلاف عدل وقسط ہے جو اللہ کی نافرمانی ہے کیوں کہ اللہ نے ہر حال میں عدل وقسط پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے۔ یہی چیز ہے جسے ''قوم پرستی'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ یقیناً خلاف اسلام ہے، اس کے برخلاف پہلی صورت عدل وقسط کے منافی نہیں ہے بلکہ وہ یک گونہ ان کا تقاضا ہے اس لیے وہ ہر طرح جائز بلکہ مستحسن ہے۔ رہی یہ بات کہ بحالات موجودہ اپنی قوم کے ساتھ فطری حد تک تعلق رکھنا بھی بہت سے لوگوں کو ناگوار گزرے گا یا اپنے ملک کے ساتھ جب تک جائز حدود سے کچھ آگے بڑھ کر تعلق نہ جوڑا جائے جس کا لفظ وطن پرستی تقاضا کرتا ہے، ہم فرقہ پرست یا ملک کے لیے، غیر وفادار سمجھے جائیں گے تو ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ مصیبت صرف اس وقت تک کے لیے ہے جب تک مذکورہ بالا معقول رویہ کو مسلمان عملاً اختیار کرتے ہیں، جس دن یہ ہو جائے گا آپ دیکھیں گے کہ اہل ملک ایسے ہی ''فرقہ پرستوں'' اور ایسے ہی ''غیر وفاداروں'' کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے بلکہ شاید ان کی تقلید میں خود بھی ایسے ہی ''فرقہ پرست'' اور ''غیر وفادار'' بننے کی کوشش شروع کر دیں۔ جو لوگ عدل وقسط کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی قوم سے محبت کریں اور اللہ کی وفاداری میں اتنے مستحکم ہوں کہ اس کو ناراض کر کے کسی کو خوش کرنے کی مطلق پروا نہ کریں، ایسے لوگ کسی قوم یا ملک کے لیے اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہیں، ان کے وجود سے ان کو اور ان

کے ساتھ دنیا کو جو فائدے پہنچ سکتے ہیں وہ ان لوگوں سے ہرگز نہیں پہنچ سکتے جو زبانی طور سے قوم و وطن کی محبت کا دم بھریں لیکن وہ اپنے نفس اور مفاد کے غلام ہوں اور موقع ملنے پر اپنی یا اپنی قوم کے چھوٹے سے فائدے پر پوری قوم، پورے ملک بلکہ پوری دنیا کو قربان کردینے پر آمادہ ہوجائیں۔ پس اگر مسلمان صحیح معنوں میں اللہ کا وفادار بن جائیں اور اس کی وفاداری کے جو تقاضے ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک اپنی قوم اور اپنے ملک کے سلسلے میں ادا کرنے لگیں تو یہ قطعی بات ہے کہ یہاں کا بدگمان سے بدگمان شخص بھی ان کی قدر کرنے پر اپنے کو مجبور پائے گا لیکن اگر بالفرض ایسا نہ ہو تب بھی ایک مسلمان کے لیے بہ ہر حال صحیح رویہ صرف یہی ہوسکتا ہے، اس لیے اسے خود فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون سی راہ اس کے اختیار کرنے کی ہے۔ وہ راہ جس میں خدا کی رضا تو یقینی طور سے حاصل ہوسکے گی اور کسی درجے میں اہل ملک کا اعتماد حاصل ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے یا وہ راہ جو یقینی طور سے اس کی ناراضگی کا موجب ہوگی اور اس سے اہل ملک کی خوشنودی کا حصول بھی قطعی اور یقینی نہیں ہے۔ کیوں کہ جو شخص مسلمان ہوتے ہوئے خدا کی وفاداری پر ثابت قدم نہ رہ سکے، اس کی قوم و ملک کی وفاداری پر کوئی احمق ہی ہوگا جو مطمئن ہوسکے، چناں چہ عملاً بھی دیکھ لیجیے ایسے لوگ اپنی وفاداریوں کا لاکھ یقین دلائیں لیکن کوئی اس پر یقین کرنے والا نہیں ہے بلکہ ان کی وجہ سے دوسرے لوگ بھی مشکوک سمجھ لیے گئے ہیں، کیوں کہ ایسے لوگوں کی کثرت ہے اور ان پر ہی سب کو قیاس کیا جاتا ہے۔

سازگاری احوال کی مثبت تدبیریں

ہندستان کے موجودہ ناسازگار اور نامساعد حالات کی اصلاح و تدارک کے ضمن میں اوپر جن تدابیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کی حیثیت محض منفی طریقۂ عمل کی ہے جو بلاشبہ پیش نظر مقصد کے لیے ایک حد تک مفید ہوسکتی ہیں لیکن چوں کہ یہ منفی تدابیر ہیں اس لیے ان کا فائدہ بھی محدود ہوگا، اس لیے ہمیں اصلاح احوال کے لیے ان منفی تدابیر کے ساتھ ایسی مثبت تدابیر بھی اختیار کرنے کی ضرورت ہے جن سے یہ فائدہ زیادہ سے زیادہ حاصل ہوسکے۔ اس غرض کے لیے حسب ذیل تدبیریں ضروری ہیں۔

(۱) مسلمان اپنے مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا جو کچھ بھی تشخص و امتیاز رکھتے ہوں لیکن بہ ہر حال وہ ہندستان کے باشندے ہیں اور اس حیثیت سے ان پر بہت کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کو ادا کیے بغیر وہ ہندستان میں اپنے لیے کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن اس وقت حالت یہ ہے کہ جس طرح مسلمان اپنے مسلمان ہونے کے تقاضوں کے سلسلے میں غفلت یا کجروی کا ثبوت پیش کرتے ہیں اسی طرح ان سے ہندستانی ہونے کے تقاضوں کے سلسلے میں بھی طرح طرح کی کوتاہیاں سرزد ہو رہی ہیں۔ کچھ لوگ اپنے موجودہ حزن و ملال کی بنا پر، جو یہاں کے خاص حالات کی بنا پر ان پر طاری ہو گیا ہے، یا اپنے غلط مذہبی جذبات کے بہ موجب، بہت سی جائز ذمہ داریوں سے بھی پہلو تہی کر رہے ہیں اور کچھ لوگ اپنی اس حیثیت کے تقاضوں کو اس طرح ادا کرنے کی فکر میں ہیں کہ اس کے مقابلے میں مسلمان ہونے کی حیثیت بالکل دب کر رہ جاتی ہے حالاں کہ نہ یہ صحیح ہے اور نہ وہ۔ صحیح راہ اعتدال و توافق کی راہ ہے اور یہ اسی حالت میں ممکن ہے جب ہمارے اندر کوئی ایسا اجتماعی ادارہ ہو جو مسلمانوں کو روزمرہ کے مسائل میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے ٹھیک اس مقصد کے تحت ان کو مشورے دے سکے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ ملی اور زیادہ منتشر ہو گیا ہے، ان میں اگر کچھ چھوٹے بڑے جماعتی ادارے موجود بھی ہیں تو وہ بالعموم افراط و تفریط کے شکار ہیں اس لیے ان سے مطلوبہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق اس کام کے لیے جمعیۃ العلماء بہت زیادہ اہل ہو سکتی تھی کیوں کہ اس کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں، جو دین کا بھی علم رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ان کو ہندستانی ہونے کے تقاضوں کا بھی زیادہ سے زیادہ علم ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ افراط و تفریط سے اس کا دامن بھی محفوظ نہیں ہے۔ تقسیم سے پہلے بھی اس کی روش میں اعتدال مفقود رہا ہے اور تقسیم کے بعد تو بے اعتدالی بہت زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ مزید برآں اس نے اب بہ حیثیت جماعت تفریق دین و سیاست کا اعلان کر دیا ہے اس لیے بہت سے مسائل تو از خود اس کے دائرہ بحث و عمل سے خارج ہو گئے ہیں، اس قسم کے مسائل کے سلسلے میں ان مسلمانوں کو جو ہندستانی اور اسلامی دونوں نقطہ ہائے نظر کا لحاظ ضروری سمجھتے ہیں مشکل پیش آتی ہے لیکن جمعیۃ العلماء ان کے سلسلے میں ان کی کوئی رہنمائی نہیں کرتی، رہا اس کے افراد کا شخصی طرز عمل تو ایک

طرف تو وہ افراط وتفریط ہی کا مظہر ہے اور دوسری طرف یہ طرز عمل خود آپس میں بھی ٹکراتے رہتے ہیں اس لیے مسلمان ان سے سوا انتشار فکر کے اور کچھ حاصل نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ مایوسی و بددلی ہے یا بے راہ روی اور یہ دونوں باتیں ملت کے لیے تباہ کن ثابت ہو رہی ہیں۔

(۲) اصلاح احوال کی دوسری مثبت تدبیر جو پہلی تدبیر سے بھی زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے یہ ہے کہ ہمیں ہر طرح کے احساس کم تری کو چھوڑ کر اس بات کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے کہ ہم یہاں کے غیر مسلموں کو ایک طرف اس بات پر مطمئن کر سکیں کہ ملک کے لیے آج جتنے بھی تشویش انگیز مسائل پیدا ہو رہے ہیں، ان کا صحیح حل اس نظام زندگی کے اندر ہے جسے اسلام کہا جاتا ہے اور دوسری طرف ہم اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ ہم اس نظام کو، جو ہمارے نقطۂ نظر سے ملک کے لیے بھی مفید ہے برپا کرنے کے سوا کوئی اور غرض نہیں رکھتے اور اپنے عملی نمونوں کے ذریعہ بھی اس کی افادیت کی ایک جھلک ان کو دکھلا سکیں۔ ہمارا یقین ہے کہ اس مقصد کے تحت اگر صحیح طریقہ کے مطابق جدوجہد کی جائے تو صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کا موجودہ نفرت وعداوت کا رویہ بدل جائے گا بلکہ یہاں کے حالات ومسائل وہ رخ اختیار کرنا شروع کر دیں گے جس کے بعد پہلے ان کی نامساعدت کا پہلو ختم ہو جائے گا اور بعد ازیں وہ ان کے حق میں زیادہ سے زیادہ سازگار اور مساعد بنتے چلے جائیں گے۔

بالفاظ دیگر شہادت حق کی راہ میں جو سب سے بڑا مانع ہے یعنی یہاں کے حالات کی نامساعدت اس کا علاج خود اس کے اندر چھپا ہوا ہے۔ اگر مسلمان اس کو ان شرائط و کیفیات کے ساتھ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں جن کا تذکرہ پہلے گزر چکا ہے تو جہاں اس کا حقیقی فائدہ یہ ہے کہ مسلمان اس کو اختیار کر کے اپنے فرض منصبی کو ادا کریں گے وہیں اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ جن مشکلات وموانع سے خوف زدہ ہو کر وہ اس سے پہلو تہی کر رہے ہیں وہ بھی خود اس کے ہی ذریعہ رفتہ رفتہ دور ہونے لگیں گے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، دین کے لیے جدوجہد کا خاصہ ہی یہ ہے۔ یہ راہ بھی ہے اور منزل بھی، اس راہ میں قدم بڑھانا ہی منزل سے ہم آغوش ہونا ہے، مشکلات بے شک بے شمار ہیں لیکن ہر مشکل کے جلو میں آسانیاں بھی ہیں اور مشکلات سے دوچند،

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦ (الم نشرح: ۵،۶)

رہی یہ بات کہ ہندستان کے موجودہ حالات میں اس طرح کے کسی کام یا اس کی کام یابی کا کوئی امکان نہیں ہے تو بے شک حالات کی سختی کا ہمیں بھی احساس ہے لیکن اس بارے میں مایوسی کو ہم محض احساس کم تری یا حالات کی ناواقفیت کا نتیجہ سمجھتے ہیں، ورنہ حالات ایسے مایوس کن نہیں ہیں۔

فرقہ واریت کا زور خود بہ خود مائل بہ زوال ہے اور اگر مسلمان ان تدبیروں کو ابتدائی قدم کے طور پر جلد بہ روئے کار لانے کی کوشش کریں جو پچھلی سطروں میں مختلف دفعات کے ذیل میں تحریر ہوئی ہیں تو اس کے خاتمہ کے لیے جو طبعی مدت درکار ہے اس سے پہلے بھی وہ ختم ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ملک میں چند در چند ایسے مسائل بھی پیدا ہو گئے ہیں، جن کا صحیح حل تلاش کرنے کے طرف ملک کا سمجھ دار طبقہ متوجہ ہے لیکن ان کا کوئی معقول حل ان کو نہیں مل رہا ہے، مثلاً نسل پرستی اور صوبہ پرستی سر اٹھا رہی ہے، طبقاتی کش مکش کو فروغ حاصل ہو رہا ہے، احترام قانون کا جذبہ مائل بہ انحطاط ہے، معاشرتی اخلاق و قوانین میں نمایاں ابتری پیدا ہوتی جارہی ہے اور اس طرح کے اور بہت سے چھوٹے بڑے فتنے سر اٹھاتے جارہے ہیں، اور لطف یہ ہے کہ ان کو جتنا ہی زیادہ دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اتنا ہی یہ اور زیادہ ابھرتے ہیں، ان مسائل نے ملک کے سمجھ دار طبقہ کو نہایت ہی پریشان کن صورت حال سے دوچار کر دیا ہے، ان کے حل کے لیے ان کو کوئی تدبیر نظر نہیں آتی۔ ان مسائل کے حل کے لیے کچھ اہل ملک اپنے قدیم مذہب اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں جس کو دیکھتے ہوئے ہم میں سے بہتوں پر مایوسی طاری ہونے لگتی ہے کہ اس کے بعد پھر ان کے اسلام کی طرف متوجہ ہونے کی کیا گنجائش باقی رہ سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندستان میں مذہب اور تہذیب قدیم کی جن خصوصیات کا مظاہرہ ان کے نام لیواؤں اور ان کے علم برداروں کے عمل کے ذریعہ ہو رہا ہے وہ خاص حد تک تشویش کا موجب ہو سکتا ہے اور ان کی بنا پر مشکلات کا اندیشہ بھی اپنی جگہ ایک معتد بہ حد تک بجا و درست ہے اس لیے کہ ان کی سرگرمیوں کا نمایاں عنصر، نفرت، عصبیت اور قوم پرستی ہے، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ اور ان کی جاری کردہ تحریکات، ہمارے لیے کچھ زیادہ اندیشہ کی موجب نہیں ہونی چاہئیں، ان میں اکثر تو ایسے لوگ ہیں جو محض حصول اقتدار کے لیے مذہب و تہذیب کے نعرے لگا رہے

ہیں۔ کیوں کہ ہندستانی عوام کے ذہن و دماغ کو اسی قسم کے نعروں سے فریب دیا جاسکتا ہے۔ ایسے لوگوں کی اصلیت زیادہ دنوں تک چھپی نہیں رہ سکتی زود یا بدیر لوگ ان سے واقف ہوجائیں گے اور اس وقت ان کو جو کچھ بھی اثر و رسوخ حاصل ہے وہ یقیناً ختم ہوکر رہے گا۔ رہے وہ لوگ جو واقعی اپنے مذہب وتہذیب کے دل دادہ ہیں اور نیک نیتی سے وہ ملک وقوم کا فائدہ اپنے مذہب و تہذیب میں منحصر سمجھتے ہیں، تو پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ اب تک سوا چند ظاہر فریب باتوں کے، مذہب اور تہذیب کے نام پر کوئی ایسی چیز نہیں پیش کرسکے ہیں جس کو اس زمانہ کے پڑھے لکھے لوگوں کا ذہن آسانی کے ساتھ قبول کرسکے، اور نہ انھوں نے اپنی زندگی ہی کا کوئی ایسا نمونہ پیش کیا ہے جس کو دیکھتے ہوئے لوگ ان کی باتوں کے بارے میں کچھ زیادہ حسن ظن سے کام لے سکیں، اور ظاہر ہے جب تک یہ دونوں باتیں مفقود ہیں عوام ان کی باتوں سے زبانی اظہار تحسین کے سوا اور کوئی دل چسپی نہیں لے سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس الیکشن میں مذہب وتہذیب کی لمبی چوڑی باتیں کرنے والے بری طرح ناکام ہوگئے ہیں اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان جن خاص مسائل و مشکلات سے دوچار ہے وہ مذہب وتہذیب کے خالی خولی ناموں سے حل نہیں ہوسکتے ہیں، اس کے لیے ان خصوصیات کے حامل نظام کی ضرورت ہے جو آئندہ ہم پیش کرنے والے ہیں اور یہ ظاہر بات ہے کہ جس مذہب وتہذیب کا اس وقت عام طور سے پرچار کیا جارہا ہے ان میں صرف یہی نہیں کہ یہ خصوصیات موجود نہیں ہیں بلکہ ان میں بہت سی باتیں ان کی ضد ہیں اس لیے موجودہ مذہبی وتہذیبی تحریکات کا انجام یہی ہوسکتا ہے کہ یا تو تھوڑے دنوں بعد وہ خود بہ خود ختم ہوجائیں گی، یا اگر ان کے علم بردار اپنے مذہبی جذبات میں مخلص ہیں تو وہ ان کی خامیوں کا جائزہ لے کر ان کو دور کرنے اور ان کو ہر طرح مکمل کرنے کی کوشش کریں اور آپ یقین کریں کہ جس لمحہ ان کو یہ احساس پیدا ہوجائے گا ان کی تحریکات کے تمام اندیشہ ناک اور مضر پہلو ایک ایک کرکے رخصت[1] ہوجائیں گے اور آپ میں اور ان میں

---

(۱) جن سنگھ کو مسلمانوں کی سخت مخالف جماعتوں میں شمار کیا جاتا ہے، مگر وہ بھی سچے اور ایمان دار مسلمان کو ''سماج کا اجالا'' قرار دیتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ ''باعمل، مخلص اور صحیح مسلمان بنیں۔'' چناں چہ اتر پردیش جن سنگھ نے حالیہ الیکشن میں جو پمفلٹ شائع کیا تھا اس کے بعض فقرے یہ ہیں:

باقی اگلے صفحہ پر

نفرت و بے گانگی کی بہ جائے اعتماد اور خیر سگالی کا رشتہ قائم ہو جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ تلاش سے ان کو خود اپنے یہاں کچھ ایسی چیزیں مل سکیں جن کی ضرورت درپیش ہے کیوں کہ یہ سرزمین بھی کبھی نہ کبھی اس ہدایت سے ضرور فیض یاب ہوئی ہوگی جس کی بخشش اللہ کے قانون کے بہ موجب ہر قوم اور ہر ملک کے لیے عام رہی ہے (لکل قوم ھاد) ورنہ ضرورت کے تحت ان کو یہ چیزیں کہیں اور سے حاصل کرنی ہوں گی اور واقعی اگر ان میں حقیقی خدا پرستی موجود ہوگی تو اس بارے میں عصبیت اور تنگ نظری سے کام لینا وہ ہرگز پسند نہیں کریں گے، سچے خدا پرستوں کی یہی علامت ہے۔

پھر یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنے کی ہے کہ ہندستان کے مذہبی لوگوں کی صرف وہی ایک قسم نہیں ہے جو ایک طرف تو دین دھرم کا نام لیتے ہیں اور دوسری طرف انتہائی تعصب اور فرقہ پرستی وغیرہ کی بدترین لعنتوں میں بھی مبتلا ہیں بلکہ ان کے علاوہ یہاں ایسے مذہبی لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کے دل ان بیماریوں سے پاک ہیں، وہ خدا پر عقیدہ رکھتے ہیں، کسی نہ کسی شکل میں جزا و سزا کے قائل ہیں، نیکی کے قدر دان اور بدی سے متنفر ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ حق بات

بقیہ پچھلے صفحہ کا

''ایسے (دیانت دار) لوگ چاہے ہندو مسلمان عیسائی پارسی کوئی بھی ہوں، سماج کے اندر اپنے لیے اجالا ہوں گے، جن سے دین و دنیا دونوں کا بھلا ہوگا۔ جب ہم ایسے لوگ بنالیں گے اور ہمارے اسکول کالج اس کام میں مدد کریں گے، جب وید، قرآن، گیتا، بائیبل، گرنتھ صاحب اور مہابیر یا بدھ کی تعلیم صرف کتابوں میں نہ رہ کر لوگوں کے دلوں میں رہیں گی تب یہ دنیا سچ مچ جنت بن جائے گی۔''

''اگر ہم پورے ہندستان کی بھلائی چاہتے ہیں تو ہمیں گھر گھر یہ سندیش پہنچانا ہوگا کہ ہندو مسلمان، عیسائی یا پارسی تبھی سچے دل سے آپ میں مل سکتے ہیں جب کہ وہ دین دھرم کو کوئی فالتو یا پرائیویٹ چیز نہ سمجھ کر رشیوں اوتاروں پیغمبروں اور مہاتماؤں کی تعلیم کو اپنی زندگی کے ہر منٹ میں ہر کام کرتے وقت یاد رکھیں اور اس تعلیم کے مطابق عمل کریں اور کاروباری سیاسی، سماجی اور ہر قسم کے معاملات میں آپسی برتاؤ کو سچا اور صاف دیکھیں۔ ہندو مسلمان عیسائی پارسائی وغیرہ سچے ہندو مسلمان عیسائی پارسی بن کر ہی ملک کی بھلائی کر سکتے ہیں۔...''

اس پمفلٹ میں مغرب پرستی، ترقی پسندی، سوشلزم اور جمہوریت وغیرہ کے بارے میں بھی ایسے خیالات ظاہر کیے گئے ہیں جن میں وجوہ اشتراک تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ باتیں کرنے والے اپنے عمل سے بھی اس کا ثبوت پیش کریں کہ وہ واقعی دل سے ان کے قائل ہیں اور ان کے سلسلے میں کچھ کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔

سننے سے انھوں نے اپنے کان بالکل بند نہیں کر لیے ہیں۔ ایسے لوگ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں اور اگر کوشش کی جائے تو کسی خالص دینی تحریک کے لیے ایسے لوگوں کا معتد بہ اشتراک و تعاون حاصل ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ملک کی بعض تحریکات بھی اپنے اچھے جذبات کے لحاظ سے اس قسم کی دوسری تحریکات سے بہت کچھ مختلف ہیں، کوشش سے ان کو بھی اچھے ڈھنگ پر لایا جاسکتا ہے، لیکن یہ سب کچھ مسلمانوں کی سعی وکوشش پر موقوف ہے اگر مسلمان اسلام کے مطابق اپنے رویہ وعمل میں واقعی تبدیلیاں پیدا کرلیں اور شہادت حق کا جو فریضہ ان پر عائد ہوتا ہے، اس کو ٹھیک طور سے ادا کرنے کے لیے آمادہ ہوجائیں تو آپ دیکھیں گے کہ غلط مذہبیت کے اثرات بھی زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکیں گے، بہت سی غلط باتیں محض ناواقفیت کی بنا پر رواج پذیر ہوگئی ہیں، کچھ خود مسلمانوں کی اپنی پچھلی غلطیوں کی صدائے بازگشت ہیں، اور یہ سب دور ہوسکتی ہیں بہ شرطے کہ مسلمان اپنے فرض کو پہچانیں اور کچھ کرنے کے لیے آمادہ ہوجائیں۔

کچھ لوگ ملک کے موجودہ مسائل کے حل کے لیے یورپ کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ تو فتنوں کا گھر ہے اور وہاں سے جو چیز علاج کے طور پر حاصل کی جاتی ہے وہ بہ جائے خود ایک مرض بن کر زندگی کو اجیرن بنانے لگتی ہے اور واقعہ تو یہ ہے کہ آج جتنے فتنے بھی ملک میں ابل رہے ہیں ان میں سے بیش تر کا سرچشمہ یورپ ہی ہے اور اس کا احساس نہایت تیزی کے ساتھ ملک کے مفکرین کو ہونے لگا ہے چناں چہ اس ضمن میں ان کے اعترافات آئے دن، اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں، ابھی حال میں پنڈت جواہر لال جیسے مغربیت کے دل دادہ شخص نے مفکرین عالم کی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

> اس وقت دنیا کی سب سے اہم ضرورت انسانی سماج کی یکسانیت کے جذبہ کو بے دار کرنا ہے اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو دنیا میں مستقل امن کا قیام ناممکن ہے۔ ہم میں سے بیش تر لوگ جدید دنیا کی پیچیدگیوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور روز ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے کوئی چیز کھودی ہے، یہ جذبہ انسان کے آگے بڑھنے میں حارج ہے.... آج انسان نے بہت ترقی کرلی ہے لیکن اس کے باوجود اپنی داخلی زندگی سے دور ہوگیا ہے۔ موجودہ دنیا اور اس کی تہذیب انسانی دل ودماغ کی پیدا کردہ ہے لیکن اس کے

باوجود ان کی اہمیت دن بہ دن کم ہو رہی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے سوچنے کے طریقہ میں ضرور کوئی خرابی ہے۔ صنعتی انقلاب سے جہاں انسانیت کو بہت سے فوائد حاصل ہوئے ہیں وہاں اس نے انسانی دل و دماغ کو نقصان پہنچایا ہے اور انھیں میکانکی بنا کر ان کی تخلیقی قوت کو سلب کر لیا ہے۔''

اور ابھی حال میں ڈاکٹر امرناتھ جھا نے اپنے ایک خطبۂ تقسیم اسناد میں فرمایا ہے:

''تحقیقات اور ایجاد کے میدان میں بے شک ہم سائنس کے بیش قیمت عطیات کے شکر گزار ہیں جن کی بدولت ہم دنیا اور عالم خارجی کو مسخر کرنے کے قابل ہو گئے ہیں لیکن اسی کے ساتھ تلخی، عدم اعتماد اور جہالت کی ایک بڑی خلیج فطرت انسانی کو مسخر کرنے میں حائل ہے۔ یہی ہے وہ کام جو پیش نظر رہنا چاہیے اور یہی دشواریوں کے حل کرنے کے لیے نوخیز نسلوں کو چیلنج بھی ہے۔

اس وقت کا ایک عظیم سانحہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں اخلاقی اقدار بہت بڑی حد تک گر چکی ہیں۔ ایک طرف تو لوگ اجتماعی تحفظات اور عالمی امن کی باتیں کرتے ہیں لیکن دوسری طرف توسیع اسلحہ کی دیوانہ وار مسابقت بھی جاری ہے۔ ڈاکٹر جھا نے فرمایا کہ میں مایوس کن باتیں نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات زندگی کے ان بیش قیمت پہلوؤں پر غور فرمائیں جن کے باعث نوع انسانی کو دائمی اقدار حاصل ہو سکیں گے اور مختلف افراد و طبقات بالآخر ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے اور باہمی ہمدردی قائم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ ہم اپنی گزشتہ تاریخ کے واقعات کی جستجو اور آراستگی میں زیادہ مصروف رہتے ہیں، حالاں کہ وقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے دور کے انسانوں اور مسائل سے زیادہ سے زیادہ وابستہ رہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ افراد نیز قوموں کے درمیان کم سے کم تصادم ہوگا۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ نااتفاقی کا خاتمہ ہو اور انسانی تعلقات تلخ نہ ہونے پائیں۔

ڈاکٹر جھا نے فرمایا کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں یہ کہا جاتا تھا کہ یہ جنگ آئندہ تمام جنگوں کا خاتمہ کر دے گی لیکن موجودہ نسل ہی کو ایک اور عالم گیر جنگ سے سابقہ

پیش آیا در آں حالے کہ نہ تو جنگ کا خاتمہ ہوا اور نہ موعودہ امن عالم ہی نصیب ہوسکا۔
درحقیقت لوگ آج جو کچھ کرتے ہیں اس کے سلسلے میں انھیں بہت زیادہ محتاط اور باشعور ہونے کی ضرورت ہے کیوں کہ کوئی کام جو دنیا کے بعید ترین گوشہ ہی میں کیوں نہ کیا جائے اس کا ردعمل دور دراز حصوں پر ایسا پڑتا ہے کہ اس سے دنیا کی تباہی اور تہذیب وتمدن کی بربادی یقینی طور پر لازم آتی ہے۔ اگر ہم دنیا کو تباہی سے بچانا چاہتے ہیں تو خدائے تعالیٰ کو دوبارہ دنیا کے تخت پر متمکن کرنا ہوگا تاکہ اس کی بدولت نوخیز نسلیں اپنی آئندہ زندگی میں انسانی تعلقات کو سنوار سکیں اور انسانی اخوت کو قائم کرسکیں۔ ایک سچا مذہبی آدمی دوسروں کے مذاہب کو تحقیر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ فی الواقع تمام مذاہب کے بنیادی حقائق یکساں ہیں۔ تمام مذاہب میں مخلوق کی خدمت کے ذریعہ خالق کی رضاجوئی کا جذبہ پایا جاتا ہے نیز یہ جذبہ بھی پایا جاتا ہے کہ جہاں بھی خدمت کا موقع ہو وہاں خدمت کی جائے اور انسانی تکالیف کا ازالہ کیا جائے اور راہ راست پر چلنے کا عزم صمیم پیدا کیا جائے۔
انھوں نے کہا کہ یو.این.او. نے اعلان کیا تھا کہ دنیا کی تمام نسلیں مساوی حیثیت رکھتی ہیں، اگر واقعہ بھی ایسا ہی ہوتا تو دنیا میں کسی ایک طبقہ کو دوسروں کے مقابلے میں خاص مراعات حاصل نہ ہوتیں اور نہ کوئی ملک ترقی یافتہ یا پس ماندہ ہوتا۔ تمام لوگوں کے لیے ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوتے اور دنیا کی رائے عامہ کی نظر میں یکساں سلوک کے مستحق قرار پاتے۔
انھوں نے پوچھا یو.این.او. یا کوئی دوسرا بین الاقوامی ادارہ کیسے کام یاب ہوسکتا ہے جب کہ یہ ممالک خود اپنی مملکت میں ان باتوں پر عمل پیرا نہیں ہیں، جن کا ڈھنڈھورا یو.این.او. کی مجالس میں زور شور سے پیٹا جاتا ہے، امریکہ کے سفید فام امریکن اور حبشی باشندوں میں کوئی مساوات نہیں ہے اور بعض ممالک میں عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان بھی مساوات نہیں ہے، اس لیے یو.این.او. کی کام یابی کے بارے میں جب سوال کیا جائے تو ہمیں خود اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے کہ کیا بہ حیثیت انسان کے اور

بہ حیثیت یو.این.او. کے ممبر کے ہم حقیقت میں وہی کرتے ہیں جس کے کرنے کے ہم دوسروں سے متمنی ہیں۔ڈاکٹر چھانے نوجوان گریجوئس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دور حاضر کا یہ آپ حضرات کے لیے چیلنج ہے، اس کا تہیہ کرلیجیے کہ آپ اپنی پوری زندگی میں عالم گیر اخوت کے قیام کے لیے جدوجہد کریں گے تاکہ دنیا میں ناانصافی کا خاتمہ ہوجائے۔اپنے باطنی نور کو پھیلایئے تاکہ تاریکیاں دنیا سے کافور ہوجائیں۔''

ایسے ہی اعترافات آئے دن مشاہیر ملک کی طرف سے شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کا جادو تیزی کے ساتھ سروں پر سے اترتا جارہا ہے اوراب لوگ آنکھیں کھول کر اس کے نتائج واثرات دیکھنے کی طرف متوجہ ہیں، حد یہ ہے کہ مروجہ جمہوریت جس کے خلاف کچھ کہتے ہوئے زبان خشک ہونے لگتی تھی، اس کے خلاف بھی کچھ لوگ دبی زبان سے شکوہ وشکایت وبے اطمینانی کا اظہار کرنے لگے ہیں۔(۱)

---

(۱) اخبار اسٹیٹسمین مورخہ ۲۷/جنوری ۱۹۵۲ میں مسٹر ایم.این.رائے کا ایک طویل مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ''کیا جمہوریت ممکن ہے؟'' اس میں وہ لکھتے ہیں:

''جمہوریت جو سر گننے سے زیادہ کچھ نہیں، آخری تجربہ کے مطابق مجموعی انا کا اظہار ہے اس میں نہ فرد کی گنجائش ہے اور نہ ذہانت کی، عام پارلیمانی طریقہ انتخاب میں اخلاق کی پروانہ کرنے والے عوامی کارکن، ہمیشہ سب سے اوپر آجانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ذہانت، کردار، ہوش مندی اور اخلاقی بلندی کا اس میں عام طور سے کوئی گزر نہیں ہے اور صاف بات یہ ہے کہ جب تک کہ ان انسانی اقدار کا سیاسی تنظیم اور نظم سوسائٹی پر گہرا اثر نہیں پڑے گا، جمہوری طرز زندگی کبھی کام یاب نہیں ہوسکتا۔

آج دنیا میں اِن انسانی روایتی اخلاق کے حامل مردوں اور عورتوں کی کوئی کمی نہیں ہے، لیکن عوامی نمائندگی کو ناپسندیدہ کہنے کی وجہ سے وہ عوامی کاموں کی سربراہ کاری کے منصب کبھی نہیں سنبھال سکتے، دوسری طرف ایک آمرانہ نظام اگرچہ وہ کسی بہترین مقصد ہی کے لیے کیوں نہ قائم کیا گیا ہو، اس قسم کے شہریوں کے ابھار کو ہمیشہ ناپسند کرتا ہے، اس طرح آدمیت رسمی جمہوریت اور آمریت کے درمیان اپنے معاملات کو روحانی طور سے آزاد افراد کے ذریعہ انجام دیے جانے کے فائدہ سے محروم ہوگئی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ آزادی کے مقصد کی طرف بڑھنے سے روک دی گئی ہے۔''

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ

''آج کل ہر صاحب فکر محبِّ آزادی اس سوال سے پریشان ہے کہ آیا جمہوریت ممکن بھی ہے؟ جمہوری سوشلزم کے حامیوں نے اگرچہ بجا طور پر ڈکٹیٹر شپ کو رد کردیا ہے تاہم وہ بھی موجودہ دور کے اس اہم سوال کا کوئی اطمینان بخش

باقی اگلے صفحہ پر

بقیہ پچھلے صفحہ کا حاشیہ

جواب نہیں دے سکے ہیں۔ جمہوریت کا بنیادی اصول کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو، صرف اسی وقت ممکن الحصول ہے جب کہ پبلک معاملات کے انصرام کی ذمہ داری ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو روحانی طور پر آزاد افراد ہوں، جو دوسرے لوگوں اور دوسری چیزوں کے بالمقابل اپنے ہی ضمیر کی نمائندگی کریں۔

اخلاقی دباؤ ہی اصل میں سب سے بڑا دباؤ ہوا کرتا ہے۔ پارلیمانی جمہوریت کا حقیقی ضامن قانون نہیں بلکہ اس اکثریت کا اخلاقی ضمیر ہے، جسے طاقت حاصل ہو۔ اگر تجزیہ کیجیے تو ڈکٹیٹر شپ کا بقا بھی اخلاقی دباؤ ہی پر منحصر ہے بلکہ وہ مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے لیکن ایک طبقہ کا مجموعی اخلاق، طاقت کے لالچ کے بالمقابل بڑی مشکوک قسم کی ضمانت ہے۔ کیوں کہ اقدار محض افراد کے ذریعہ روبہ کار آتی ہیں، اس لیے وہ حکومت جو روحانی طور پر آزاد افراد پر جو اول درجے میں خود اپنے ضمیر کے آگے ہی جواب دہ ہوں مشتمل، صرف ایسی ہی حکومت اس بات کی ممکن ضمانت ہوسکتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے، اگر جمہوریت موجودہ ابتلاء میں باقی رہنا چاہتی ہے اور ڈکٹیٹر شپ کے طاقت ور حملہ کو روکنا چاہتی ہے تو اسے اس فلسفے سے اپنا دامن تر کرنا ہی ہوگا۔''

ایم. این. رائے کا یہ مقابلہ اگر چہ اس حیثیت سے سخت تنقید کا مستحق ہے کہ انھوں نے اس میں مرض کا جو علاج تجویز کیا ہے وہ بہ جائے خود کہاں تک مفید یا ممکن العمل ہے مثلاً ان کے اس خیال کو ہم سراسر لغویت سمجھتے ہیں کہ محض ضمیر کے سامنے جواب دہی کا احساس انسان کو راہ راست پر قائم رہ سکتا ہے یا موجودہ جمہوریت کے بنیادی تصورات کے ساتھ خود ضمیر کے سامنے جواب دہی کا احساس پیدا یا قائم ہوسکتا ہے، لیکن یہاں اس پر کسی تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے بہ ہر حال جہاں تک مرض کی تشخیص کا سوال ہے اس سے ہمیں اتفاق ہے اور اس سلسلہ میں جو باتیں انھوں نے لکھی ہیں وہ اپنے اندر اچھا خاصا وزن رکھتی ہیں۔

''ہندستان ٹائمز کی پولیٹیکل ڈائری'' کا تبصرہ نگار پارلیمنٹ کے انتخابی ضابطوں کا حوالہ دیتے ہوئے حالیہ الیکشن کی بدعنوانیوں کے بارے میں لکھتا ہے۔ کانگریسی امیدوار بھی بدعنوانیوں کی ہمت افزائی کرنے میں دوسروں سے کچھ کم مستحق ملامت نہیں ہیں۔ در حقیقت کچھ امیدواروں نے خود کانگریس ہائی کمانڈ کی نگاہوں کے سامنے، صرف کا جو معیار قائم کیا ہے وہ ایسا ہے کہ نہ صرف غریب لوگ بلکہ متوسط طبقہ کے لوگ بھی الیکشن میں حصہ لینے کا حوصلہ نہیں کر سکتے اس طرح اگر چہ ۷۰ امیں پبلک کو ووٹ دینے کا حق عطا کر دیا گیا ہے لیکن ان میں سے ایک چوتھائی آدمی بھی اس قابل نہیں ہیں کہ وہ الیکشن کے مصارف کے متحمل ہوسکیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقتاً پبلک رائے دہندگی کے حق سے محروم کر دی گئی ہے۔

ان اقتباسات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ موجودہ جمہوریت کا فطری نقص کس طرح لوگوں کی نگاہوں میں آتا جا رہا ہے، اور اس کے خلاف ذہنوں میں بے اطمینانی کروٹیں لینے لگی ہے۔

باقی اگلے صفحہ پر

بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ

پھر جس چیز کی جڑ میں خرابیاں ہوں اس کی شاخوں میں خرابیوں کا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ چناں چہ جس طرح اس جمہوریت کے بنیادی فساد کا احساس ہو چلا ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ نمایاں رنگ میں اس جمہوریت کے لازمی طور طریقوں پر زبردست تنقیدیں ہونے لگی ہیں۔ ''پارٹی سسٹم'' اور ''امیدواری سسٹم'' عملاً اس جمہوریت کے ستون ہیں۔ مگر اس الیکشن میں اس کے خلاف بہت کچھ کہا گیا پنڈت جواہر لال نے پارٹی سسٹم کے اصول پر ووٹروں سے اپیل کی کہ وہ فرد کو نہ دیکھیں بلکہ اس جماعت کو دیکھیں جس نے اسے اپنا امیدوار بنا کر کھڑا کیا ہے، اس پر ہندستان ٹائمز کے نامہ نگار خصوصی کے بہ قول ''تنقیدیں کی جارہی ہیں'' کیوں؟ اس لیے کہ ''بہتر سے بہتر پروگرام بھی بے کار ہے اگر غلط اشخاص اس کے ذمہ دار بنا دیے جائیں۔'' جیسا کہ اس نامہ نگار کے خیال میں کانگریس کے اندر ہورہا ہے (۱۴ر جنوری ۱۹۵۴)

امیدواری سسٹم کی برائیاں تو اس قدر برہنہ ہوچکی ہیں کہ سبھی اس سے نالاں ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بارہا فرمایا ہے کہ اس طریقے کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ان کے خیال میں ٹکٹ کی درخواست دینے والے ہرگز اس قابل نہیں کہ انھیں ٹکٹ دیا جائے۔ کسان مزدور پرجا پارٹی نے تو الیکشن سے پہلے اپنی صوبائی کمیٹیوں کو ایک گشتی مراسلے کے ذریعہ (اخبارات کے بہ قول) یہ ہدایت کردی تھی کہ وہ دوسری پارٹیوں کی طرح امیدواروں سے درخواستیں نہ طلب کریں بلکہ ایسے مفید اور قابل آدمیوں سے خود گفتگو کریں جو الیکشن کے جھنجھٹ سے الگ رہنا چاہتے ہوں، اور انھیں ملکی خدمت کے تحت الیکشن لڑنے کے لیے آمادہ کریں۔ گاندھی جی کے خاص چیلے ونوبھا بھائے جی نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات الیکشن کے دوران میں ظاہر کیے۔

یہ ہیں وہ بے چینیاں جو موجودہ جمہوریت کے لازمی طور طریقوں کے خلاف پیدا ہورہی ہیں۔ یہ سوال بالکل دوسرا ہے کہ اس جمہوریت کو اس کے اصل جوہر کے ساتھ اپناتے ہوئے ان طور طریقوں سے عملاً نجات مل بھی سکتی ہے یا نہیں؟ یہ بات تو شاید ابھی بہت دیر میں سمجھ میں آئے گی۔

جس جڑ کا اور اس کی شاخوں کا یہ حال ہو، اس کے پیدا کیے ہوئے پھل کیسے کچھ کڑوے کسیلے ہوں گے؟ یہ بات بھی اب اہل نظر سے پوشیدہ نہیں رہی۔ حالیہ الیکشن کی برکت سے ان پھلوں کا مزہ بھی لوگوں نے چکھ لیا ہے جس کی تلخی شاید بھلائے بھی نہ بھولے۔ اخبار تیج دہلی الیکشن کے بعد ''چناؤ کا تماشا ختم ہوگیا'' کے زیر عنوان لکھتا ہے:

''یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ چند ایک امیدواروں کو چھوڑ کر بیش تر حلقوں میں امیدواروں کے حامیوں اور ووٹروں دونوں نے بے حد اخلاقی پستی کا ثبوت دیا ہے۔ غلط پروپیگنڈا، برادری، دوستی، جات پات اور مذہب کے نام کا واسطہ تو دیا ہی گیا ہے۔ مگر روپیہ اور شراب اور بد دیانتی کے ہتھکنڈے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ بے شمار جگہوں میں ووٹروں نے اپنے ووٹ کی قیمت روپیہ اور شراب کی شکل میں وصول کی ہے اور ہمیں جرأت کر کے اعتراف کرنا چاہیے کہ اس تالاب میں قریب قریب سب ہی ننگے تھے۔ ان باتوں سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عوام کا اخلاق کتنا پست ہو چکا ہے اور ہمارا ملک کہاں تک ڈیموکریسی کے قابل ہے الخ۔ (۱۷ر جنوری ۱۹۵۲)

یہ باتیں اس لحاظ سے قابلِ قدر ہوسکتی ہیں کہ درحقیقت یورپ کی مرعوبیت ہی لوگوں کو کسی صحیح نظام زندگی کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی تھی، یہ رکاوٹ اگر درمیان سے اٹھ جائے تو کم از کم اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ اسلام کو بہ حیثیت نظام زندگی ان کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ اس پر غور کرسکیں، بالخصوص ایسی حالت میں کہ جو لوگ مغربیت کے دل دادہ رہے ہیں اور اب اس سے متنفر اور بدظن ہوتے جارہے ہیں، ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تقلید و جمود کی بندشوں سے وہ پہلے ہی ایک حد تک آزاد ہوچکے ہیں۔ اس رکاوٹ کے ختم ہونے کے بعد یقینی بات ہے کہ اسلام کے لیے راستہ بہت ہموار ہوجائے گا کیوں کہ ملک میں اس وقت جو مسائل وجہ اضطراب بنے ہوئے ہیں ان کو اسلام ہی عمدہ طریقہ پہ حل کرسکتا ہے۔ ملک کے موجودہ حالات وضروریات کے تحت یہاں ایک ایسے نظام زندگی کی ضرورت ہے جس کی کم از کم خصوصیات حسب ذیل ہوں:

(۱) وحدت بنی نوع انسانی کی اساس پر عالم گیر احترام آدمیت اور مساوات کا داعی ہو۔

(۲) نسل ونسب اور جغرافیائی حدود کی غیر فطری تقسیموں کو مٹا کر معاشرہ کو از سر نو اخلاق و تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر کرے۔

(۳) موجودہ معاشی ناہمواریوں کو ایک متوازن اور منصفانہ نظام معیشت کے ذریعہ دور کرسکے۔

(۴) اس کے معاشرتی قوانین عدل وانصاف، اخوت اور مساوات پر مبنی ہوں۔

(۵) ٹھوس اور مضبوط حقائق کی بنیاد پر افراد کی فکری وذہنی تربیت اس طور سے کرسکے کہ ان میں اچھے اخلاق وکردار نشوونما پاسکیں۔

(۶) فرد واجتماع کے باہمی ربط کو مضبوط وخوش گوار بناسکے۔

(۷) زندگی کے مختلف شعبوں میں ربط واعتدال و توازن پیدا کرنے کا باعث ہو۔

اور یہ خصوصیات ہماری معلومات کی حد تک صرف اسلامی نظام حیات میں پائی جاتی ہیں، یہ چیزیں مغربی نظامِ زندگی میں تو قطعاً مفقود ہیں جیسا کہ ظاہر ہے اور ہماری معلومات کی حد تک مذہب کے نام سے جو ورثہ غیر مسلموں کو ملا ہے وہ بھی ان سے بڑی حد تک خالی ہے ضرورت

ہے تو۔ تو صرف اس بات کی کہ ان کے سامنے اس نظام کو اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ اس کی خوبیوں کے تسلیم کرنے پر اپنے کو مجبور پانے لگیں۔ اس سلسلے میں جو کچھ کرنے کی ضرورت ہے، اس کی مختصر توضیح اوپر گزر چکی ہے، لیکن خاص اس مقصد کے لیے مسلمانوں کو اپنے فکر و عمل میں کچھ تبدیلیاں پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے جن کی ذیل میں ہم شرح کرتے ہیں۔

(الف) اس غرض کے لیے کام کا جو پروگرام تیار کیا جائے اس میں مخصوص طور سے صرف مسلمانوں کے مفادات کا ہی لحاظ نہ رکھا گیا ہو بلکہ وہ ملک کے عمومی فسادات کی رعایت پر مبنی ہو، اس کے بغیر یہاں کے غیر مسلموں کی ہم دردی و تعاون حاصل نہیں ہوسکتا، جو کام کو آگے بڑھانے کے لیے از بس ضروری ہے۔

(ب) اپنے طرزِ عمل میں اس بات کی پوری گنجایش رکھی جائے کہ غیر مسلموں میں سے جن لوگوں کو ہمارے اس طرح کے پروگرام اور اس کے طریقِ کار سے اتفاق ہو وہ اس میں بہ خوشی شریک ہوں سکیں اور صرف گنجایش ہی نہیں بلکہ اس بات کی کوشش ہونی چاہیے کہ اس میں ان کا زیادہ سے زیادہ اشتراک و تعاون حاصل ہو سکے۔

(ج) پروگرام کی اس نوعیت کے ساتھ انھیں اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت پیش کرنا ہوگا کہ ان کے سامنے کسی قسم کا اپنا ذاتی یا قومی مفاد نہیں ہے بلکہ وہ محض ملک کی خیر خواہی اور نفع کے جذبہ کے ماتحت اس کے لیے آمادہ ہوئے ہیں۔

اور خاص اس قسم کی تبدیلیوں کے لیے چند بنیادی باتوں کے بارے میں اپنا ذہن اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے۔

(الف) مسلمانوں کا یہ سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ دین محض ان کی ملک ہے اور دنیا کی ہر قوم دین سے کلیتاً محروم ہے۔ قرآن کے بہ موجب ہر قوم اور ہر ملک میں دین بھیجا گیا تھا اس لیے یہ تو صحیح ہے اور قرآن نے اس کی طرف اشارات بھی کیے ہیں کہ مرورِ ایام اور قوموں کی غفلتوں سے وہ ان کے پاس اپنی اصل حالت میں محفوظ نہیں رہ سکا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ دین کے تھوڑے بہت آثار تقریباً ہر قوم میں پائے جاتے ہیں اور اس کا خلوص کے ساتھ اتباع کرنے والے بھی موجود ہیں یہ اور بات ہے کہ

بہت سے امور میں وہ جس چیز کو دین سمجھ رہے ہوں وہ حقیقتاً دین نہ ہو بلکہ خود ان کی یا ان کے پیش رووں کی غفلت سے وہ دین میں داخل ہوگئی ہوں۔

ان باتوں کے پیش نظر ہمیں اپنی دعوت غیر مسلموں کے سامنے اس حیثیت سے نہیں پیش کرنی چاہیے کہ ہم اس کے حقیقی مالک ووارث ہیں اور دین ان کے لیے کوئی نئی چیز ہے اور وہ کلیتاً اس سے محروم ہیں بلکہ اس حیثیت سے پیش کرنی چاہیے کہ یہ ہمارا اور ان کا مشترک سرمایہ ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس کی کچھ باتیں ان کے یہاں پہلے ہی سے موجود ہوں[1]۔ بلکہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہوگا کہ غیر مسلم حضرات اگر ہماری

---

(۱) معارف بابت ماہ اپریل ۱۹۵۲ میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ''اسلام اور ہندو مذہب کی مشترک تعلیمات'' اس مضمون میں مولانا نے لکھا ہے کہ ''ہندستان کے قدیم مذاہب و ادیان کے وثائق اور یادداشتوں کا تو ذکر ہی کیا مہابھارت جیسی عام کتاب میں بھی ایسی حیرت انگیز چیزیں مل جاتی ہیں کہ آدمی مبہوت ہوکر رہ جاتا ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ دیا گیا ہے اس کا بڑا حصہ اب بھی ہندستان کے باشندوں کے اگلے بزرگوں کی کتابوں میں موجود ہے۔''

اس کے بعد مولانا نے مہابھارت کے بہت سے حوالوں سے یہ واضح کیا ہے کہ نیکی بدی، جنت ودوزخ، اخلاقی فضائل ورذائل، وضو وغسل اور زکوٰۃ سے لے کر توحید تک کی تعلیمات مہابھارت میں موجود ہیں۔ مضمون کے آخر میں مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

''میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا تھا کہ قرآن نے جو یہ پوچھا تھا کہ ان کے پاس کیا کوئی ایسی باتیں آئی ہیں جو ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس نہ آئی تھیں۔''

اس سوال کا رخ جیسے دنیا کی دوسری قوموں اور امتوں کی طرف ہے اسی طرح واقعات کی روشنی میں دکھانا چاہتا تھا کہ ویدک دھرم والوں کے یہاں بھی ہمیں وہی چیزیں ملتی ہیں جنھیں قرآن کے ذریعہ آخری دفعہ قدرت نے بھی بنی آدم کے سپرد کرنا چاہا ہے خواہ ان چیزوں کو ان کے تفصیلی خدوخال کے ساتھ ماننے والے مان رہے ہوں یا نہ مان رہے، ہوں لیکن ملنے کی حد تک آپ نے دیکھ لیا کہ جیسے دوسروں کے یہاں ہمیں قرآنی تفصیلات کی پرچھائیاں ملتی ہیں، اسی طرح ویدک دھرم کے آئینے میں ان ہی تعلیمات کی تصویروں کا ہم نظارہ کرسکتے ہیں، بلکہ کہا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندستان کے دینی آئینہ میں یہ تصویریں جتنی زیادہ نمایاں ہیں، شاید دنیا کے دوسرے ادیان ومذاہب کی موجودہ شکلوں میں ہم ان کو نہیں پاسکتے۔''

ہماری معلومات ہندو دھرم کے اصلی ماخذوں کے بارے میں نہایت محدود و ناقص ہیں اس لیے ان کے اعتماد پر ہم

باقی اگلے صفحہ پر

پیش کردہ باتیں، جو ان کی باتیں بھی ہیں محض اس لیے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ غلطی سے وہ ہمارے لیے خاص سمجھی جانے لگی ہیں تو وہ خود اپنے دین دھرم کی بنیادی باتوں یعنی خالص خدا پرستی، جزا و سزا اور اصول اخلاقیات کو اساس کار کے طور پر اختیار کریں، اگر وہ ایسا کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو ہمارا خیال ہے کہ موجودہ بے دینی، الحاد و تقلید مغربیت کے مقابلے میں یہ بسا غنیمت ہوگا اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ایک بار جب لوگ دل سے حقیقی دین کی طرف متوجہ ہو جائیں گے تو پھر وہ اس کو اس کی واقعی شکل میں حاصل کر کے ہی رہیں گے، بہ شرطے کہ مسلمانوں کا خود اپنا طرز عمل ان کی طلب کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ثابت ہو۔

(ب) کسی فرد یا جماعت کا اشتراک و تعاون حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان سرے سے کوئی نقطۂ اختلاف پایا ہی نہ جاتا ہو بلکہ اتنی بات کو کافی اور غنیمت سمجھنا چاہیے کہ بنیادی امور میں اتفاق رائے پایا جاتا ہو بلکہ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کم سے کم جن امور میں کسی درجے میں بھی اتفاق موجود ہو ان میں باہم اشتراک و تعاون پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور ان کے لیے متفقہ کوششیں عمل میں لائی جائیں خواہ ہر ایک کی کوششوں کا دائرہ الگ الگ ہی کیوں نہ ہو۔

(ج) مذکورہ اشتراک و تعاون کی راہ پیدا کرنا اور اس کے لیے راستہ ہموار کرنا بھی مقصد کی

بقیہ گزشتہ صفحے کا

اس مسئلہ میں کسی قطعی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے لیکن اصولاً ہم اس بات کے قائل ہیں کہ جب اللہ نے اپنا دین و شریعت ہر قوم کے پاس بھیجی ہے تو یقیناً ہندوؤں کے یہاں بھی اس کے کچھ نہ کچھ بقایا ضرور محفوظ ہوں گے، اس لیے اگر اس قسم کی چیزوں کا کھوج لگایا جائے تو اس سے جہاں یہ فائدہ ہوگا کہ اپنے دین کے بارے میں مسلمانوں کا جزم یقیناً بڑھے گا۔ وہیں اس کا ایک یہ فائدہ بھی متصور ہے کہ مسلمانوں اور دین دار ہندوؤں میں وجوہ قرب نمایاں ہو سکیں گے اور ہمارے لیے کام کی وہ راہ کھل سکے گی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ جب ان کتابوں میں ''سب ہی طرح کی باتیں ملی جلی پائی جاتی ہیں''، تو اس قسم کی تحقیقات صحیح معنوں میں صرف اس وقت مفید ہو سکتی ہیں جب مسلمانوں کی بہ جائے خود ہندو محققین ان کو پیش کریں یا پھر اس موضوع پر اس طرح روشنی ڈالی جائے کہ صحیح عقائد و اعمال میں جو تغیرات عہد بہ عہد ہوئے ہیں وہ تفصیل اور محکم دلائل کے ساتھ سامنے آجائیں۔

کام یابی ہی کی ایک راہ ہے اس لیے اس غرض کے لیے ہر ممکن کوشش عمل میں لانی چاہیے اور اسے اپنے حقیقی کام ہی کا ایک جز سمجھنا چاہیے۔

(د) یہ غلط فہمی جس میں ہماری قوم ایک عرصہ سے مبتلا ہے دل سے نکال دینی چاہیے کہ اسلام اور مسلمان قوم ہر لحاظ سے مترادف الفاظ ہیں اور یہ کہ ہر حال میں ان دونوں کے مفاد ایک ہیں، اس مفروضے کے تحت ہم نے اب تک جو کچھ کیا ہے اس نے اسلام کو بھی دنیا کے لیے ایک مضحکہ بنا دیا ہے۔ کیوں کہ ہم اپنے مفاد کی خاطر چاہے کچھ کریں ہر موقع پر ہم اسلام کو لا کر کھڑا کر دیتے ہیں کہ اس کا حکم یہی ہے اور اس طرح اسلام ہر صحیح اور غلط کام کا حامی و موئد بنا دیا گیا ہے اور اس نے مسلمانوں کو بھی ایک عجیب غریب موقف پر ڈال دیا ہے، ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ دنیا کی اور قوموں سے بالکل مختلف قوم ہیں جس کا مقصود زندگی، نیکی و تقویٰ پھیلانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن ان کا عمل دیکھیے تو ان میں اور دوسری قوموں میں سوا چند ظاہری چیزوں کے کوئی فرق کرنا مشکل ہے۔ ایسی صورت میں دنیا کس طرح ان کی باتوں کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے۔

(ہ) اور اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ کوئی بات فی نفسہٖ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، دنیا اس کی طرف اس وقت تک متوجہ نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پیش کرنے والے قول سے زیادہ اپنے عمل کے ذریعہ اس کے حق ہونے کا اعلان نہ کریں اور اس کی تبلیغ و اشاعت ہی کی راہ میں جان و مال کی زبردست قربانیاں پیش نہ کریں، کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی بات کو حق سمجھتے ہوتے ہیں اور اس کی خدمت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں لیکن جب تک وہ دوسروں کو وہ کام کرتے اور اس کے لیے مشقتیں اٹھاتے دیکھ نہیں لیتے اس وقت تک وہ عملاً خاموش بیٹھے رہتے ہیں اس لیے اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ ہندستان کے رہنے والے ان کی باتوں کو کچھ وزن دیں تو انھیں سب سے پہلے اپنی جگہ یہ طے کرنے کی ضرورت ہے کہ جان و مال، وقت اور صلاحیت جس چیز کے بھی وہ مالک ہیں وہ سب حق کے لیے ہے اور ان کی حقیقی سعادت یہی ہے کہ یہ سب چیزیں

حق کے مصرف میں صرف ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ

(التوبہ:۱۱۱)

''اللہ نے مومنین سے ان کی جان و مال کو اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت سے خرید لیا ہے۔''

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ بات غالباً واضح ہوگئی ہوگی کہ ملّت کے حقیقی نصب العین — شہادت حق — کی راہ میں کیا رکاوٹیں درپیش ہیں اور ان رکاوٹوں کے انسداد و تدارک کے لیے کیا تدابیر سود مند ثابت ہوسکتی ہیں۔ ہمارے نزدیک ان تدابیر کو جلد از جلد بروئے کار لانا امت کی بقاو فلاح کے لیے ازبس ضروری ہے۔ اس میں جتنی تاخیر ہوگی اتنا ہی زیادہ امت کو ملی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا بلکہ خطرہ ہے کہ اس کا نقصان خدانخواستہ اس مشکل میں سامنے نہ آئے کہ ہندستان سے مسلمانوں کا وجود بہ حیثیت ملت فنا ہو جائے۔ (لاقدر اللہ)

ان تدابیر کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ دنیا سنن الٰہیہ کے مطابق اسباب وعلل کے تابع ہے۔ ہر اچھی بری تبدیلی کسی نہ کسی سبب کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لیے اگر ہمیں اپنی کسی حالت کو بدلنا مقصود ہے تو اس کے مطابق مناسب جدوجہد اختیار کرنا ناگزیر ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (الرعد:۱۱)

''بے شک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدل لیں۔''

اور اس کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ہماری موجودہ نکبت درحقیقت ہماری غفلتوں اور کوتاہیوں کا ثمرہ اور اللہ کے ناخوشی اور ناراضگی کا نتیجہ ہے، اس لیے جب تک ہم اپنی غفلتیں اور کوتاہیاں دور کر کے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اس وقت تک ہم اپنی موجودہ حالت سے نجات نہیں پاسکتے اور اس کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ ہم دین سے اپنا رشتہ پھر سے استوار کریں اور اس کو قائم و برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لے آئیں کہ یہی دنیا میں ہماری بعثت کا حقیقی مقصود ہے جیسا کہ اس کی تفصیلات پہلے گزر چکی ہیں۔ اور یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ اس کے دین کو اختیار کریں اور اس کو قائم اور غالب کرنے کی کوشش کریں، ان کی وہ

ہر طرح مدد فرماتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ (العنکبوت:۶۹)

''اور جو لوگ ہمارے واسطے محنت کریں گے ہم ان کو اپنی راہیں سمجھا دیں گے اور اللہ نیکی والوں کے ساتھ ہے۔''

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾ (الحج:۴۰)

''اور اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کریں گے۔ یقیناً اللہ طاقت والا اور زبردست ہے۔''

اور مذکورہ بالا تدبیریں قیام وغلبۂ دین کی کوششوں ہی کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے اگر ان کو خلوص کے ساتھ بروئے کار لانے کی جدوجہد کی جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اللہ کے وعدوں کے مطابق اس کی رحمتوں، نوازشوں اور غیبی تائیدوں سے محروم رہیں۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾ (النسآء:۸۷)

''اور اللہ سے سچی کس کی بات ہو سکتی ہے۔''

آغاز کار

پچھلی فصل میں ہم نے ان تدبیروں کی نشان دہی کی ہے جن کے اختیار کرنے سے شہادت حق کی راہ کے موانع و مشکلات بآسانی دور کی جاسکتی ہیں، یہ نصب العین کی بحث کی آخری فصل تھی، لیکن یہاں پہنچ کر یہ سوال خود بہ خود ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ تدابیر عملاً بروئے کار کس طرح لائی جاسکتی ہیں، یہ سوال خاصا اہم ہے اس لیے ضروری ہے کہ آخر میں ہم اختصار کے ساتھ اس سوال سے بھی کچھ بحث کریں، اس کے بغیر شاید ہماری بحث تشنۂ تکمیل رہ جائے گی۔

یہ ظاہر بات ہے کہ اس غرض کے لیے سب سے بڑی اور مقدم ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک ایسا اجتماعی ادارہ ہونا چاہیے جو مسلمانوں کی تمام ملی ضروریات کا کفیل ہو اور اس کے ہاتھوں یہ تدابیر عمل میں لائی جائیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ بدقسمتی سے اس وقت ان کا شیرازہ ملی بالکل منتشر ہے اور ان میں کوئی ایسا اجتماعی ادارہ موجود نہیں ہے جو ان کے معاملات کی دیکھ بھال کر سکے اور ان کو ٹھیک طور سے حل کرے، اس کا نتیجہ جہاں یہ ہے کہ وہ اکثر تدابیر جو مسلمانوں کے تحفظ و بقا اور ارتقاء کے لیے ضروری ہیں اور جو بہ ہر حال اپنی تکمیل کے لیے کسی مضبوط اجتماعی ادارے اور اجتماعی وسائل و ذرائع کی محتاج ہیں، پوری نہیں ہو پا رہی ہیں، وہیں اس کا ایک افسوس ناک نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہو رہا ہے کہ اجتماعیت کے فقدان کی وجہ سے ان کا رہا سہا ملّی شیرازہ بھی روز بہ روز تیزی کے ساتھ اور زیادہ منتشر اور ابتر ہوتا جا رہا ہے۔ کچھ مسلمان موجودہ حالات سے بددل و پریشان ہو کر مایوسی اور بے عملی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں، اور بہت سے کسی مرکز سے وابستہ نہ رہنے کی وجہ سے ایسی غیر دینی تحریکات کا شکار ہو رہے ہیں جو اپنے زہریلے

اثرات سے ان کے سارے دینی وملّی احساسات کو فنا کے گھاٹ اتار دینے والی ہیں۔ ابھی ابھی آپ کی نگاہوں کے سامنے سے الیکشن کا ہنگامہ گزرا ہے اس موقع پر ہندستان کی ہر چھوٹی بڑی قوم نے کسی نہ کسی درجے میں اپنی اجتماعیت کا مظاہرہ کیا ہے، ایک طرف انھوں نے اپنی ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے کی فکر کی ہے جو ہندستانی باشندے ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں تو دوسری طرف انھوں نے اپنے قومی مفادات سے بھی ایک لمحہ کے لیے صرف نظر نہیں کیا ہے بلکہ بعض گروہ اور بعض قومیں تو ایسی بھی ہیں کہ انھوں نے اپنے قومی مفاد کو ہر مفاد پر ترجیح دی ہے لیکن اس کے برعکس اس الیکشن میں مسلمانوں کا حال یہ رہا ہے کہ یہ فکر تو دور کی بات ہے کہ اس موقع پر وہ بھی دوسروں کی طرح اپنے ان اصولوں کے عملی مظاہرہ کی کچھ فکر کرتے جن کو وہ اپنے عقیدہ کے مطابق دنیا کے سب سے بہتر اصول قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس گری ہوئی حیثیت کے تقاضوں کو بھی ٹھیک طور سے ملحوظ نہیں رکھا ہے جس میں وہ اپنے اصل مقام سے گر کر جا پہنچے ہیں یعنی ایک قوم کے قوی دنیاوی مفادات کو پورے الیکشن کے دوران میں اسلام یا مسلمانوں کا کہیں نام بھی نہیں آنے پایا، اس پوری مدت میں ایسا محسوس ہوتا رہا کہ ہندستان میں جیسے مسلم نامی کوئی قوم موجود ہی نہیں ہے یا ہے تو اس نے آئندہ کے لیے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت کو ہر معنی میں یہاں کی عمومی قومیت میں ضم کر کے بالکلیہ ختم کر دیں گے۔ انھوں نے الیکشن میں حصہ لیا تو اس طور سے کہ ان کے سامنے کوئی متحدہ قومی مقصد نہیں تھا، ان کے مختلف گروہ مختلف پارٹیوں کے خیمہ بردار بن گئے اور نتیجتاً خود آپس میں بھی کش مکش کرتے رہے جس نے باقی ماندہ شیرازہ ملّی کے ساتھ مسلمانوں کے قومی عزت و وقار کو بھی پامال کر کے رکھ دیا، انتشار کی حد یہ ہے کہ جو لوگ اپنی شخصی عقیدتوں کی بنا پر اب تک سیاسی مسائل میں علماء کے دامن سے بندے ہوئے تھے، صاف محسوس ہو رہا ہے کہ وہ آئندہ اگر ان کے ساتھ کوئی تعلق باقی رکھنا چاہتے ہیں تو وہ بس زیادہ سے زیادہ مذہب کے تنگ دائرہ تک محدود رہے گا اور باقی امور دنیا میں وہ یا تو اپنی راہ خود پیدا کریں گے یا ان امور کے سلسلے میں وہ ان لوگوں پر اعتماد کریں گے جن کو وہ سیاسی طور سے اپنا پیشوا تسلیم کرتے ہیں، غرض اس وقت مسلمانوں میں کوئی ایسا اجتماعی ادارہ موجود نہیں ہے جو مسلمانوں کو کسی ایک نقطہ پر جمع رکھ سکے اور اس کی بنا پر ان کی حیثیت بھیڑوں کے اس گلہ کی

سی ہوگئی ہے جس کا کوئی رکھوالا نہ ہو اور اس لیے وہ خود اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی ہو یا جس کا جس طرف جی چاہتا ہو اُن کو ہانک رہا ہو۔

یہ صورت حال یقیناً تشویش انگیز ہے اور اس کی بنا پر ایک حد تک مذکورہ تدابیر کے بہ روئے کار آنے کے سلسلے میں مشکلات کا احساس بھی ایک بالکل قدرتی بات ہے لیکن اس کے باوجود ہم اس بات کو انتہائی غلط سمجھتے ہیں کہ آئندہ کے بارے میں ہم مایوس ہو جائیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہمارا مایوسانہ طرزِ عمل کن نتائج کا موجب ثابت ہوگا؟ کیا اس سے وہ خطرات رفع ہو جائیں گے جو مسلمان اپنے دین و دنیا کے سلسلے میں اس وقت محسوس کر رہے ہیں یا وہ اور زیادہ شدید ہو جائیں گے؟ اگر یہ یقینی بات ہے کہ یہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی صورت میں وہ زیادہ شدید ہو جائیں گے تو طبعاً اس کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ ان کو دور کرنے کے لیے جو کچھ بھی آپ سے بن پڑ سکے اس سے دریغ نہ کریں، ہاں اگر خدانہ خواستہ کسی نے یہی طے کر لیا ہے کہ آئندہ اس کو اسلام یا مسلمانوں سے اپنا کوئی رشتہ برقرار رکھنا نہیں ہے اور اس لیے اس کو ان کے بقا و تحفظ کے لیے بھی کچھ کرنا نہیں ہے تو بات دوسری ہے، مایوسی بہ جائے خود کفر ہے لیکن وہ مایوسی جس کا انجام اس شکل میں نمودار ہو سکتا ہو کہ آئندہ اسلام کی راہیں خدانہ خواستہ بند ہو جائیں اور مسلمانوں کا مسلمان باقی رہنا اور زیادہ دشوار ہو جائے، وہ مایوسی کفر ہونے میں معمولی کفر سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

پھر یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آیا فی الواقع اس قسم کی مایوسی کے لیے کوئی وجہ جواز بھی موجود ہے۔ یہ بات بلا شبہ اچھی تھی کہ مسلمانوں کا کوئی اجتماعی ادارہ پہلے سے موجود ہوتا جو مذکورہ بالا تدابیر کو بہ روئے کار لاتا لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے تو صرف مایوسی ہی وہ واحد طریقہ کار نہیں ہے جو اس طرح کے مواقع پر زندہ قومیں اختیار کرتی ہیں دنیا کی کون سی حالت ایسی ہے جو عزم و تدبر کے ذریعہ بدلی نہیں جا سکتی اور وہ کون سی چیز ہے جس کو اس کے صحیح اسباب و وسائل کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ حاصل نہ ہو سکے، اجتماعیت بھی تو کوئی از خود قائم ہو جانے والی چیز نہیں ہے، یہ افراد کی کوششوں سے ہی وجود میں آتی ہے، خود ہم اپنی جس اجتماعیت کے زوال پذیر ہونے کے شکوہ سنج ہیں، وہ ایسا نہیں ہے کہ شروع ہی سے موجود رہی ہو

وہ بھی ایک شہرہ آفاق انتشار ہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور پچھلے ادوار میں وہ متعدد بار انتشار سے دوچار ہو ہو کر بار بار سنبھلتی اور قائم ہوتی رہی ہے۔ پھر ہم کیوں اس سے مایوس ہو جائیں کہ اگر اس کو قائم کرنے کا ہم میں مضبوط عزم پیدا ہو جائے اور ہم اس کے لیے مناسب تدابیر اختیار کریں تو ایک بار پھر ہم اسے قائم کرنے میں کام یاب نہیں ہو سکیں گے؟ دنیا کی دوسری قومیں جن کے اندر اجتماعیت موجود ہے، جب وہ نسل و نسب اور وطن کی بنیاد پر اجتماعیت کی عمارت کھڑی کر سکتی ہیں دراں حالے کہ ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ حقیقی معنوں میں متحد کر سکے یا ان کے دلوں سے باہمی اختلاف و شقاق کے وہ جراثیم نکال سکے جن کی بنا پر وہ قلوبھم شتی کے مصداق ہیں، تو یہ کیوں ناممکن فرض کر لیا جائے کہ مسلمان اسلام کی بنیاد پر کوئی اجتماعیت قائم کرنے سے قاصر رہ سکتے ہیں دراں حالے کہ اسلام اپنے احکام و تعلیمات کی رو سے ایک اجتماعی دین ہے اور اس کا محض نام لینے سے ہی اجتماعیت کے بہت سے اوصاف از خود پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ بڑی ناانصافی ہوگی کہ ہم اس وقت بھی مسلمانوں کو اجتماعیت کے احساس یا اجتماعی اوصاف سے بالکلیہ عاری فرض کر لیں، ان میں اب بھی ایک معتد بہ حد تک یہ موجود ہیں اور جن اوصاف سے وہ محروم ہو گئے ہیں ان کے حساس لوگوں کو ان کے ضیاع و فقدان کا شدت کے ساتھ احساس ہو رہا ہے اور وہ ان کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے بے چین و مضطرب ہیں۔ یہ باتیں یقیناً مستقبل کے لیے ایک فال نیک سمجھی جا سکتی ہیں، اسی طرح یہ فرض لینا بھی صحیح نہیں ہے کہ موانع و مشکلات کے ازالہ کی جن تدابیر کا اوپر ذکر ہوا ہے ان پر یا ان سے ملتی جلتی تدبیروں پر سرے سے کوئی عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے، ان میں سے بہت سی باتیں ایسی ہیں جو کسی نہ کسی درجے میں اب بھی بہت سے مسلمانوں کے پیش نظر ہیں اور ان کے سلسلے میں خاص کام ہو رہا ہے یہ اور بات ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ان کا بہت کچھ حصہ کسی مقصد کے تحت نہیں ہے لیکن اگر کوشش کی جائے تو ان خالی ڈھانچوں میں بھی مقصد کی روح پیدا کی جا سکتی ہے، احساس و شعور پیدا ہو جانے کے بعد یہ کام زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔

بہ ہر حال مسلمانوں کے موجودہ انتشار سے بددل ہونا کسی طرح صحیح نہیں ہے، اگر کوشش کی جائے تو یہ انتشار جلد رفع ہو سکتا ہے اور ان میں مضبوط اجتماعیت پھر سے قائم ہو سکتی

ہے۔ اوپر جن تدابیر کی نشان دہی کی گئی ہے وہ بہ جائے خود اجتماعیت کی تعمیر کے لیے بنیاد کا کام کرسکتی ہیں اور ان میں کوئی تدبیر بھی ایسی نہیں ہے جس کا کچھ نہ کچھ حصہ انفرادی طور پر بھی اختیار نہ کیا جاسکتا ہو، اس لیے اگر مسلمان اپنی انفرادی حیثیتوں میں بھی کچھ کرنے کے لیے آمادہ ہوجائیں تو ایک طرف اجتماعیت کی راہ بھی ہم وار ہوتی رہی اور دوسری طرف حصول مقصد تک ان مفاسد و نقصانات کا بھی کسی نہ کسی درجے میں تدارک ہوتا رہے گا جو اجتماعیت کے فقدان کی وجہ سے اس وقت پیش آرہے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ جو لوگ ان باتوں کا احساس رکھتے ہیں وہ اجتماعیت کی عدم موجودگی میں خود اپنے کو اپنی جگہ پر ایک پورا اجتماعی ادارہ تصور کریں اور اجتماعی ادارہ کو جو کام انجام دینے ہیں ان کا اپنی ممکن حد تک اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے کو ذمہ دار سمجھیں۔ اس سے ان کی بہت کچھ بگڑی ہوئی حالت سنبھل سکتی ہے۔

اس کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے جتنے چھوٹے بڑے اجتماعی ادارے اس وقت عملاً موجود ہیں، ہوسکے تو وہ سب یا ان میں سے جتنے بھی تیار ہوسکیں، ایک واحد جماعت کی شکل میں تبدیل ہوجائیں اور پھر وہ سب مل کر ملّت کی ضرورتوں کا بندوبست کریں۔ اگر ایسا ہوجائے تو سمجھنا چاہیے کہ ملّت کی اہم ضرورت رفع ہوگئی، لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو بہ درجہ دوم یہ کوشش ہونی چاہیے کہ یہ جماعتیں اپنا وجود الگ الگ برقرار رکھتے ہوئے اور اپنے الگ الگ مقاصد کے لیے کام کرتے ہوئے بھی، مشترک امور و مقاصد میں حتیٰ الوسع اشتراک و تعاون کریں اور اگر یہ بھی دشوار ہو تو بدرجہ آخر یہ کہ وہ مشترک امور و مقاصد کے سلسلے میں تقسیم کار کے اصول پر عمل پیرا ہوں، یعنی ہر جماعت طے شدہ قرارداد کے مطابق اپنی قوت و صلاحیت کے مطابق ملّت کی چھوٹی بڑی مختلف ضروریات میں سے کچھ کو اپنے لیے خاص کرلے اور پوری یک سوئی اور توجہ کے ساتھ اس کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔

یہ تین صورتیں یکے بعد دیگرے پیش نظر مقصد کے لیے درجہ بہ درجہ مفید ہوسکتی ہیں۔ جہاں تک پہلی قسم کا تعلق ہے ظاہر ہے وہ مقصد و طریق کار میں پورے اتفاق کے بعد ہی ممکن ہے۔ رہی دوسری صورت تو اگرچہ اس میں مقصد و طریق کار دونوں کا اتفاق ضروری نہیں ہے لیکن اگر کوئی خواہ مخواہ نمائشی اشتراک و تعاون پیدا کرنا مقصود نہیں ہے تو اس صورت میں بھی اس بات کا

لحاظ ناگزیر ہے کہ کم از کم نظری حد تک مقصد کے بارے میں کسی نہ کسی درجے میں اتفاق پایا جاتا ہو اور خلاف مقصد باتوں سے بچنے کا اہتمام بھی موجود ہو۔

رہی تیسری یعنی تقسیم کار کی صورت تو حقیقی تقسیم کار درحقیقت یہ ہے کہ تمام جماعتیں ایک متفقہ قرارداد کے مطابق ملت کے مختلف کاموں کو اپنے اپنے طور پر اس طرح انجام دیتیں کہ وہ سب کام مل کر ایک ہی کام سمجھے جا سکتے، لیکن ظاہر ہے ایسا اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب وہ ایک مقصد پر متفق ہوں اور چوں کہ یہ سر دست بہ ظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے اس لیے تقسیم کار کی نہایت ادنیٰ شکل جو بہ حالات ظاہر ممکن بھی نظر آتی ہے یہی ہوسکتی ہے کہ مختلف جماعتوں کے سربراہ کار کہیں اکٹھے ہوں اور باہمی قرارداد کے ذریعہ ہر جماعت ملت کی مسلمہ ضروریات میں سے کچھ ضرورتوں کو اپنی اپنی صلاحیت اور قوت کے مطابق خاص کرلے اور اپنے اپنے دائروں کے اندر ان کو یکسوئی اور توجہ کے ساتھ انجام دے، اس میں نہ اصول و مقاصد کے اتحاد کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ طریق کار کے اتحاد کا۔ اس کے لیے نہایت معمولی ذکر جماعتوں کے ذمہ دار حضرات بہ ہر صورت اس درجہ کے اجتماعیت کے احساس سے عاری نہیں ہوں گے لیکن اگر خدانہ خواستہ ہمارا یہ حسن ظن بھی غلط ہو تب تو بہتر یہ ہے کہ سر دست جماعتوں کے اشتراک و تعاون کا نام ہی نہ لیا جائے اور جو کچھ کرنا ہے افراد اور جماعتیں اپنی اپنی انفرادی حیثیتوں میں انجام دیں۔

ہر چند مذکورۂ بالا تقسیم کار، کچھ زیادہ کارآمد چیز نہیں ہے کیوں کہ اس سے وہ اجتماعی تنظیم قابل لحاظ شکل میں وجود میں نہیں آسکتی جس کی ضرورت کا ہم نے اظہار کیا ہے لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور پہنچ سکتا ہے کہ

(الف) ممکن ہے اس سے باہمی کش مکش و تزاحم کا خاتمہ ہوسکے اور مزید برآں ان میں حسن تفاہم پیدا ہوسکے۔

(ب) ملّت کی کچھ ضرورتیں جو اس وقت سرے سے نظر انداز ہو رہی ہیں، ان کی طرف توجہ کی جاسکے۔

(ج) اس بات کا کوئی انتظام ہوسکے کہ ہر جماعت کی قوت و صلاحیت کے صحیح مصرف متعین ہوجائیں اور ان کا بے جا اور بے محل مصرف بند ہوجائے۔ اور یہ فوائد بھی بہ حالات

موجودہ بس غنیمت سمجھے جاسکتے ہیں۔(۱)

(۱) کچھ دنوں پہلے تک جمعیۃ العلماء کے بزرگوں کا خیال یہ تھا کہ تقسیم کار قریب قریب اس کے حقیقی معنوں میں اس وقت تک عملاً موجود ہے۔ چناں چہ کسی صاحب نے الجمعیۃ سے استفسار کیا تھا کہ "جمعیۃ علماء اور اسلامی پارٹی میں کیا فرق ہے کیوں کہ دونوں اسلام کے محافظ بننے کا دعویٰ کرتی ہیں۔"

اس کا الجمعیۃ نے حسب ذیل جواب دیا تھا۔

"جہاں تک اسلام کی خدمت کا تعلق ہے دونوں جماعتوں کی کوششیں قابل تحسین ہیں، فرق صرف تقسیم عمل اور طریق کار کا ہے، جمعیۃ علماء فی الحال اس کوشش میں ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کا وجود باقی رہے اور اسلامی نصاب اور مدارس کا انتظام ان کے تحفظ کا ذریعہ بنے، اسلامی پارٹی اپنے طریقہ پر مسلمانوں میں اسلامی فکر اور اسلامی ذہن پیدا کرنا چاہتی ہے لہٰذا دونوں جماعتوں میں کوئی تصادم نہیں۔ انسانی معاشرہ کو قائم رکھنے کے لیے جس طرح کوئی وکالت کرتا ہے اور کوئی انجینئر بنتا ہے، کوئی تجارت کو فروغ دیتا ہے، کوئی صنعت وحرفت کو ترقی دیتا ہے اور کوئی کلرک بن کر دفتری کام سنبھالتا ہے اسی طرح مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء کے لیے تقسیم کار کے اصول پر مختلف کام انجام دیتی ہیں۔" (الجمعیۃ ۱۹ر فروری ۱۹۵۱ء)

اور مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء نے ایک مراسلہ کے جواب میں جس میں یہ تمنا ظاہر کی گئی تھی کہ کاش مسلمانوں کی تین بڑی جماعتیں: جمعیۃ العلماء، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی، ایک ہوسکتیں ـــــ یہ خیال ظاہر فرمایا تھا:

"ایک ملّت کی تمام ضروریات کو ایک جماعت انجام نہیں دے سکتی بالخصوص ایسی صورت میں کہ سیاسی قوت و اقتدار سے ہر ایک کا دامن خالی ہو، ایسی صورت میں زعماء ملّت کا یہ فرض ہے کہ ملّت کی تمام ضرورتوں کا تجزیہ اور تشخیص کر کے الگ الگ جماعتوں کو جدا جدا فرائض تقسیم کردیں، بے شک یہ درست ہے کہ زعماء ملّت کی کسی کانفرنس نے کسی باضابطہ اجلاس میں غور وخوض اور بحث ومباحثہ کے بعد اس فرض کو انجام نہیں دیا لیکن اگر ملّت کے افراد نے اپنے اپنے طور پر ضرورتوں کا احساس کر کے اپنے اپنے رجحان کے مناسب اپنے ذمہ پر فرائض کے لیے اور سرگرمی سے کام شروع کردیا تب بھی جو مقصد تھا وہ حاصل ہوگیا...آج ایک سمجھ دار انسان ان جماعتوں کے مختلف مسلکوں کو اسی صورت پر محمول کرے گا۔" (۱۰ر مئی ۱۹۵۰ء)

لیکن ہمارا خیال اس کے برعکس ہمیشہ سے یہ ہے کہ تقسیم کار کسی معمولی درجے میں بھی موجود نہیں ہے اور اس کو موجود فرض کرلینا سوائے خوش گمانی کے اور کچھ نہیں ہے، چناں چہ جب صاحبِ مراسلہ نے مولانا کے اس تبصرہ پر ہمیں اظہار خیال کی دعوت دی تھی تو ہم نے صفائی کے ساتھ اپنا یہ خیال ظاہر کردیا تھا کہ

باقی اگلے صفحہ پر

جماعت اسلامی اور اس کا موقف

یہاں موقع نہیں ہے کہ ہم تفصیل کے ساتھ یہ وضاحت کریں کہ پچھلے صفحات میں جن ملّی ضروریات اور ان کی تکمیل کی جن تدابیر کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے سلسلے میں جماعت اسلامی کیا کچھ کر رہی ہے، لیکن یہاں یہ اظہار کر دینا ضروری ہے کہ جماعت اسلامی کے قیام و تاسیس کی اصل غرض، شہادت حق اور اقامت دین ہی ہے اس لیے وہ تمام کام جو اس مقصد کے لیے مفید و

بقیہ گزشتہ صفحے کا

''ہر چند اس وقت ان جماعتوں کے کارکنوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ کچھ بدلا ہوا ہے اور کہیں کہیں ان میں باہم خیر سگالی کے جذبات بھی پائے جاتے ہیں لیکن یہ کوئی قابل اعتماد چیز نہیں ہے کیوں کہ یہ یا تو موجودہ حالات کے دباؤ کا نتیجہ ہے یا کارکنوں کے اپنے اپنے ذاتی اخلاق وخصوصیات کا۔ ورنہ ان میں واقعی اختلافات موجود ہیں اور تقسیم کار کا تو سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔''

اور اس کی توجیہہ میں ہم نے ان جماعتوں کے بعض اصولی اور بنیادی اختلافات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

''یہ صحیح ہے کہ ان جماعتوں میں سے ہر جماعت کی اپنی اپنی نوعیت کی مخصوص سرگرمیاں ہیں جن کی وجہ سے ان کا اپنا اپنا دائرۂ عمل اور نوعیت کار بھی ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز ہو گئے ہیں لیکن صرف اتنی ہی بات سے تقسیم کار کی موجودگی پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، تقسیم کار کے کم سے کم جو معنی ہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہر جماعت اپنے کام کے لیے ایک خاص دائرہ مخصوص کرے اور اس سے آگے قدم نہ بڑھائے اور دوسرے دائروں میں جو دوسری جماعتیں کام کر رہی ہیں ان کو وہ کم از کم غلط نہ سمجھے اور نہ ان کی مخالفت کرے لیکن کیا واقعی عملاً یہ دونوں باتیں موجود ہیں، ہمارے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے، دوسری جماعتوں کا جو طرز عمل جماعتِ اسلامی کے سلسلے میں ہے میں اسے اس موقع پر معرض بحث میں نہیں لانا چاہتا، البتہ جماعت اسلامی کے سلسلے میں صفائی کے ساتھ یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہم اس وقت تک اس معنی میں تقسیم کار کے عامل نہیں ہیں اور نہ اس وقت تک ہو سکتے ہیں جب تک کہ دوسری جماعتیں اپنا مقصد متعین نہ کریں اور اپنے لیے کوئی خاص دائرۂ عمل مخصوص کر کے اپنی سرگرمیاں اسی دائرہ کے اندر محدود نہ کرلیں اور جماعت اسلامی کا جو بنیادی مقصد ہے اس کو صحیح سمجھتے ہوئے اسے اپنے دائرہ عمل میں بغیر کسی مزاحمت کے کام کرنے کے لیے آزاد نہ چھوڑ دیں۔''

اور اس تحریر کے بعد اس وقت تک جو حالات رونما ہوئے ہیں ان سے ہمارے مذکورہ بالا خیالات کی مزید تائید ہوتی ہے۔ جماعت اسلامی کے سلسلے میں جمعیۃ العلماء کے اکابر کا اب (مذکورہ بالا تحریروں کے شائع ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد) جو طرز عمل ہے اس سے ناظرین ناواقف نہیں ہوں گے۔

ضروری ہو سکتے ہیں وہ پوری اہمیت و شدت کے ساتھ اس کے سامنے ہیں اور ان کو بروئے کار لانے کے لیے وہ اپنے امکان بھر کوشاں ہے، لیکن ظاہر ہے یہ کام بہت وسیع ہیں اور اس کے مقابلے میں جماعت کے موجودہ وسائل و ذرائع بہت محدود ہیں، اس لیے عملاً ان کا نہایت حقیر حصہ ہی تکمیل پذیر ہو رہا ہے، اس لیے ہماری خواہش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان ضروریات و تدابیر کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر کام کریں، البتہ اگر ان باتوں سے اختلاف نہیں ہے تو انھیں اپنے طور سے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی ضرور فکر کرنی چاہیے، جملہ ضروریات میں جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے، مقدم ضرورت اجتماعیت کی ہے اس لیے اس کو خاص طور سے اپنے پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس اجتماعیت کی ضرورت کے احساس کے تحت ہی ہم نے اقامت دین اور شہادت حق کے لیے ایک جماعت کا قیام ضروری سمجھا ہے اور ہمارا خیال یہ ہے کہ جو لوگ اس سلسلے میں کچھ کرنے پر آمادہ ہوں گے وہ خود بھی اس ضرورت کا احساس کیے بغیر نہیں رہ سکتے اس لیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں، اگر انھیں ہم پر اور ہمارے طریقۂ کار پر اعتماد ہے تو دین کے اس کام میں ہمارا ساتھ دیں ہم اس کا خیر مقدم کریں گے ورنہ وہ اپنے طور سے مجتمع ہو کر اس کام کو انجام دینے کی کوشش کریں۔ اگر اس طرح کی کئی ایک جماعتیں بھی وجود میں آ گئیں تو ہمیں اس پر کوئی ملال نہیں بلکہ خوشی ہوگی کہ ہم جس راستہ پر چل رہے ہیں اس پر چلنے والے اور قافلے بھی ہمارے ساتھ ہیں، کیا عجب منزل و راہ کا اتفاق ان سب کو کبھی یک جا بھی کر دے اور اگر جماعت اسلامی کو یہ محسوس ہوا کہ ان قافلوں میں کوئی ایسا قافلہ ہے جو اس سفر میں ہمارا پیش رو بن سکتا ہے تو ہمیں اس کے پیچھے چلنے میں بھی کوئی عار نہیں ہوگا۔

ہم اپنے اس مقصد کے لیے ملک کی موجودہ مسلم جماعتوں کے ساتھ بھی پورا پورا اشتراک و تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں بہ شرطے کہ یہ جماعتیں اس بات پر آمادہ ہوں کہ ان کے فکر و عمل کی بنیاد خالص اسلام پر قائم ہو اور ہم آج سے بہت پہلے اس کی پیش کش کر چکے ہیں، مارچ ۱۹۵۰ء میں ظہیر الحسن صاحب لاری کی زیر صدارت یو۔ پی کے مسلم لیڈروں کا جو اجتماع لکھنؤ میں ہوا تھا، اس میں ایک قرارداد کے ذریعہ مسلم جماعتوں کو جن میں خصوصیت کے ساتھ جماعت اسلامی کا بھی نام لیا گیا تھا، یہ دعوت دی گئی تھی کہ وہ سب مل کر ایک واحد جماعت کی شکل

میں تبدیل ہو جائیں تاکہ جملہ مسلمان متفقہ طور سے اس میں شریک ہو کر مسلم قوم کی بہتری کے لیے مؤثر طور سے کام کر سکیں۔ اس دعوت کے جواب میں اسی زمانہ میں ہم نے اخبارات کے ذریعہ اعلان کر دیا تھا کہ:

> ''ہم ایک اصولی اور بین الانسانی جماعت ہوتے ہوئے بھی اپنے کو مسلمانوں کے مخصوص مسائل سے علیحدہ نہیں رکھ سکتے کیوں کہ اس ملک میں مسلمان ہی وہ گروہ ہیں جو ان اصولوں کا مدعی ہے اور ان سے کسی نہ کسی حد تک بہ ہر حال وابستہ ہے اس لیے اس وقت خصوصیت کے ساتھ جو مسائل مسلمانوں کے ضمن میں پیش آرہے ہیں ہم ان کو حل کرنے کے لیے دوسری مسلم جماعتوں کے ساتھ مل کر غور کرنے کے لیے تیار ہیں بہ شرطے کہ اسلام کا جو بنیادی نقطۂ نظر ہے وہ اس غور و فکر کی بنیاد قرار دیا جائے۔''
>
> (الانصاف ۵/اپریل ۱۹۵۰ء)

ہماری یہ پیش کش اب بھی قائم ہے۔ اور میں یہاں یہ اظہار بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم نے صرف یہ پیش کش کر دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ بعض اہم ملی ضروریات مثلاً مسئلہ تعلیم کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے، ہم نے خود اشتراک و تعاون کو عملی شکل دینے کے لیے پیش قدمی بھی کی تھی لیکن افسوس ہے کہ حالات کی ناسازگاری کی بنا پر اس وقت اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا۔ اس کی پوری تفصیل جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ منعقدہ جنوری ۱۹۵۱ء کی روداد میں دیکھی جاسکتی ہے اور ہم آئندہ بھی اس طرح کا اقدام کرنے کے لیے تیار ہیں بہ شرطے کہ اس کے لیے حالات سازگار نظر آئیں۔ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعہ اس قسم کے معاملات میں اشتراک و تعاون کا دروازہ آئندہ کے لیے کھلا رکھا ہے، اس کی تفصیل بھی مذکورہ روداد میں دیکھی جاسکتی ہے، رہا تقسیم کار کا معاملہ تو اس کی جو تشریح ہم اوپر درج کر چکے ہیں اس کے مطابق ہم اس کے لیے ہر آن تیار ہیں، ہماری غرض اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ بہ حیثیت مسلمان اقامت دین کی جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں، اپنے کو عنداللہ جواب دہ سمجھتے ہوئے ہم ان سے ہر ممکن طور سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں، ہم اس سلسلے میں ہر مسلمان کو ان کی ذمہ داریاں بھی یاد دلانا چاہتے ہیں اور کم از کم اس بات کے متوقع ہیں کہ وہ

ہمارے لیے توفیق خیر کی دعا کرتا رہے۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَیْهِ اُنِیْبُ ﴿۸۸﴾